تحریکِ پاکستان

اور اس کا پس منظر

3800

3800

نیو بُک پیلس، چوک اُردو بازار لاہور

Marfat.com

Marfat.com

3880

تحریک پاکستان

اور

اس کا پس منظر

○

سیّد اصغر علی شاہ جعفری

ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی

جاوید اقبال

ناشر

نیو بُک پیلس ○ چوک اُردو بازار ○ لاہور

Marfat.com

(جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ)

3802

87047

69597

نام کتاب ـــــــــ تحریک پاکستان اور اس کا پس منظر
مطبع ـــــــــ ندیم یونس پرنٹرز، لاہور
ناشر ـــــــــ نیو بک پیلس، لاہور
قیمت ـــــــــ =/۳۶ روپے
کتابت ـــــــــ محمد اسلم، کیلیانوالہ شریف

Marfat.com

3800

انتساب

قبلہ محترمہ والدہ ماجدہ کے نام

جن کی دعاؤں کی بدولت میں ہر

بلا سے محفوظ ہوں،

اصغر علی شاہ

ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

تشکیل پاکستان کی منزل تک پہنچنے کے لئے رہروان جادہ کو جن کٹھن حالات سنگلاخ زمینوں، نشیب و فراز اور ناسازگار ہواؤں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ لگانے کے لئے کسی مفروضے کا سہارا نہیں لینا پڑتا کیونکہ ابھی تک مجاہدین آزادی کی وہ نسل زندہ وسلامت ہے جس کے افراد اس کاروان میں شامل تھے جو قائد اعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں حصول مقصد کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

تشکیل پاکستان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ انگریز کی مکاری اور ہندو کی ہٹ دھرمی تھی۔ انگریز اوّل تو اس برصغیر کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتا تھا اور جب حالات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس ملک سے نکل ہی جائے تو اس کے دماغ میں سب سے زیادہ انتقامی جذبہ مسلمان کے خلاف ابھرا، کیونکہ وہ خود غیر مسلم تھا اور فطری طور پر اس کی ہمدردیاں غیر مسلم کے ساتھ وابستہ تھیں اسی جذبہ کے تحت وہ ہندو نواز رہا۔ ان لوگوں نے لاکھ جتن کئے۔ متعدد رکاوٹیں ڈالیں لیکن پاکستان نے بننا تھا وہ بن کر رہا۔

ہندو نے بارہا انگریز کو باور کرانے کی کوشش کی کہ پورے ہندوستان میں ایک ہی سیاسی جماعت "کانگرس" ہے جو پورے ملک کی آبادی کی نمائندہ جماعت ہے لیکن قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے علامہ اقبالؒ کے اس نظریے کو عملی جامہ پہنا دیا کہ ہندوستان میں مسلمان ایک علیحدہ منفرد قوم ہے جس کی سیاسی جماعت مسلم لیگ ہے —— اور مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی فعال جماعت ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں جن حضرات نے میری مدد فرمائی مجھے ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے۔ ان میں سے کچھ حضرات نے ذاتی تجربوں، علمی خزانوں اور مفید کتب کی فراہمی سے میری بصیرت کو روشن فرمایا۔ ان میں جناب والد محترم، سید میر فاضل شاہ صاحب، جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب جناب مخدوم غلام جیلانی صاحب، جناب علامہ اقبال احمد فاروقی۔ جناب بشیر احمد صاحب ناظم، جناب شیخ محمد حنیف صاحب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

اس کتاب میں صرف ان حالات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو تشکیل پاکستان کا موجب بنے واثق امید ہے کہ یہ کتاب ایم۔ اے سیاسیات کے طلباء کے لئے بالخصوص اور دیگر علم دوست

Marfat.com

حضرات کے لئے بالعموم دلچسپ اور سودمند ثابت ہوگی، انشاء اللہ

خیراندیش

اصغر علی شاہ جعفری

ایم، اے، ایل، ایل، بی

ایم اے اسلامیات کے ریگولر طلبا کی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے ابواب کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور اب یہ کتاب ہر لحاظ سے ریگولر اور پرائیویٹ طلبہ کے سلیبس کے عین مطابق ہے لہذا امید ہے کہ اس علمی اضافے سے یقیناً عام قاری اور طلبہ سیاسیات و تاریخ کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ ہم نے اس کتاب کی تیاری میں طلبہ کی بہتری کو ہر قدم پر مدنظر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود اگر کوئی قاری یا طالب علم اس میں کمی محسوس کرے تو برائے کرم پبلشر صاحب کے ذریعے اپنی قیمتی تجاویز سے آگاہ کرے۔

خیراندیش

جاوید اقبال

۳۵ نسبت روڈ لاہور

یکم اپریل ۱۹۸۳ء

Marfat.com

فہرست مضامین

برصغیر میں مسلم قومیت کا اجراء	۹
دو قومی نظریہ اور سرسید احمد خان	۲۱
دو قومی نظریہ اور اقبال و قائداعظمؒ	۲۳
ہندوؤں کی مذہبی اور سیاسی تحریکیں	۳۰
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۸۵۸ء	۴۰
انڈین نیشنل کانگرس	۴۹
تحریک علی گڑھ	۵۰
انڈین کونسل ایکٹ	۶۵
تقسیم بنگال	۷۲
شملہ وفد	۷۸
آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام	۸۳
منٹو مارلے اصلاحات ۱۹۰۹ء	۹۰
تنسیخ تقسیم بنگال ۱۹۱۱ء	۹۹
لکھنؤ پیکٹ ۱۹۱۶ء	۱۰۴
رولٹ ایکٹ (۱۹۱۹ء) اور حادثہ جلیانوالہ باغ	۱۱۵
مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ۱۹۱۹ء	۱۱۸
تحریک خلافت	۱۲۸
سائمن کمیشن ۱۹۲۷ء	۱۴۹
نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء	۱۵۸
مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات ۱۹۲۹ء	۱۶۶
اقبال کا خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء	۱۷۰
کمیونل ایوارڈ ۱۹۳۲ء	۱۷۴
پونا پیکٹ ۱۹۳۲ء	۱۷۹
گول میز کانفرنسیں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک	۱۸۳
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء	۱۹۳
کانگرس کی حکومت	۲۰۹
کانگرسی حکومت کے دوران مسلم لیگ کی جدوجہد	۲۱۹
جنگ عظیم دوئم اور ہندوستان کی سیاست	۲۲۶
قرارداد لاہور ۱۹۴۰ء	۲۳۷
سرسٹیفورڈ کرپس مشن	۲۴۶
ہندوستان چھوڑ دو تحریک	۲۵۱
جناح گاندھی بات چیت	۲۵۶
شملہ کانفرنس	۲۶۴
عام انتخابات	۲۷۰
کابینہ مشن ۱۹۴۶ء	۲۷۵
ڈائریکٹ ایکشن اور عبوری حکومت	۲۸۸
ماؤنٹ بیٹن پلان ۱۹۴۷ء	۲۹۸
ہندوستان کی تقسیم کا اعلان (۳ جون ۱۹۴۷ء)	۳۰۵
آزادی ہند کا قانون	۳۰۹
ریڈکلف ایوارڈ	۳۱۰
حصول پاکستان کے بعد ہندو مسلم فسادات	۳۱۹

Marfat.com

پاکستان زندہ باد ۳۱۷

تشکیل پاکستان کے بعد پیدا ہونے والے فوری مسائل ۳۲۰

شخصیّات

اسماء گرامی سیاسی مفکرین	۳۲۵	آغا خان	۳۸۲
سر سید احمد خان	۳۲۷	قائد اعظم بطور قانون ساز سیاستدان اور عوامی رہنما	۳۵۳
سید امیر علی	۳۳۴		
محسن الملک	۳۳۶	ظفر علی خان	۳۷۲
وقار الملک	۳۳۹	تحریک پاکستان اور علماء	۳۸۵
شبلی نعمانی	۳۳۹	مسلم لیگ کے حامی علماء	۳۸۹
محمد علی جوہر	۳۴۴	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۳۹۵
ڈاکٹر محمد اقبال	۳۴۸	انجمن حمایت اسلام	۴۰۳
اے کے فضل الحق	۳۸۲	تحریک پاکستان میں خواتین کا حصہ	۴۰۷

Marfat.com

برصغیر میں مُسلم قومیّت کا اجراء

جنوبی ایشیاء کے برصغیر میں مسلمان قوم کی ابتداء تقریباً اس سال ہو گئی تھی جس سال مکہ میں انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے کوہ صفا پر جاکر اہل مکہ کو خدا کا پیغام سنایا تھا، برصغیر میں ساحل مالابار پر عربوں کی آبادیاں پہلے سے ہی موجود تھیں جب انہیں صفا کے واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے لبیک کہا اور عرب سے آنے والے دوسرے تاجروں سے حالات دریافت کر کے اسلامی اخلاق اور اصلاحی معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ ان لوگوں کی پہلے ہی وہاں پر قدرومنزلت تھی نئی تعلیم اور نئی روشنی نے ان کی عزت کو چار چاند لگا دیئے ان لوگوں کو موپلا یعنی "دولہا بھائی" کا نام دیا گیا ہندوؤں کے معزز گھرانے اپنی لڑکیاں ان سے بیاہ کے فخر محسوس کرتے تھے، یہ لوگ یہاں کے بادشاہوں کو سامری (حضرت موسیٰؑ کی مناسبت سے) کہتے تھے۔ ان میں سے ایک سامری جس کا نام پیرول تھا مسلمانوں سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا اور اس کا اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ بعد میں وہ حج کے لئے جاتے ہوئے مکہ میں انتقال کر گیا جاتے ہوئے وہ اپنے پیچھے ملکی انتظام کے لئے اپنے خاندان میں سے ایک فرد کو مقرر کر گیا تھا جب عبدالرحمٰن واپس نہ آیا تو اس کے بعد یہ روایت بن گئی کہ جو بھی ساحل (مملکت) مالابار کے تخت پر بیٹھتا وہ برسر عام اعلان کرتا کہ جب تک کہ "چچا عبدالرحمٰن مکہ سے حج کر کے واپس آ نہیں جاتا" اس وقت تک وہ تخت پر بیٹھے گا۔ اس طرح وہ حکمران اسلامی طرز اختیار کرتے موپلوں نے اس علاقے میں اپنے اخلاق اور اعتقادات کی بنا پر ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھ دی تھی جو جنوبی ایشیا کی سرزمین پر ایک نیا اور انوکھا معاشرہ تھا اس طرح جنوبی ایشیا میں ساحل مالابار وہ مقام ہے جہاں پہلی مرتبہ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیب نے جنم لیا۔ اور پرورش پائی۔

Marfat.com

ساحل مالابار میں پہنچنے والی تہذیب کا دوسرا دور ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں دیبل کے فتح کرنے سے شروع ہوتا ہے، محمد بن قاسم نے یہاں پر غیر اسلامی باتوں خاص کر ذات پات کے نظام کو ختم کر دیا اور اسلامی اصول نافذ کئے جن میں مساوات اور بھائی چارے کا سبق تھا محمد بن قاسم نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کیا جس کی وجہ سے وہاں کے باشندے جو پہلے ہی ساحل مالابار کی تہذیب سے متاثر تھے اور زیادہ متاثر ہوگئے اور بہت سوں نے اسلام قبول کر لیا۔

محمد بن قاسم کے جانے کے بعد اس علاقے میں کئی صدیوں تک خاموشی طاری رہی اور ساحل مالابار اور محمد بن قاسم کی تعلیمات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تحریک آہستہ آہستہ پروان چڑھتی رہی۔

محمود غزنوی کی آمد: تقریباً تین صدیوں کے بعد جنوبی ایشیا میں ایک دفعہ پھر ہلچل پیدا ہوگئی جب محمود غزنوی نے برصغیر پر حملہ کیا۔ محمود غزنوی نے یہاں پر سترہ حملے کئے اور آخری حملے میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے سومنات کا مندر توڑا محمود غزنوی نے یہاں پر سیاسی حکومت کی داغ بیل نہ ڈالی۔ اور جب جنوبی ایشیا کے شمال مغربی ریاستوں کی طاقت بالکل ختم ہوگئی اور محمود غزنوی کو اس طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا تو پھر اس نے اس کے بعد کبھی بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔

محمود غزنوی کے پے در پے حملوں سے جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی اس تہذیب کو نقصان پہنچا جو سندھ کے ساحل مالابار اور ملتان کے علاقوں میں پرورش پا رہی تھی۔ البتہ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب اس تہذیب کا تعارف برصغیر کے مرکزی حصوں تک ہو گیا گویا کہ اب اس تہذیب میں عربی رنگ کی بجائے ایران خراسان اور ترکستان کے عناصر شامل ہو گئے تھے مگر بنیادی طور پر یہ وہی تہذیب تھی جو جنوبی ایشیا کی تہذیب سے بالکل مختلف تھی۔

دہلی اور تبلیغ اسلام: پوری ایک صدی کے بعد اس تہذیب کا چوتھا دور شروع ہوا یہ دور محمد غوری کا دور تھا۔ محمد غوری نے رائے پتھورا کو شکست دی اور اپنی فوجی فتح کو سیاسی فتح میں تبدیل کرنا چاہا۔ رائے پتھورا کو شکست دینے کے بعد وہ جنوبی ایشیا میں سیاسی خلا پیدا کرنے کی بجائے

Marfat.com

وہاں مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ اعزاز قطب الدین ایبک کو ملا جس نے دہلی (دارالحکومت) میں پہلی مسلمان حکومت کا قیام عمل میں لایا۔ اس کے بعد غوری کے سالاروں کا ایک گروپ جو یہاں مستقل طور پر رہ گیا تھا یکے بعد دیگرے دہلی کا حکمران بنا ایبک التمش، بلبن جو کہ ایک دوسرے کے صلاح کار اور مشیر تھے نے نہ صرف سلطنت دہلی کی بنیاد رکھی بلکہ اس سلطنت کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سرحدوں کو خلیج بنگال تک پھیلا دیا۔ اسکے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کی تہذیبی اور تمدنی برتری کا لوہا جنوبی ایشیا کے طول وعرض میں منوایا۔ ان کے دور میں یہ علاقہ خوشحالی کی طرف چل پڑا جو اسے اشوک کے بعد کبھی میسر نہیں آئی تھی۔ اسی دور میں مغربی ایشیا میں ایک فوجی طوفان برپا ہوا شمالی علاقوں سے تاتاریوں نے انسانیت کا قتل عام شروع کر دیا تھا اس طرح ہر طرف افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا۔

مغربی ایشیا کے لوگوں کے لئے دہلی کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہ رہی اور یہ لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں یہاں پہنچنا شروع ہو گئے ان مہاجرین میں تاجر بھی تھے شاعر بھی فلسفی بھی اعلیٰ منتظم بھی اور عالم بھی شامل تھے۔ مہاجرین کے اس سلسلے میں وہ لوگ بھی جنوبی ایشیا پہنچے جو اسلام کے علمبردار تھے جو مسلمانوں کے معاشرے میں دینی خصوصیات پیدا کرنی چاہتے تھے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں موجود تھیں، یہ صوفیائے کرام تھے، قطب الدین ایبک کے دور میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت نظام الدین اولیاؒ۔ حضرت بو علی قلندرؒ۔ حضرت شہباز قلندرؒ اس طرح سینکڑوں صوفیاء ان کے مرید اور انکے ساتھی جنوبی ایشیا کے برصغیر کے کونے کونے میں پھیل گئے اس طرح تصوف کے چاروں سلسلوں کے لوگ یہاں آئے ان میں قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ تو تصوف کے وہ طریق تھے جن کا مقصد انسان میں انسانیت کو ابھارنا تھا۔ اور ان کی اس کوشش میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر تھے۔ مذہب کی تبدیلی ان کی منزل نہ تھی بلکہ ان کے تعلقات ہندوؤں سے بھی ویسے ہی تھے جیسے مسلمانوں سے تھے۔

تصوف کے ان تینوں سلسلوں کے علاوہ ایک چوتھا سلسلہ سہروردیہ تھا اس طریق نے تبدیلیٔ مذہب پر زور دیا۔ چونکہ ہندوؤں میں ذات پات کا دور دورہ تھا۔ اگر ایک فرد

Marfat.com

مسلمان ہوتا تو اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا چنانچہ اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سلسلے نے اپنی تبلیغ میں اس بات پر زور دیا کہ پورے کا پورا قبیلہ مسلمان ہو جائے تاکہ سب لوگ اپنی خاندانی وراثت اور روایات برقرار رکھ سکیں۔ جنوبی ایشیا میں اس طریق کا تعارف حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے کرایا۔ اور وہی اس کے بانی تھے، حضرت بہاؤ الدین زکریا نے پنجاب اور سندھ کے تقریباً تمام علاقوں میں تبلیغ فرمائی اور ہزاروں قبائل کو اسلام کے دائرہ میں شامل کیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن علاقوں میں سہروردیہ طریق نے تبلیغ کی آج کل کا پاکستان انہیں سرحدوں پر قائم ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کی سلطنت کا جہاں جہاں مرکز رہا وہاں ہندو آبادیاں کم نہ ہوئیں اور تبلیغ اسلام وہاں جڑ نہ پکڑ سکی۔ دہلی، آگرہ دولت آباد، مرشد آباد، جنوبی ہند اور دوآبہ ایسے علاقے تھے جہاں سلاطین اور بادشاہان وقت کا تسلط رہا اور انہوں نے صوفیاء اور فقراء کے اثر و رسوخ سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہیں تنگ کیا۔ ان میں علاؤ الدین خلجی، محمد تغلق اور اکبر وہ بادشاہ ہیں جن کو صوفیاء کرام ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔

جب سلاطین دہلی کا اقتدار زوال پذیر ہونے لگا تو اسی زمانے میں ہندو مسلم صوفیاء کے خیالات کے اشتراک سے ایک نئی مذہبی تحریک نے جنم لیا جسے عرف عام میں بھگتی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک طرف تو مسلمانوں اور ہندوؤں میں سیاسی اور معاشی محاذوں پر جنگ جاری تھی تو دوسری طرف ہندو مفکرین پوری پوری کوشش کرتے رہے کہ وہ کسی نہ کسی محاذ پر ضرور مسلمانوں کو شکست دے کر رہیں گے چنانچہ مسلم خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے ایک نیا حربہ بھگتی کی صورت میں اختیار کیا دراصل یہ ہندو جوگیوں اور فلسفیوں کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی وہ اس کے ذریعے اسلام کی روح کو مسخ کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کے خیالات و افکار میں تبدیلی پیدا کر کے ان کی تہذیبی و تمدنی انفرادیت کو ختم کر دیا جائے اور ایک متحدہ کلچر اور مذہب قائم کر کے مسلمانوں کو بھی ہندو تہذیب میں ضم کر دیا جائے اس تحریک کے اثر سے اشاعت اسلام میں سُستی اور رکاوٹ پیدا ہو گئی اس سلسلے میں اکبر کے دور میں ہندوؤں کی اور بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ان حالات میں حضرت مجدد الف ثانی نے احیائے اسلام

Marfat.com

کی تحریک کا آغاز کیا اور مسلمان قوم کے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔

تحریک احیائے اسلام: حضرت مجدد الف ثانی رح کے دور میں مسلمانوں میں دو قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔

(۱) حکومت میں خرابی

(۲) نام نہاد صوفیاء کا غلط طرز عمل۔

حکومت میں خرابی: اکبر کے دور حکومت میں ہندوؤں نے امراء اور بادشاہ تک کافی رسائی حاصل کر لی تھی اور وہ کافی حد تک امراء کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رح نے سب سے پہلے بادشاہ اور امراء کو اصلاح کا مرکز بنایا چونکہ عوام میں عام طور پر اپنے امراء کی تقلید کا رجحان زیادہ ہوتا ہے اکبر نے ہندوؤں کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کیا ہندوؤں کا اثر دربار تک پہنچ گیا اور پھر یہی اثر ترقی کرتے کرتے عوام تک پہنچنے لگا ہندو مسلم ثقافت کا ایک آمیزہ سا تیار ہونے لگا جس سے مسلمانوں کی حکومت ہی کو نہیں بلکہ ان کے وجود تک کو خطرہ لاحق ہو گیا ہندو دیدہ دلیری سے مسلم شعائر کی بے حرمتی کرنے لگے مسجدوں کو شہید کر دیا گیا۔ اور ان کے دیگر مقدس مقامات کو تباہ کر دیا گیا چنانچہ اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مرشد حضرت باقی باللہ کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے امراء کی اصلاح کی اور اس سے مسلم تہذیب اپنی امتیازی شان کے ساتھ برقرار رہی ہندوؤں سے نپٹنے کے لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سخت اقدامات اٹھانے کی تجویز پیش کی کیونکہ وہ کفر کی تذلیل کو اسلام کی عزت سمجھتے تھے چنانچہ آپ نے اپنے ایک خط میں یہ نصیحت فرمائی۔

"اسلام اور اہل اسلام کی عزت کفر اور اہل کفر کی خواری ہے۔"

آپ ہندوؤں پر جزیہ لگانے کے پرزور حامی تھے ہندوستان کے صوفیائے کرام میں آپ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوؤں کے خلاف اس شدت کی پالیسی پر عمل کیا۔

Marfat.com

جس جوانمردی اور ثابت قدمی سے حضرت مجدد الف ثانی نے مسلمانوں کی خدمت کی وہ شاید کسی دوسرے بزرگ کو نصیب نہ ہوئی یہ جنگ جو کہ سیاسی محاذ پر لڑی جا رہی تھی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو کامیابی نصیب ہوئی جبکہ دوسری طرف حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک اور محاذ تھا یہ نام نہاد صوفی تھے جو کہ ہندوستان کے فلسفیانہ عقائد سے کافی متاثر تھے انہوں نے ہندوانہ عقائد کو اسلامی رنگ دے کر تصوف کی شکل میں پیش کیا۔ جو کہ مسلمانوں کے وجود اور نظریہ حیات کے سراسر خلاف تھی چنانچہ حضرت مجدد نے اس کے خلاف بڑے زور شور سے تحریک چلائی۔

نام نہاد صوفیاء: ان صوفیاء نے اپنی مرضی سے شریعت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا ایک شریعت اور دوسرا طریقت۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اس کی سخت مخالفت کی اور ثابت کیا کہ اسلام میں اس قسم کی کوئی تقسیم نہیں ہے اس طرح یہ صوفیاء نظریۂ وحدۃ الوجود کے قائل تھے اس کے علاوہ یہ رام اور رحمٰن کو ایک ہی ہستی کے دو روپ سمجھنے لگے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحؒ نے ان کی سخت مذمت کی اور انہی کوششوں سے ہندوؤں کی ہندو مذہب کی تمام تر احیائی کوششیں ناکام بنا دیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو ہندو اثر سے بچانے میں کامیابی حاصل کی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے خلفاء اور مجددیہ بزرگوں نے آپ کے مشن کو جاری رکھا اور ملت اسلامیہ کی ہر مشکل وقت میں خدمت کی اس طرح حضرت مجدد الف ثانی رحؒ کی کوششوں سے مسلم تہذیب اپنی اصلی حالت میں برقرار رہی۔

مغل حکمرانوں میں اورنگ زیب عالمگیر وہ آخری طاقتور حکمران تھا جس نے تقریباً ۵۰ سال تک ہندوستان پر حکومت کی لیکن ان کے بعد تقریباً ۱۵ سال میں دس کٹھ پتلی حکمران آئے جو کبھی تو انگریزوں کی سازشوں کا شکار ہوئے کبھی ہندوؤں کا اور کبھی عیش و عشرت کا شکار ہوئے۔ انہی حالات میں مسلم قومیت کو ختم کرنے کے لئے ہندوؤں نے ایک تحریک کا آغاز کیا جسے ہندو مورخین ہندوستان کی پہلی منظم "ہندو نیشنلسٹ موومنٹ" کے نام سے یاد کرتے ہیں شروع کی اس تحریک کی سربراہی

Marfat.com

جنوبی ہندوستان کے علاقے مہاراشٹر کا ایک مرہٹہ شیواجی کر رہا تھا۔ مرہٹے جب بھی موقع پاتے مسلمانوں اور ان کی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا کر میدان میں آجاتے تھے۔ اورنگ زیب نے ان مرہٹوں کی اچھی طرح گوش مالی کی اور انہیں شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور کیا یہ وقت مسلمانوں کے لئے بڑا اہم تھا۔ مسلمان صحیح اسلامی روح سے بیگانہ ہو گئے تھے، مغلوں کی وسیع و عریض سلطنت مختلف وجوہات کی بنا پر زوال پذیر ہونے لگی مایوسی اور ناامیدی کا دور دورہ تھا کہ ان حالات میں دہلی کے ایک گھرانے میں ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام شاہ ولی اللہ رکھا گیا۔

شاہ ولی اللہ کے سامنے سکھوں کی ستم کاریاں بھی تھیں اور مرہٹوں کی قزاقیاں بھی۔ مغل حکومت چراغ سحری کی طرح بجھا چاہتی تھی، مرکز کمزور ہو چکا تھا اور خانہ جنگیوں نے خود مسلمانوں کو کمزور کر دیا تھا۔

ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی راہنمائی کی جس کو علامہ اقبال یوں کہتے ہیں کہ؛

"شاہ ولی اللہ وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی۔"

شاہ ولی اللہ کے سامنے سب سے پہلا کام اسلامی ڈھانچہ کو متحد کرنا تھا۔ کیونکہ اس وقت مسلمان حنفی شافعی مالکی اور حنبلی کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے تطبیق کے ذریعے مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح شاہ ولی اللہ برصغیر میں جدید اسلام کے بانی بنے شاہ ولی اللہ جب ۹ جولائی ۱۷۳۲ء کو حج سے وطن واپس آئے تو انھوں نے اپنے اصل کام کا آغاز کیا اور مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ چار گروہوں میں سے نکل آئیں اور قرآن و سنت کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کریں حضرت شاہ ولی اللہ نے وقت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک نیا قانونی نظام بھی تجویز کیا جو کہ اسلامی اصولوں سے مطابقت رکھتا تھا۔

شاہ ولی اللہ نے اجتہاد کی اہمیت پر بہت زور دیا کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہر دور میں مختلف مسائل اور نئی قسم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں چنانچہ ان مسائل کے حل کے لئے اسلامی اصولوں کے مطابق نئے اصول بنانے کے لئے اجتہاد ضروری تھا انہوں نے

Marfat.com

مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی مذمت کی اور کہا کہ سب مسلمان ایک ہی ہیں فرقہ بازی مسلمانوں کے قومی تشخص کو نقصان پہنچائے گی چنانچہ انہوں نے اس کا حل یہ بتایا کہ

"مسلمان فرقہ پرستی بھول کر قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کریں"

انہوں نے کہا کہ معاشرے میں معاشی عدم مساوات نہیں ہونی چاہیئے کہ معاشی طور پر کمزور لوگ مذہب پر پوری طور پر توجہ نہیں دے پاتے۔ اس طرح ایک موقع پر معاشرے کے امیر طبقے کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ہندوستان کے مسلمان امراء تم ذلت میں گھر گئے ہو اور جس طرح کتا کتے کو نگلنا چاہتا ہے۔ اسی طرح تم ایک دوسرے کو نگل رہے ہو اس ملک میں کمزوروں کو باندھ دیا گیا ہے اور امیر لوگوں کو ہر کچھ کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔"

شاہ ولی اللہ کے دور میں مسلمانوں میں معاشرتی برائیاں بہت زیادہ تھیں۔ چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے کہا کہ:

"کچھ رسم ورواج نے تمہاری زندگیوں کو ناممکن بنا دیا ہے۔ تم غیر ضروری مواقع پر دولت کو بے دریغ خرچ کرتے ہو اور بھاری سود پر قرضہ لیتے ہو۔ تم طلاق کو بری چیز سمجھتے ہو لیکن ایک بیوہ سے شادی کرتے ہوئے کتراتے ہو۔ نہ تم خدا کا شکر بجالاتے ہو اور نہ ہی رمضان میں روزے رکھتے ہو۔ تم اپنے وقت کو غیر معیاری چیزوں اور کاموں پر ضائع کرتے ہو۔"

شاہ ولی اللہ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت کتنی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں اور ان کو اگر دور نہ کیا جاتا تو مسلمانوں کے قومی تشخص کو زبردست نقصان پہنچتا تھا لیکن شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے نتیجے میں مسلمانوں کا قومی تشخص برقرار رہا اس طرح انہوں نے ایک طرف مسلم سیاسی قیادت کو بچانے کی کوشش اور دوسری طرف مسلمانوں کی تہذیب ان کی مذہبی سماجی اور ثقافتی حالت کو سدھارا۔ اس طرح شاہ ولی اللہ صاحب کی پھونکی ہوئی روح مسلمانان ہند کے خیالات وافکار میں سرایت کر گئی اور مسلمانوں نے کچھ حد تک اپنے آپ کو سنبھالا۔

شاہ ولی اللہؒ کے بعد ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے آپ کے نظریات کو مسلمانوں میں پھیلایا اور مسلمان قوم پرست اور مذہبی راہنماؤں کی ایک جماعت تیار کی جس نے

Marfat.com

شاہ ولی اللہ کے پیغام کو دہلی کے گلی کوچوں میں پھیلا دیا۔

سکھ اور تحریک مجاہدین:

مسلمانوں کی حالت ابھی بھی اسی طرح بری تھی جس طرح پہلے۔کیوں کہ ایک طرف ہندوستان کے جنوب میں مرہٹے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کر رہے تھے تو دوسری طرف سکھوں نے شمال مغرب میں مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اگرچہ شاہ ولی اللہ کی کوششیں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھیں لیکن مسلمان حکمرانوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان شر انگیز قوتوں سے مسلمانوں کو نجات دلا سکتیں احمد شاہ ابدالی نے اگرچہ سکھوں اور مرہٹوں دونوں کی طاقت کو کمزور کر دیا تھا لیکن اس کے واپس جانے کے بعد ان کے جانشین سکھوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے جس کے نتیجے میں پنجاب اور سرحد میں سکھوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

ابھی شاہ ولی اللہ کی وفات کو پچاس برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ان کی کوششوں اور تحریک کے نتائج خاطر خواہ نکلنے لگے وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو انہیں ذلت اور نکبت کی زندگی سے نکال دے چنانچہ یہ کام ان کے صاحبزادے جناب شاہ عبدالعزیز نے کیا جن کی کوششوں سے یہ جماعت پیدا۔ ہوئی جو ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ اس جماعت سے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی اور یوں یہ جماعت اپنی غیرت ، علم و فضل کی بدولت عام لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے میں کامیاب ہو گئی اس طرح مسلمانوں میں جہاد کی روح پیدا کرنے کے لئے ایک بنیاد انہیں مل گئی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے مسلمانوں میں جہاد کی روح پیدا کرنے کے لئے دو بورڈ آف ڈائریکٹر بنائے جن میں ایک فوجی مقاصد کے لئے تھا۔ جبکہ دوسرے کا کام جہاد کو صحیح معنوں میں شروع کرنا اور پہلی کمیٹی کی کارکردگی کا جائزہ لینا تھا۔ فوجی بورڈ کے چیئرمین سید احمد شہید مقرر ہوئے جنہوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ اور ہندوستان کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کی کوششیں شروع کیں ۱۸۱۰ء میں سید احمد شہید کو امیر خان نواب آف ٹانک کے پاس فوجی خدمت کے لئے بھیجا گیا جہاں انہوں نے دفاعی حکمت عملی اور جنگ کے طریقے کو ہر طرح ذہن نشین کیا چنانچہ سکھوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے سکھوں کا صفایا

Marfat.com

کرنے کے لئے نواب آف بہاول پور اور امیر آف سندھ سے مدد مانگی لیکن انہوں نے رنجیت سنگھ کے ڈر سے مدد سے انکار کر دیا ۱۰۲۶ء میں سید احمد نے پشاور پہنچ کر پٹھانوں کی مدد حاصل کی جنہوں نے اسلام کی خاطر لڑنے کا اعلان کیا اس طرح مسلمانوں اور سکھوں میں ایک نظریاتی جنگ ہوئی سید احمد شہید نے اسلامی اصولوں کو اپناتے ہوئے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو یوں لکھا کہ

(۱) اسلام قبول کر لو۔

(۲) اگر اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو جزیہ دینا شروع کر دو۔

(۳) اگر جزیہ بھی نہیں دینا چاہتے تو جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اس طرح اس جنگ میں ۹۰۰ مسلمانوں نے شرکت کی جن میں مختلف تعداد میں مختلف علاقوں کے مسلمان شامل تھے جن کا آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ چنانچہ اس جنگ میں مسلمانوں کو ناکامی ہوئی اور سید احمد شہید بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہوئے۔

سید احمد شہید کی تحریک نے برصغیر پر کئی اثرات چھوڑے، سید احمد شہید کی تحریک کا مقصد مسلمانوں کے قومی تشخص کو برقرار رکھنا تھا اور ان میں جو برائیاں ہندوؤں نے پیدا کر دی تھیں ان کو ختم کرنا تھا۔ اور ان کے جداگانہ تشخص کو ہر ممکن طریقے پر برقرار رکھنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جہاد کیا لیکن عوام کے ساتھ براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔

سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی طرف سے چلائی گئی اس تحریک کو "وہابی تحریک" کہہ کر پکارا گیا جس کی ابتداء سعودی عرب کے محمد بن عبدالوہاب نے کی تھی جو کہ ابن تیمیہ کا شاگرد تھا جبکہ ابن تیمیہ امام احمد بن حنبل کے شاگرد تھے ان تمام لوگوں نے کوشش کی کہ اسلام میں جو بدعات ہندو معاشرے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں ان کو ختم کیا جائے، چنانچہ اسی مقصد کے لئے ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند میں ایک مدرسے "دارالعلوم" کی بنیاد رکھی۔ یہ مدرسہ مذہبی دنیا میں دینی مقاصد کا حامل تھا۔ شاہ ولی اللہ اس مدرسے کے روحانی پیشوا تھے ان کا بنیادی مقصد سلطنت عثمانیہ کے ساتھ تعلقات قائم کرنا تھا۔ کیوں کہ یہ پین اسلامزم پر یقین رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کو متحد ہو کر ہی ہندوستان سے نکالا جا سکتا ہے چنانچہ دیوبند کے علماء نے مسلمانوں

Marfat.com

میں بدعات کو ختم کر کے صحیح اسلامی اصولوں کو اجاگر کیا اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔

مغل حکمران اورنگ زیب کی پالیسیوں نے ہندوؤں کو جوش دلایا اس کے علاوہ مغربی اداروں نے بھی ہندوؤں کے قومیت کے جذبات کو ابھارا چنانچہ رام موہن رائے (۱۸۳۳ تا ۱۷۷۲) کی قیادت میں ہندو قومیت کی ابتداء ہوئی ہندو ہر قیمت پر مسلمانوں پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے اس طرح انہوں نے (۱۱۲۰) برہمو سماج کی ایک تحریک شروع کی جس کا مقصد سوئے ہوئے ہندوؤں کو خواب غفلت سے جگانا تھا یہ تنظیم بہت حد تک انقلابی تھی اور نہ ہی واضح طور پر ہندوؤں کی حامی تھی اور نہ ہی مسلمانوں کی لیکن اندر سے ہندوؤں کے ساتھ تھی اور اسی آڑ میں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی۔

اسی طرح ہندوؤں نے ایک اور تحریک ۱۸۷۵ء میں آریہ سماج کے نام سے شروع کی جس کا بانی سوامی دیانند سرسوتی تھا یہ تحریک برہمو سماج کے برعکس تھی۔

ہندو قومیت کا نظریہ کافی حد تک اجاگر ہو چکا تھا کہ اسی دوران ۱۸۸۵ء میں ایسے ادہیوم نے انڈین نیشنل کانگرس قائم کی جس کا پہلا سربراہ سر بندر ناتھ بینر جی بنا ہندوؤں نے اپنے مفادات کو کانگرس کے پلیٹ فارم سے بیان کرنا شروع کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ ہندوستان کے تمام فرقوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے لیکن مسلمان رہنما سر سید احمد خان جو کہ ہندوؤں کو اچھی طرح جانتے تھے نے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے منع فرمایا لیکن اس سلسلے میں کئی علماء نے سر سید کی مخالفت کی ۱۸۸۹ء میں برصغیر کے کچھ علماء نے دیوبند کی مولانا رشید احمد گنگوہی سے پوچھا کہ

کیا مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونا چاہیئے؟

کیا مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے؟

اس کا جواب مولانا نے یوں دیا کہ ہندوؤں کے ساتھ مل جاؤ سر سید کے ساتھ نہ ملو یہ مسلمانوں کو میٹھا زہر دے رہا ہے۔ اس لیئے ان کا ساتھ دینا غلط بات ہے۔

اس طرح سر سید کے کام کی کئی لوگوں نے مخالفت کی لیکن سر سید نے اپنا مشن جاری رکھا اور مسلمانوں کو کانگرس سے الگ رہنے کی تلقین کرتے رہے سر سید کی وفات کے بعد ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم دے دیا جس پر تمام مسلمان

Marfat.com

قائداعظم کی قیادت میں اکٹھے ہوئے اور ایک الگ وطن حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کوششوں میں ہندوؤں کے ساتھ اتحاد بھی ہوا لیکن بہت کم عرصے کے لئے اور مسلمانوں نے جب بھی اپنا جداگانہ تشخص کی بات کی ہندوؤں نے اس کی مخالفت کی یہی وجہ تھی کہ مسلمان اور ہندو اکٹھے نہ ہو سکے کیونکہ قائداعظم کے بقول:

"ایک قوم کے ہیرو دوسری قوم کے دشمن اور دونوں کے رہنے سہنے کھانے پینے اور شادی بیاہ کے طریقے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔"

چنانچہ مسلمان بطور ایک قوم کے جدوجہد کرتے رہے اور آخرکار ان کی جدوجہد رنگ لائی اور انہوں نے قائداعظم کی قیادت میں اپنے لئے ایک الگ آزاد وطن حاصل کر لیا۔ اور یوں مسلم قومیت ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔

Marfat.com

دو قومی نظریہ اور سرسید احمد خان

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان بطور ایک قوم کے ختم ہوتے جا رہے تھے انگریز جنگ آزادی کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کر رہا تھا ان حالات میں کسی ایسی شخصیت کی مسلمانوں کو شدت سے کمی محسوس ہو رہی تھی۔ جو کہ ان کی راہنمائی کر سکے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوؤں نے بھی شرکت کی تھی لیکن انگریزوں نے زیادہ تر مسلمانوں پر ہی اپنا عتاب نازل کیا کیونکہ ان کے خیال میں مسلمان گذشتہ دور میں حکمران رہ چکے تھے اور انہوں نے ان سے اقتدار چھینا تھا اس لئے انہوں نے بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ان حالات میں مسلمانوں کو سرسید احمد خان جیسی شخصیت ملی جنہوں نے اپنی علمی بصیرت سے نہ صرف انگریزوں کے دلوں سے مسلمانوں کے لیے نفرت کے جذبات کو کسی حد تک کم کر دیا بلکہ ان کو اس قابل بھی بنا دیا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلے پر ترقی کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔

سرسید احمد خان شروع سے ہی ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں تھے اس سلسلے میں ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ:۔

"میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی"

حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اس اتحاد کا نعرہ سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر بلند کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق کی فضا پیدا کریں اور انگریز اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکیں۔ انگریزوں کی تو پالیسی ہی یہی تھی کہ ان دو قوموں کو آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ لیکن جب بقول مولوی عبد الحق

"ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اردو کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی تو سرسید کے دل کو بڑی ٹھیس لگی"

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ انہی دنوں سرسید کی ملاقات مسٹر شیکسپیر سے ہوئی جو اس وقت بنارس کے کمشنر تھے۔ وہ سرسید کی باتیں سن کر متعجب ہوئے اور کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ

Marfat.com

ہیں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی
کی بھلائی کا خیال کرتے تھے سر سید نے جواب دیا کہ

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب سے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔"

سرسید کی یہ پیش گوئی بالکل درست نکلی تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد بھی جب کبھی ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کی گئیں تو ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح سرسید وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے دو قومی نظریے کی نشاندہی کی یعنی ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں ہندو اور مسلم۔ سرسید مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کو مسلمانوں کے لئے فائدہ مند اور بہتر سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے سرسید کی پیش گوئی درست نکلی۔ جوں جوں تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندو مسلم نفاق بڑھتا گیا حتیٰ کہ مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی ملک میں بحیثیت قوم اکٹھے نہیں رہ سکتے اور انہوں نے ایک الگ آزاد ریاست کا مطالبہ کر دیا بقول مولوی عبدالحق۔

"اگر سرسید کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قصر پاکستان کی بنیادیں رکھنے میں سب سے پہلی اینٹ اسی مرد نے رکھی تھی"

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مسلم کبھی بھی متحد نہیں ہوئے اگرچہ اکبر سے لے کر قیام پاکستان تک اس مسئلے کو سلجھانے کی کوششیں کی جاتی رہیں اور مختلف طریقوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں جاری رہیں، تاہم تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ سب محض سراب تھا اور ہندو مسلم اتحاد کی حیثیت ریت کی دیوار سے زیادہ نہ تھی۔

جب کانگرس قائم ہوئی تو سرسید نے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے اس لئے روکا کہ وہ جانتے تھے کہ یہ مسلمانوں کے حق میں نہایت مضر ہے۔ سب سے پہلے تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ کانگرس بنیادی طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے اور وہ مسلمانوں کے حقوق کی وضاحت نہیں کر سکتی اور نہ مسلمانوں کی راہنمائی کر سکتی ہے۔

سرسید کے بارے میں مندرجہ بالا باتوں کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

"اول تو یہ بات بلاشک و شبہ ثابت ہو چکی ہے کہ سرسید کو یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ان دونوں قوموں میں نفاق بڑھتا جائے گا وہ یہ بھی سمجھتے

87047

Marfat.com

تھے کہ اگر ان دونوں قوموں میں سے کوئی ایک حاکم ہو تو یہاں امن وامان قائم نہیں رہ سکتا اس لیے ان کا الگ الگ ہو جانا ہی مفید اور بہتر رہے گا۔

دوئم ان کو اس امر کا یقین تھا کہ مسلمان قوم کبھی کسی دوسری قوم کی غلام نہیں رہ سکتی ان کو علم تھا کہ تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان قوم آزادی کے لئے جدوجہد کرے گی۔

سوئم ان کو یہ بھی احساس تھا کہ کوئی غیر قوم دوسری قوم کو زیادہ عرصے تک غلام نہیں رکھ سکتی وہ دیکھ رہے تھے کہ آہستہ آہستہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بیزاری پھیل رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ اس کے علاوہ وہ کانگرس کے بھی مخالف تھے اور اس کے نمائندہ حکومت کے مطالبے کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے۔ گویا سرسید سیاسی آزادی کے دلدادہ تھے لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان حالات میں آزادی کا مطلب ہندوؤں کی آزادی اور مسلمانوں کی غلامی ہوگا وہ بار بار یہی کہتے تھے۔ کہ ان حالات میں جمہوریت کا مطلب اکثریت کی حکومت ہوگا۔ اس طرح سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سرسید کیا چاہتے تھے؟ یقیناً سرسید یہ تو چاہتے تھے کہ ہندوستان کو سیاسی آزادی ضرور ملے لیکن ہندو اور مسلمان الگ الگ ہوں۔

مسلمانوں کے پاس اپنا علیحدہ خطۂ زمین ہو جس پر وہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں اور وہ اپنے مذہب اور اپنی روایات کی روشنی میں اپنے لئے ایک الگ زندگی کا نقشہ مرتب کر سکیں ان کا نظام تعلیم ان کے تقاضوں اور ان کے سر پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہو۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قصر پاکستان کی سب سے پہلے بنیادیں استوار کرنے والے سرسید احمد خاں ہی تھے۔ اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے جو عظیم اسلامی مملکت دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوئی سب سے پہلے اس کا خواب سرسید ہی نے دیکھا تھا۔

دو قومی نظریہ اور اقبالؒ اور قائد اعظمؒ

قرآن مجید میں آتا ہے کہ

"ابتداء میں نوع انسان ایک ہی امت تھی پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔"

Marfat.com

قرآن مجید میں اس پیغام سے پتا چلتا ہے کہ شروع میں بنی نوع انسان ایک ہی جماعت تھے۔ لیکن بعد میں ان میں اختلافات پیدا ہوئے اور وہ مختلف جماعتوں میں بٹ گئے چنانچہ ان کے درمیان اختلافات کو ختم کرنے اور پھر سے متحد کرنے کے لئے انبیاء کرام کا ورود ہوا اس کے ساتھ ساتھ ضابطے اور قوانین بھی نازل کئے گئے نوع انسانی جب امت واحدہ سے ٹوٹی پھر سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی خاندان بڑھے تو قبائل کی شکل اختیار کر لی قبائل کے بعد نسلی امتیازات ابھرے نسلی امتیاز نے قومیت کی شکل اختیار کر لی اس تفریق کے لئے کرۂ ارض پر لکیریں کھینچی گئیں اور ان سے مختلف ممالک وجود میں آ گئے، ایک ملک کی چار دیواری میں رہنے والے ایک قوم کے افراد قرار پائے اس طرح خدا کی وسیع و عریض زمین مختلف ملکوں کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی چنانچہ انسان انسانیت کے طور پر نہیں بلکہ وطن یا قوم کی نسبت سے پہچانے جانے لگے اس طرح جب نبی آخر الزمان دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے لوگوں کو ایک امت اور متحد ہونے کا سبق دیا جنہوں نے آپ کی بات مان لی وہ مسلمان ہوئے اور جنہوں نے انکار کیا وہ کافر کہلائے اس طرح دو مختلف قومیں وجود میں آئیں۔

حضور اور خلفائے راشدین کے بعد جب دین مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر بنیادی اصول کی طرح قومیت کا یہ نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مسلمان دیگر قوموں کی طرح نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے۔ صدیوں سے برصغیر کے مسلمانو کی یہ حالت چلی آ رہی تھی کہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں ایک ایسا مسلمان مفکر پیدا ہوا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی رو سے اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی از سر نو یاد دہانی کرائی کہ امت محمدیہ کا نسلوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ پوری امت ایمان کے اشتراک کی بناء پر امت واحدہ ہے یہ مسلمان مفکر علامہ محمد اقبال تھے۔

۱۹۰۵ء میں جب علامہ محمد اقبال (۳۰ سال کی عمر) حصول تعلیم کے لئے یورپ گئے تو اس زمانے میں یورپی اقوام میں نیشنلزم کی بات بڑے زوروں پر تھی مغربی مفکرین اس نظام کو نوع انسانی کی مشکلات کا حل قرار دے رہے تھے ان حالات میں ایک ایسے نوجوان کا طالب علم کا جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو۔ متشدد نیشنلسٹ ہو جانا

Marfat.com

چاہیئے تھا۔ لیکن مورخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محو حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب ونگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تو یہ کہتے ہوئے کہ

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس طرح ایک اور جگہ کہا کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتے ہوئے۔

چین وعرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

علامہ نے وطن واپس آکر اس نظریے کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا چنانچہ وطن واپس آنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں اس نظریے پر ایک تاریخی خطاب فرمایا جس کا اردو ترجمہ "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے اسی زمانے میں شائع ہوا۔ علامہ نے فرمایا کہ:

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن اور نہ اشتراک اغراض اقتصادی بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب نے قائم فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں ملی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔"

اسی طرح علامہ نے اپنے اس مشن کو جاری رکھا اور ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کے موقع پر خطبۂ صدارت میں دو قومی نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی، تہذیبی و ثقافتی اور تمدنی، سماجی، اقتصادی۔ اختلافات اس قدر بنیادی ہیں کہ یہ کبھی دور نہیں ہو

Marfat.com

سکتے مسلمانوں کے حقوق صرف اسی طرح محفوظ ہو سکتے ہیں کہ جب انہیں اپنے مذہب اور تہذیب و ثقافت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جائے اور اس طرح مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک مسلم ریاست بنائی جائے جس میں مسلمان آزادی سے اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل پیرا ہو سکیں۔

۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد کے بعد علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس میں بھی مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کا کھل کر دفاع کیا۔ علامہ اقبال اپنے مشن کو آگے بڑھا رہے تھے کہ ۱۹۳۸ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے علامہ کو بہت صدمہ پہنچایا۔

نظریے کی مخالفت: علامہ اقبال جنہوں نے اس نظریے کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا اس کی مخالفت پر آپ بہت سیخ پا ہوئے وہ یوں کہ ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث نے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں"

شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان بہت بڑا سانحہ تھا علامہ نے جب یہ سنا تو ان کو بہت دکھ ہوا اور انہوں نے اس کا اظہار یوں کیا کہ

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر ممبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقام محمدؐ عربی است
بمصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں علامہ نے فرمایا کہ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس رسول کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرے کی تشکیل کرتا ہے اسی نسبت سے اسلام کے پیرو، امت محمدیہ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسول سے نسبت ختم ہو جاتی ہے اور جب رسول سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

Marfat.com

علامہ اقبال نے اس جواب میں اس حقیقت کو واضح کیا کہ وطن یا نسل کی بنیاد پر قومیت کا تصور ذات رسالت مآب سے اپنا رشتہ منقطع کر کے ایک جدید امت، یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مترادف ہے۔

علامہ اقبال کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا صاحب اور ان کے ساتھ دیگر نیشلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیئے تھا بلکہ نیشلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیئے تھا لیکن اس کے بجائے مولانا مدنی نے اپنے دعویٰ کے حق میں ایک لمبا چوڑا بیان داغ دیا اس کے جواب میں علامہ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکہ دین وطن" کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابل تردید حقیقت کی زندہ جاوید دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

علامہ اقبال عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے۔ لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کر رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان کے نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا؟ لیکن علامہ کی نظر بالکل صحیح مرد پر پڑی وہ تھے قائد اعظم محمد علی جناح۔

قائد اعظم محمد علی جناحؒ و نظریہ پاکستان":

قائد اعظم محمد علی جناح رح بھی علامہ اقبال کی طرح شروع میں نیشلسٹ تھے جب وہ ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشہ حکومت میں جا بیٹھے تو اس قسم کے نیشلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریے کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے، علامہ اقبال کا ہی کارنامہ تھا۔ جس کے لئے ملت اسلامیہ ان کی ہمیشہ مرہون منت رہے گی قائد اعظم کی سوانح حیات کا انگریز مرتب ہیکٹر بولیتھو کہتا ہے کہ:

> "اپنے قیام لندن کے دوران مسٹر جناح نے اقبال سے کئی ملاقاتیں کیں وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے لیکن اس کے باوجود جناح حتے اقبال کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہ کیا اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔" [۱۹]

قائد اعظم نے اسلام کے تصور قومیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم

Marfat.com

مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی قائداعظم نے بڑی واضح بات فرمائی یعنی جب پہلی بار ایک غیر مسلم اسلام لایا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آگیا۔ اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

دو قومی نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے قائداعظم نے ایڈورڈس کالج پشاور میں ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرمایا کہ

"ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔"

جداگانہ قومیت، کے اس تصور کی ہندوؤں نے شدومد سے مخالفت کی تھی نہرو نے اپنی سوانح حیات میں لکھا تھا کہ:

"مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔"

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء جس میں "قرارداد پاکستان" منظور کی گئی تاریخ پاکستان میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائداعظمؒ نے دو قومی نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندو مت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب نہیں" بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا یاد رکھیئے ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے دونوں الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیاد متضاد تصورات پر ہے دو ایسی قوموں کو ایک نظام مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مفاہمت کو بڑھائے گا۔ اور

Marfat.com

بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا۔ جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔"

اس کے ایک سال بعد قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدارس کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی۔ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔"

قائداعظم نے اپنے اس دعویٰ کو اس شدومد سے بیان فرمایا کہ ان کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں چنانچہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن مسٹر این۔ سی۔ دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار مدینہ بجنور کی یکم فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی لکھا تھا کہ:

"ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو اور مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کہ اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔"

آخر کار اس حقیقت کو ہندو "انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا اور دو قومی نظریے کی بنیاد پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دو قومی نظریے کے متعلق قائد کے خیالات کس قدر صاف اور واضح تھے۔

Marfat.com

ہندوؤں کی مذہبی و سیاسی تحریکیں

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے ورود سے ہندوؤں کو پہلی مرتبہ ایک ایسی مذہبی تحریک کا مقابلہ کرنا پڑا جس نے سابقہ روایات کے برعکس ہندو سوسائٹی میں ضم ہونے سے انکار کر دیا۔ اسلام نے مساوات کا نعرہ لگایا تو چھوت چھات اور ذات پات نے جن لوگوں کو ذلیل بنا کر رکھا ہوا تھا وہ اسلام قبول کرنے لگے۔ مسلمان صوفیاء نے سادھوؤں کے انداز اختیار کر کے اسلام کی طاقت کو ہندوؤں کے دلوں میں اتارنا شروع کر دیا تھا۔ اسلام نے توحید کے عقیدے کو اس قدر وضاحت اور قوت کے ساتھ پیش کیا کہ ہندو فلسفیوں کے لئے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ انہوں نے کروڑوں، دیوتاؤں کے مذہب میں ترمیم ضروری سمجھی اور پھر ہندوؤں سے کہا کہ توحید کوئی مسلمانوں ہی کا اجارہ نہیں ہے ہندوؤں کے قدیم دھرم میں بھی یہ عقیدہ موجود ہے اور ہندوؤں نے ہی اس کو بھلا رکھا ہے۔ چنانچہ اس ردعمل کے طور پر ہندوؤں نے "بھگتی تحریک" کا آغاز کیا اور اسلامی ترقی کو روکنے کے لئے پرچار کیا کہ اللہ، رام، ہری، اور پرماتما ایک ہی ذات کے مختلف نام ہیں انہوں نے ذات پات کو گمراہ کن قرار دیا اور کہا کہ سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہے اور ہر انسان کو خلوص کا پیکر ہونا چاہیئے۔ بھگتی تحریک نے اسلام کے چیدہ چیدہ اصولوں کو تسلیم کر کے ہندو مت کی اصلاح کی تھی لیکن یہ سب ہندوؤں کو اسلام میں شامل ہونے سے روکنے کے لئے کیا گیا تھا۔

برصغیر پاک و ہند میں یورپی اقوام کی آمد اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں سے ہندو مت کو ایک دوسری مذہبی تحریک سے پالا پڑا۔ جو ہندو تہذیب میں ختم ہونے کی بجائے اپنی منفرد حیثیت کو برقرار رکھنے پر مصر تھی۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے برطانوی حکومت نے پادریوں کو برصغیر میں آنے اور یہاں آباد ہونے کی اجازت دے کر عیسائیت کی تبلیغ میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ یہ مشنری پادری بہت تنگ نظر اور متعصب واقع ہوئے تھے انہوں نے عیسائیت کی تعلیم پر مشتمل کتابچے لکھ کر تقسیم کرنے مختلف تقریبات میں کھلم کھلا عیسائیت، کا پرچار کرنے اور دیگر مذاہب پر نار وا تنقید کرنی شروع کر دی ان تبلیغی سرگرمیوں میں انہیں باقاعدہ حکومت کے کارندوں کی امداد و حمایت حاصل تھی۔

Marfat.com

حکومت برطانیہ کی سرپرستی سے عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا حوصلہ افزا نتیجہ برآمد ہوا۔ اور نچلی ذات کے ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس کے علاوہ ۱۸۳۰ء میں براہ راست تبلیغ کے طریقے کو ترک کر کے تعلیمی اداروں کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کا انتظام کیا گیا۔ اس طرح مشنری اداروں کے فارغ التحصیل مقامی طلبا، لادینیت اور گمراہی کا شکار ہو کر اپنے روحانی اور مذہبی ورثے سے بیگانے ہو گئے۔

ان حالات میں ہندوؤں کو اپنے مذہب کی بقاء کے لئے سوچنا پڑا چنانچہ اس مرحلے پر ہندو تہذیب مختلف مکاتیب فکر میں منقسم ہو گئی ایک مکتب فکر مشرق و مغرب میں ہم آہنگی کا خواہاں تھا۔

دوسرا مکتبہ فکر جدید مذہبی و سائنسی قدروں کا ساتھ دینے کی بجائے اپنی قدیم روایات کے پرستار رہ کر مغربی افکار کی مذمت کے حامی تھے۔

تاہم ایک اور طبقہ جو کہ اعتدال پسند تھا وہ مغرب کے جدید علوم و فنون سے متاثر تو تھا لیکن اپنی قدیم مذہبی روایات و نظریات کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جدید دور کے اثرات اور نظریات کے تحت ہندو معاشرے میں متعدد مذہبی اور سیاسی تحریکیں ابھریں جن کا رخ عیسائیت کے خلاف کم اور اسلام کے خلاف زیادہ تھا۔

برہمو سماج کی تحریک:

ہندوؤں میں جدید مغربی اثرات کے تحت جن تحریکوں نے جنم لیا ان میں برہمو سماج سب سے نمایاں ہے برہمو سماج کو برہما سبھا بھی کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں ایسے لوگوں کی مجلس جنہوں نے بت پرستی کو ترک کر کے خدا کی وحدانیت پر یقین کیا اس تحریک کا بانی راجہ رام موہن رائے ایک بنگالی ہندو تھا۔ راجہ رام ۱۷۷۲ء میں رادھانگر میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی زبان پر مہارت کی وجہ سے "مولوی رام موہن رام" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

راجہ رام اسلامی توحید سے بہت متاثر تھا اس نے اسلام کا مطالعہ کیا اور بت پرستی کے خلاف "تحفۃ الموحدین" کے نام سے فارسی زبان میں ایک رسالہ لکھا جس کا دیباچہ عربی میں تھا ۱۸۱۹ء میں انہوں نے ہندو مت کی کتب کی مدد سے ثابت کیا کہ بت پرستی ہندو مت کی اصل تعلیم نہ تھی اس سے ہندوؤں کو سخت تکلیف ہوئی۔

برہمو سماج کی تحریک کا آغاز ۲۰ اگست ۱۸۲۸ء کو ہوا اس تحریک کے حامیوں میں

Marfat.com

بنگال کے مالدار ہندو شامل تھے جن میں ایک دبندر اناتھ ٹیگور تھے جو ان کے بعد برہمو سماج کے سربراہ تھے۔

برہمو سماج کے اصول:

(۱) خدا ایک ہے اس کا وجود موجود ہے وہ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہے اس لئے اسی کی پرستش کرنی چاہیئے۔ اسی سے حاجات مانگنی چاہیئں اور بت پرستی نہیں کرنی چاہیئے

(۲) انسان کی روح غیر فانی ہے اور خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

(۳) نجات حاصل کرنے کے لئے کسی دریا میں نہانا تیرتھ یا حج کرنا۔ چلہ کاٹنا یا کسی بزرگ کی سفارش کا سہارا غلط ہے نجات کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ نیک اعمال ہیں۔

(۴) جنت اور دوزخ کا تصور عام لوگوں کو نیک کاموں کی ترغیب اور برائی سے روکنے کے لئے دیا گیا ہے روح کی پاکیزگی جنت اور روح کی ناپاکی جہنم ہے۔

(۵) ذات پات کا نظام غلط ہے خدا سب کا باپ ہے اور سب آپس میں بھائی ہیں اسلیئے چھوت چھات اور اونچ نیچ ذات کے تصورات غلط ہیں۔

(۶) اگرچہ بائبل غلطیوں سے مبّرا نہیں ہے تاہم انسان اور خدا کے حقوق کا شعور پیدا کرنے کے لئے مفید ہے۔

(۷) "ستی" اور ایک سے زیادہ شادیاں کرنا منع قرار دیا گیا۔

(۸) عبادت ہفتے کے دن کی جائے گی۔

راجہ رام موہن رائے کے بعد دبندر ا ناتھ ٹیگور کے زمانے میں برہمو سماج کے اصولوں میں مندرجہ ذیل اضافہ ہوا۔

(۱) ویدوں سے بھی غلطی کا امکان ہے اور وید کا صرف وہ حصہ قبول کیا جائے گا جو مسلک توحید سے متصادم نہ ہو۔

(۲) توبہ کے لئے ندامت اور آئندہ کے لئے گناہ سے اجتناب ضروری ہے اسی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

برہمو سماج درحقیقت عیسائیت کے اثرات کی پیداوار تھی اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندو معاشرہ اپنی ۔ ائیوں سے آگاہ ہو گیا اور اس کا بالواسطہ نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کافی تعلیم یافتہ ہندو عیسائی

Marfat.com

ہو گئے برہمو سماج کی تحریک نے بنگال کی سماجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا اس نے عیسائیت کے خلاف ہندوؤں کے تعصب کو کم کیا چنانچہ بڑی تعداد میں ہندوؤں نے عیسائیت کو قبول کر لیا ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق برہمو سماج کی تعداد صرف چار ہزار تھی۔

پرارتھنا سماج: انیسویں صدی کے وسط میں بمبئی مہاراشٹر میں برہمو سماج کے خطوط پر ایک اور ہندو تحریک پرارتھنا کے نام سے عالم وجود میں آئی۔ اس کی تعلیمات اور اصول برہمو سماج سے ملتے جلتے تھے۔ اس سماج کا بانی ڈاکٹر آتما رام پانڈورنگ ہندو تھا جو ایک پروٹسٹنٹ مشنری ڈاکٹر ولسن کا دوست تھا۔ پرارتھنا سماج نے بھی ہندو معاشرے کی اصلاح میں نمایاں کردار ادا کیا تعلیم بالغاں اور تعلیم نسواں کا اہتمام کیا۔ یتیم خانے قائم کئے اور بت پرستی کے خلاف آواز بلند کی اس سماج نے ذات پات کی اتنی شدت سے مخالفت نہیں کی اس وجہ سے یہ ہندو مت کے زیادہ قریب تھا تاہم یہ سماج عیسائیت سے بھی بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس کے پیروکار عبادت میں مرہٹہ بھگتوں توکا رام اور رام دیو کی مناجات استعمال کرتے تھے اور مرہٹی اور گجراتی زبانوں میں دعائیں پڑھتے تھے اور اتوار کے دن عبادت کرتے تھے۔

دیو سماج: ۱۸۸۷ء میں لاہور کے مقام پر دیو سماج نامی ایک اور ہندو تحریک کی بنیاد پڑی جس کا بانی ستیانند اگنی ہوتری تھا۔ جو برہمو سماجیوں ہی کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ لوگ خدا کے وجود کے منکر اور سائنس کے مداح تھے یہ ہندو مذہب کی اخلاقی اقدار کو مانتے تھے، لیکن مابعد الطبیعات کے سلسلے میں مذہبی عقائد کو کوئی وزن نہ دیتے تھے اس حد تک مذہب سے دور ہونے کے باوجود یہ گروہ گوشت کھانے کے خلاف تھا، دیو سماج کے حامی مادی ترقی پر زور دیتے تھے انہوں نے تعلیم کی اشاعت کے ذریعے ہندو قوم کو مادی طور پر اوپر اٹھایا۔ اس سماج نے آریہ سماج پر بھرپور تنقید کی۔

آریہ سماج: ہندو مت میں جو تحریکیں انیسویں صدی عیسوی کے دوران رونما ہوئیں ان میں آریہ سماج سب سے زیادہ اہم ہے اس کا بانی سوامی دیانند سرسوتی تھا، جو گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک برہمن خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ دیانند نے تقریباً بیس سال تک مختلف مقامات پر تعلیم حاصل کی اسی دوران ڈنڈی کے مقام پر سرسوتی سلسلے کے ایک ویدی سوامی درجانند سے اس کی ملاقات ہوئی جس نے اسے

Marfat.com

جدید علوم کی بجائے ویدوں کے علم کو پھیلانے کا حکم دیا اس نے بہت جلد درویشانہ لباس اور عوامی زبان کو اپنایا اور اس کی تحریک ہندوؤں میں جڑ پکڑنے لگی۔ ۱۸۷۴ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب "ستھیارتھ پرکاش" مکمل کی اور اگلے سال ۱۸۷۵ء میں بمبئی کے مقام پر آریہ سماج کی بنیاد رکھی جس نے بعد میں جلد ہی نیم سیاسی حیثیت اختیار کرلی دیانند بعد میں لاہور منتقل ہو گیا، جو اس کی تحریک کا مرکز قرار پایا۔

ہندومت کی اصلاح: آریہ سماج بنیادی طور پر ہندومت کے احیاء کی تحریک تھی تاہم اس میں اصلاح کے پہلو بھی تھے مثلاً آریہ سماج بت پرستی، بچپن کی شادی "ستی" عورتوں کے لئے ویدک تعلیم کے حصول پر پابندی وغیرہ کے سخت مخالف تھے۔

آریہ سماج کے مطابق خدا ایک ہے جس کی عبادت بتوں کے ذریعے نہیں بلکہ براہ راست کرنی چاہیئے۔ آریہ سماج کے مطابق انسان اپنے اعمال کی جزا و سزا پانے کے لئے دوسرے جنم میں آتا ہے، گناہ معاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گناہ دور کرنے کے لئے کسی نہ کسی جنم میں پیدا ہو کر سزا بھگتنی لازمی ہے آریہ سماج گنگا کے اشنان یا کسی خاص مندر کی زیارت کو گناہوں کی معافی کا ذریعہ بھی نہیں مانتا۔

گئو رکھشا سبھا: آریہ سماج عیسائیت اور اسلام کے خلاف دفاعی اقدامات کی بجائے جارحانہ اقدامات کا قائل تھا چنانچہ آریہ سماج نے گئو رکھشا کے لئے ایک تنظیم قائم کی جس کا نام گئو رکھشا سبھا رکھا اس تنظیم نے گاؤکشی اور گائے کا گوشت کھانے والے (مسلمانوں اور عیسائیوں) کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔

شدھی: دیانند سرسوتی نے جن نظریات پر اپنی تنظیم کی عمارت کھڑی کی ان میں "ویدوں کی طرف مراجعت"، ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے" کے نعرے زیادہ مقبول ہوئے انہوں نے نعرہ لگایا کہ اسلام اور عیسائیت دونوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے عیسائیت کو اس لئے نقصان نہ پہنچا سکے کیوں کہ حکومت کی بیک تھی چنانچہ انہوں نے سارا زور مسلمانوں پر لگاتے ہوئے "شدھی" کی بنیاد رکھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کمزور یقین رکھنے والے مسلمانوں کو ہندو بنایا جائے اس سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ کسی بھی کمزور مسلمان کو پنچ رتن کھلا کر دوبارہ ہندو بنایا جا سکتا تھا۔

Marfat.com

ویدکی تفسیر:

ویدکے متعلق دیانند سرسوتی کا مسلک تھا کہ وہ الہامی کتب ہیں اور ان میں تمام جدید وسائنسی ایجادات کا ذکر موجود ہے اس کے علاوہ ویدوں کو دنیا کے تمام مذاہب کے ماخذ ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔

ستھیارتھ پرکاش:

دیانند سرسوتی کی مشہور کتاب "ستھیار پرکاش" جو کہ ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی اس میں اسلام کے خلاف لکھا گیا خاص کر اس کتاب کا چودھواں باب اسلام کی مخالفت میں لکھا گیا تھا۔ اس کتاب کا آخری باب انتہائی متعصبانہ جارحانہ اور اشتعال انگیز نوعیت کا تھا۔ اس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی تعصب، اور تنگ نظری آریہ سماجیوں کی روایات بن گئی۔ چنانچہ انہوں نے مناظروں کا آغاز کیا جس سے ہندو مسلم تعلقات میں بے حد کشیدگی پیدا ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ برہمو سماج اور دیوسماج کی تحریکوں کی نسبت آریہ سماج کی تحریک کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں کے انتہا پسند ذہن کو اعتدال پسند اور صلح کن تحریکیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ آریہ سماج کے مشنری دورے کے دوران ۱۸۸۳ء میں دیانند اجمیر کے مقام پر انتقال کر گیا اس کے بعد یہ تحریک دو مکاتب فکر میں منقسم ہو گئی۔ ایک گروہ انگریزی تعلیم کی اہمیت کے علاوہ آزادانہ خیالات کا داعی تھا جس کا علمبردار لالہ ہنس راج تھا جس کی زیرنگرانی تعلیم کی ترقی و ترویج کے لئے لاہور میں دیانند اینگلو ویدک کالج قائم کیا گیا۔ دوسرا مکتب فکر جس کی بنیاد ۱۹۰۲ء میں رکھی گئی کا سربراہ ہردوار کے گوردگل تھا جو کہ جدید دور میں ویدک نظریات کے احیاء کا منبع تھا۔

رام کرشن مشن:

انیسویں صدی ہی میں ایک اور مذہبی اور اصلاحی تحریک کی بنیاد رکھی گئی جس کا بانی رام کرشن پرسہا تھا جو کہ کلکتہ کے ایک نواحی مندر کا ایک غریب پروہت تھا۔ اس مشن کا بنیادی مقصد مذہبی اور سماجی اصلاح تھا۔ نیز یہ مشن خالص ویدک نظریات کا داعی تھا۔ اور مسلک کے تمام عوام کو ہندو مت پر واپس لانا چاہتا تھا۔ اور بت پرستی سمیت ہندو مت کے تمام

Marfat.com

عقائد کے تحفظ کا خواہاں تھا یہ مشن تمام مذاہب کی صداقت پر یقین رکھتا تھا۔ اس مشن کا دعوی تھا کہ اللہ، ہری، مسیح اور کرشن ایک ہی ذات کے مختلف نام ہیں جس کی ہم پرستش کرتے ہیں۔

اس مشن کا مشہور پیروکار جس نے اپنی زندگی اپنے گورو کے لئے وقف کردی کلکتہ یونیورسٹی کا نریندرا ناتھ دت نامی ایک گریجویٹ تھا جو بعد میں سوامی دویکا مندا کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی تعلیم کی عقیدت اور حیرت انگیز شخصیت کی وجہ سے بہت سے لوگ اس مشن کے پیروبن گئے۔ جن میں شہزادے مزدور اور کسان بھی شامل تھے۔ اس مشن کے پیروکار مشن کے کام کی ترقی کے لئے اپنی عمریں وقف کردیتے تھے۔ بعض پیرو ایسے بھی تھے۔ جو شادی نہیں کرتے تھے بعض دنیادار کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے تھے لیکن ان کی بودوباش مشن کے اصولوں کے عین مطابق ہوتی تھی۔ اس مشن کا اہم ترین کارنامہ ہندو سکولوں ڈسپنسریوں اور یتیم خانوں کا وسیع پیمانے پر قیام تھا۔

رام کرشن مشن نے ہندومت کی ہر چیز کا دفاع کیا کہ یہاں تک کہ بت پرستی کی بھی حمایت کی اور اس کو روحانی فیض کے حصول کا ذریعہ بنایا اس نے مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے مقابلے پر ہندوستان کو روحانیت کا علمبردار قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ مستقبل قریب میں ہندومت دنیا بھر کے انسانوں کو روحانیت سے ہمکنار کردے گا۔ یہ مشن بالکل عیسائی مشنریوں کی طرز پر ہندومت کے احیاء کا علمبردار تھا۔

تھیوسوفیکل سوسائٹی یا سماج: اس سوسائٹی کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں امریکہ میں رکھی گئی اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ انسان خدا تک "وجدان" کے ذریعے پہنچ سکتا ہے۔ ۱۸۷۹ء میں اس کے بانی مادام بلیوسکی (ایک روسی عورت) اور کرنل اسکاٹ برصغیر آئے اور انہوں نے ۱۸۸۲ء میں مدراس کے قریب اویار کے مقام پر اپنا مرکز قائم کیا ۱۸۸۹ء میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ترقی و کامیابی کے لئے مسز اینی بیسنت اس میں شامل ہوگئی اس نے چھیالیس سال کی عمر میں اس سوسائٹی کے فروغ کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔

یہ سوسائٹی بنیادی طور پر ہندومت کے احیاء کی تحریک تھی مسز اینی بیسنت کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان کے موجودہ مسائل کا واحد حل اس کے قدیم عقائد اور نظریات کے

Marfat.com

احیاء میں مضمر ہے اس نے مختلف مقامات پر سوسائٹی کی سینکڑوں شاخیں قائم کیں ۱۸۹۳ء میں مسز اینی بیسنٹ نے اپنی سوانح حیات میں لکھا کہ "ہندوستان میں ہماری سوسائٹی کا نصب العین یہ ہے کہ سب سے پہلے ہندوستان کے قدیم مذاہب کا احیاء اور ان کو سربلند کرنا ہے۔ یہ سوسائٹی خودداری، اپنے ماضی پر فخر اور مستقبل پر اعتماد اپنے ساتھ لائی ہے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر حب الوطنی کی زندگی میں ایک بڑے انقلاب اور ایک قوم کی تعمیر نو کا آغاز ہو گا۔" برصغیر میں اس تحریک نے ہر اس کوشش کی حمایت کی جو اسلام کے اخراج کی متمنی تھی۔ مسز بیسنٹ نے دوسرے مذاہب کو ہندومت کے ساتھ اس لئے جوڑا کہ اسلام کے خلاف متحدہ محاذ بنایا جائے۔ گویا برہمو سماج کے برعکس یہ ہندومت کے احیاء کی تحریک تھی۔

ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کے اثرات :

۱۹ ویں انیسویں صدی میں ہندومت کے احیاء کے لئے جو تحریکیں ابھریں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود مقصد کے اعتبار سے ایک تھیں۔ ان تحریکوں کے اثرات کے جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر تحریک نے اپنے ماحول اور زمانے کے اعتبار سے بہت سے مکاتب پر عیسائیت اور اسلام سے مصالحت کے باوجود ہندومت کی بقا کے لئے کام کیا اور بالآخر ہندوؤں میں جارحانہ جذبۂ قومیت کو ابھارا۔

ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کے مندرجہ ذیل اثرات نمودار ہوئے۔

(۱) انیسویں صدی کے نصف اوّل اور تیسرے ربع میں انگریزی حکومت اور عیسائی مشنری اس میں عیسائیت کو پھیلانے کے بارے میں جو کوششیں کر رہے تھے۔ راجہ رام موہن رائے نے بظاہر ان کے ساتھ تعاون کیا لیکن اپنے ہندو مذہب کو ترک کر کے انہوں نے ہندوؤں کیلئے نئی راہ کھولدی کہ ہندو رہتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے حکمرانوں کے ساتھ مصالحت کر لی جائے۔

(۲) ان تمام ہندو تحریکوں نے انگریزوں کے ساتھ اتحاد و مصالحت اور انگریزی تعلیم کے حصول پر زور دیا۔ اس طرح ہندوؤں کی مادی ترقی کی راہیں ہموار کیں اور صدیوں سے غلام قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔

(۳) ہندومت کے احیاء کی تمام تحریکیں ایک طرف تو اسلام اور عیسائیت کے فکری حملوں سے بچاؤ کی خاطر تھیں تو دوسری طرف نوجوان ہندوؤں کو ترک مذہب سے روکنے کیلئے

Marfat.com

ناگزیر تھیں چنانچہ ابتدائی دور میں جس رفتار کے ساتھ ہندو عیسائی بننے لگے بعد میں وہ رفتار برقرار نہ رہ سکی۔

۴۔ ان تحریکوں نے برصغیر کے پرانے کلچر کے تحفظ کے نام پر ہندو مت کی بحالی پر زور دیا اور اس کو برصغیر کا اصل مذہب قرار دے کر باقی مذاہب کو دیس سے نکال دینے کی کوشش کی۔

۵۔ مختلف ہندو تحریکوں نے جو مختلف طریقے اپنائے ان کی وجہ سے ہندو ان تحریکوں سے متاثر ہوئے۔ کسی کو گرو جی کی پوجا کے رنگ میں کسی کو گائے کے تحفظ کے نام پر اور کسی کو ہندو مت کے تحفظ کے نام پر متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔

۶۔ ہندو عوام میں آریہ سماجی تصورات کی مقبولیت نے کانگرس اور دیگر جماعتوں کا اعتدال پسند کردار ختم کر دیا۔

۷۔ جوں جوں ہندو قوم اپنی بقا کے بارے میں اعتماد محسوس کرتی گئی ان کی جارحیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ پہلے دور کی تحریکیں مدافعانہ رنگ کی تھیں لیکن آخری دور کی تحریکیں جارحیت پسند تھیں "ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لئے" کا نعرہ جس کا صحیح مفہوم یہ تھا کہ ہندو مت کے علاوہ باقی مذاہب کو ہندوستان سے نکال دیا جائے اس سلسلے میں تلک، ہندو مہا سبھا، بنکم ناتھ چیڑجی وغیرہ کی تحاریک اس سلسلے کی کڑی ہیں۔

۸۔ اس دور میں چلنے والی اکثر تحریکوں کا رخ اسلام کے خلاف تھا۔ ہندو لیڈروں نے کوشش کی کہ انگریز حکمران کی مدد سے پرانے آقاؤں سے انتقام لیا جائے اور ان کو اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو قومیت میں ضم ہونے پر مجبور کیا جائے۔

۹۔ جب یہ تحریکیں اپنے عروج پر پہنچیں تو ہر اہم موقع پر کسی نہ کسی بہانے ہندو مسلم فسادات شروع کر دیئے جاتے۔ مسلمانوں کے محلے اور شہر غیر محفوظ ہونے لگے اور "دھرتی کو ملیچھ لوگوں سے پاک کرنے کا عظیم منصوبہ" ظاہر ہونے لگا اس طرح تحریکوں نے ہندو مسلم تصادم کی راہ ہموار کی۔

۱۰۔ ہندو تحریکوں نے ہندو مسلم فساد کا جو سلسلہ شروع کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر پاک و ہند میں دونوں قومیں بے انتہا فسادات و خون ریزیوں کے دو الگ الگ ملک بنانے پر مجبور ہو گئیں۔

Marfat.com

مسلمانوں کا ان تحریکوں پر ردعمل :

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی طرف سے کئی مذہبی تحریکیں شروع کی گئیں ان تحریکوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات برقرار رکھے۔ مساجد آباد کیں۔ نماز روزے کا اہتمام کیا جدید طبقات بھی کم از کم شادی بیاہ اور موت و حیات کے معاملات میں اسلامی شعائر کے پابند رہے۔ اگر علماء کی یہ تحریکیں اس دور میں نہ چلتیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ برائے نام مسلمان بھی باقی نہ رہتے۔

انیسویں صدی ہی میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کئی تحریکیں شروع کی گیئں ان کے جواب میں آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے خلاف مناظروں میں علماء اسلام نے جو عقلی برتری حاصل کی اس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں خود اعتمادی، قومی تشخص کا احساس اور مدافعت کا جذبہ پیدا ہوا اور اس کے علاوہ ہندوؤں اور عیسائیوں کے جارحانہ عزائم کے خلاف انہی دفاعی جذبات نے مسلم لیگ کی تشکیل کی۔

ہندوؤں کی تحریکوں کا جواب دینے کے لئے مناظروں کے اہتمام کی وجہ سے مسلمان جو فقہی اور فروعی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے۔ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے متحد ہو کر ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کا مقابلہ کیا۔

ہندو تحریکوں نے جب برصغیر پاک و ہند سے اسلام کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے شروع کئے تو مسلمانوں کی مذہبی تحریکوں کے زیر اثر مسلمانوں نے اس چیلنج کا جواب دیا اور ہر میدان میں ہندو اکثریت کا مقابلہ کیا۔

ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کے خلاف مسلمانوں نے اپنی مذہبی تحریکوں میں اسلامی تعلیمات کو کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے ذہن میں تازہ رکھا، چنانچہ مسلمان اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ قوم سمجھنے لگے اور جب ہندوؤں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا تو اگر علماء میں سے ایک کثیر تعداد انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے کانگرس کی ہمنوا بن گئی تھی، عام مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ ایک قوم میں ختم ہونا کبھی گوارا نہ کیا اور یہی وہ جذبات تھے۔ جو کبھی مسلم لیگ کی مقبولیت کی صورت میں اور کبھی دو قومی نظریہ اور قرارداد پاکستان کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے۔

Marfat.com

اس طرح مسلمانوں نے ہندومت کے احیاء کی تحریکوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی ان کی تحریکوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس کی وجہ انیسویں صدی میں علماء کی طرف سے مذہبی تحریکوں کا شروع ہونا تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۸۵۸ء:

یہ ایکٹ برصغیر کی آئینی تاریخ میں "بہتر طرز حکومت کی بنیاد فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک اہم ترین کڑی تھی۔

اس ایکٹ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی ختم کر دی گئی اور حکومت ہند کے اختیارات انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاج برطانیہ کو منتقل ہو گئے۔ اب گورنر جنرل کو وائسرائے کہا جانے لگا۔

بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ بورڈ آف ڈائریکٹر کو ختم کر دیا گیا۔ ان دونوں کے اختیارات سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہند اور اس کی انڈین کونسل کے سپرد کر دیئے گئے۔ سیکرٹری آف سٹیٹ پارلیمان میں بیٹھتا تھا اور ایک پارلیمانی انڈیا سیکرٹری اس کی امداد پر مامور تھا۔ اگرچہ وہ برطانوی کابینہ کا وزیر ہوتا تھا مگر اس کے اخراجات کا بار ہندوستانی مالیات پر پڑا۔ سیکرٹری آف سٹیٹ کو ہر سال رپورٹ پیش کرنا ہوتی تھی جس میں ہندوستان کا اخلاقی اور مادی ترقی کا ذکر ہوتا تھا۔

انڈین نیشنل کانگرس

سوال: انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل اور اس کے منشور کا تفصیلی جائزہ لیجیے؟

جواب: کانگرس کی تشکیل کی وجوہات۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کو اس بات کا احساس ضرور ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ سیاسی طور پر بیدار ہو چکے ہیں۔ انہوں نے تمام ہندی باشندوں پر یہ تاثر ڈالنا چاہا کہ انگریز کا تحکم ناقابل تسخیر ہے لیکن حقیقت میں وہ عوام کے جذبات و خیالات سے خائف ہونے لگے تھے۔ اس خوف کے پیش نظر انگریز نے ایک ایکٹ پاس کیا جس کا نام البرٹ ایکٹ رکھا گیا۔ یہ ایکٹ ۱۸۸۳ء میں نافذ کیا گیا اور اس ایکٹ کی رو سے ملک میں

Marfat.com

جاری ہونے والے تمام اخبارات کو پریس آزادی سے محروم کر دیا گیا۔ اور کسی بھی ہندوستانی باشندے کو بغیر وجہ بتائے گرفتار کیا جاسکتا تھا اور بغیر مقدمہ چلائے ملک بدر کیا جاسکتا تھا۔

۱۸۸۴ء میں یعنی اس سے ایک سال پیشتر مارکوئیس آف رپن وائسرائے ہند کے زمانے میں لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ پاس ہوا جس کے تحت میونسپل کونسلیں اور ضلع کونسلیں قائم ہوئیں۔ لیکن جو طریقہ کار ان کونسلوں میں حصہ لینے کا مقرر کیا گیا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہندوؤں کو پہنچا۔ اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے انگریز نے ایک خاص قسم کی ملی بھگت کر کے مسلمانوں کے خلاف انتقامی نوعیت کی سازش کی تھی۔ اس دوران میں ہندوؤں نے انگریز سے شیر و شکر ہو کر اس کے کان اس قدر بھرے کہ انگریز کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ اس کا سب سے بڑا دشمن مسلمان ہی ہے۔ اس لئے اگر وہ عوامی سطح پر مسلمانوں کو کوئی قانونی رعایت دینا بھی چاہتا تھا تو وہ محض ہندوؤں کی وساطت سے ہی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو انفرادی لحاظ سے بحیثیت الجماعت انگریز ایک لمحہ بھی برداشت نہ کرنا چاہتا تھا۔ انگریز کو پتہ چل چکا تھا کہ اسکی سخت گیری کی وجہ سے مسلمانوں کو اس طرح ذہنی طور پر ضربیں لگی ہیں کہ ان میں اب سر اٹھانے کی ہمت نہیں رہی۔ ہندو کو چونکہ انگریز کی طرف سے موافقانہ رویہ نصیب ہوا تھا۔ اس لئے اس کو سیاسی اعتبار سے قدرے زیادہ مراعات حاصل ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ہندو نے کچھ اس طرح مکارانہ انداز میں انگریز کے سامنے ہاتھ باندھ کر مسلمانوں کو بدنام کیا تھا اور خود کو مظلوم ثابت کرنے کیلئے مسلمانوں کی نو سو سالہ پرانی حکمرانی کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اسلئے اسکو موقع مل گیا کہ انگریز کی سرپرستی میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں سماجی نوعیت کی مختلف انجمنیں محدود طریقے پر تشکیل کرے چنانچہ انڈین ایسوسی ایشن بمبئی ایسوسی ایشن، ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن، مہاجن سبھا (مدراس) اور سروجنک سبھا (پونہ) وغیرہ یہ تمام ایسی انجمنیں تھیں جو سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی جھلک بھی رکھتی تھیں۔ اس صورت حال میں انگریز چاہتا تھا کہ ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے کچھ نہ کچھ مقام حاصل ہو ہی جانا چاہیئے انکی آواز کو موثر انداز میں ایک مرکز سے سننے کیلئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو برطانیہ میں حزب مخالف کی نوعیت کی جماعت ہو کیونکہ ہندوستان میں رہنے والی کوئی سیاسی جماعت انگریز کیلئے تعمیری پروگرام تو پیش کر ہی نہیں سکتی تھی بلکہ اس جماعت کے ذریعے ہندوستانیوں کو پہنچنے والے دکھوں کی آواز بھی ضرور حکومت انگلینڈ کے کانوں تک پہنچ جائیں گی۔

مسٹر ایلن آکٹارسین ہیوم (ALLAN OCTARSIAN HUME) جو ایک اعلیٰ درجے کے

Marfat.com

برطانوی سرکاری عہدیدار تھے، نے معلوم کیا کہ ملک میں سیاسی بے چینی پھوٹ بڑھنے لگی ہے اور خفیہ سازشوں کا انتظام ہونے لگا ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی گورو اور چیلے مسلمانوں سے آزاد ہونے کے بعد اب اس کوشش میں ہیں کہ ساہوکاروں کو لوٹ لیا جائے اور ملک میں بدامنی و بدانتظامی کا دور دورہ کیا جائے اور پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت کی جائے۔ چنانچہ دکن میں اس سلسلے میں کچھ بلوے ہو بھی گئے۔ چنانچہ مسٹر ہیوم فی الفور شملہ گئے اور وائسرائے لارڈ ڈفرن (LORD DUFFERIN) سے اس سے اس صورتحال پر تفصیل سے بات کی اور ساتھ ہی اس نے تجویز پیش کی کہ آل انڈیا سطح پر ایک ایسی سیاسی جماعت بنانے کیلئے اہل ہند کو اجازت دی جائے۔ جسطرح ہر میجسٹی ملکہ وکٹوریہ کی اپنی حزب مخالف موجود ہے۔ اس حزب مخالف کے پاس اگرچہ کوئی عملی اختیارات نہیں ہوتے لیکن اس کی وساطت سے دگرگوں نوعیت کے معاملات کا پتہ چلتا رہتا ہے، اور مخالفین کی دلسوزی، اعتراضات اور مطالبات بن کر سامنے آتے رہتے ہیں اور ہر حکومت کو ہر قسم کے حالات سے آگہی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ لارڈ ڈفرن نے اپنی منظوری اور کچھ تجاویز کے ساتھ لارڈ ہیوم کو اسوقت انگلستان روانہ کیا تاکہ وہ اکابرین سلطنت یعنی لارڈ ڈپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز کیبرڈ، سر جان برائٹ، مسٹر ریڈ اور مسٹر سلیگ وغیرہ سے مل کر صلاح مشورہ کر کے ہندوستان میں ایک سیاسی جماعت کانگرس کی تشکیل کی جائے۔ اس صلاح مشورے میں ہیوم کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور وہ ۱۸۸۵ء کے وسط میں واپس ہندوستان لوٹ آیا۔ اب اسکے پاس ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل کے لئے ایک اچھا خاصا ڈھانچہ موجود تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کا اعلان:

مسٹر ہیوم ہندوستان کی بالکل نئی اور اولین سیاسی جماعت کی تشکیل کا ڈھانچہ اپنے آقاؤں سے منظور کرا کے جب واپس لوٹا، تو اس نے فی الفور اسکی باقاعدہ تشکیل کا اعلان کر دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو ٹھیک بارہ بجے دوپہر گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی کے ہال میں ایک بنگالی عیسائی مسٹر بینرجی (MR-BANNERTI) کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین کی تعداد ۷۲ تھی۔ ان میں بیشتر قانون دان اور معلم حضرات تھے۔ ان میں مسلمان صرف دو تھے۔ مسٹر ڈبلیو سی۔ بینرجی (W-C-BANNERTI) نے اپنے خطبۂ صدارت میں سب سے پہلے انگریزی راج کی برکتیں گنوائیں۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کے فروغ اور عمدہ حکمرانی جس کو اس نے (ORDERLY GOVERNMENT) پرستائش کیا اور انگریزی حکومت کو یقین دلایا کہ وہ اور ان کی جماعت ہمیشہ

Marfat.com

انگریزوں کی وفادار رہے گی۔ اس اجلاس میں کانگرس کی طرف سے جن اغراض ومقاصد کا اعلان کیا گیا ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر اور اہم نوعیت کے تھے۔

(۱) ہندوستانی نمائندوں کو حکومت میں نمائندگی دی جائے گی۔

(۲) قومی وحدت کے لئے سعی کی جائے گی۔

(۳) انگریز سے وفاداری کی جائے گی۔

(۴) انفرادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

(۵) مجلس قانون ساز بنائی جائے گی جس میں ہندوستانی عوام کے نمائندوں کو شریک ہونے کی اجازت ہوگی۔

(۶) اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانی باشندوں کو شریک کیا جائے گا۔

(۷) ملک میں ایک آئینی حکومت کی جائے گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل خود انگریز کے دماغ کی اختراع ہے اس لئے اس کے ابتدائی صدر خود انگریز ہی رہے۔ ان صدروں میں مسٹر جارج نیول (MR-GEORGE YULE) اور مسٹر ڈبلیو۔ڈبلیو ویڈربرن (MR-W-W-WEDDERBURN) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ انکے علاوہ ابتدائی کانگرس کے ایک بہت ہی سرگرم رکن مسٹر بریڈلا (MR-BRADLANGH) کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

کانگرسی ہندوؤں کی طرف انگریز کی خوشامد: کانگرس کے قیام کا مقصد دراصل یہ تھا کہ اس جماعت کے ذریعے ہندوستان کے باشندے اپنے دلی جذبات واحساسات کو حکومت تک اس مقصد کے لئے پہنچا سکیں کہ ان کو درپیش مسائل کا آسانی سے حل تلاش کیا جا سکے حقیقت میں یہ سیاسی بیداری، ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی کے بعد حصول آزادی کی طرف دوسرا قدم تھا۔ لیکن ہندو کی موقع پرستی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت کانگرس کی تشکیل ہوگئی اور انگریز نے بڑی مہربانی سے اس کے قیام کی تصدیق کر دی تو ہندو ارکانِ کانگرس میں بجائے جذبۂ بیباکی پیدا ہونے کے جذبۂ خوشامد ان کے ذہنوں پر چھا گیا اور ایک عرصہ دراز تک اس کے ساتھ خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کانگرس کے سالانہ اجلاس میں ہوتا رہا۔ کانگرس کے پہلے اجلاس میں کانگرس کے صدر مسٹر بنرجی نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے کہا: "برطانوی گورنمنٹ کا پورا پورا اور مستقل خیر خواہ مجھ سے زیادہ اور میرے ان دوستوں سے زیادہ جو میرے گرد بیٹھے ہیں اور کوئی نہیں ہے۔"

Marfat.com

۱۸۸۶ء میں کانگرس کے دوسرے سالانہ اجلاس کی صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی ۔ ”ہمیں مردوں کی طرح بولنا اور اعلان کرنا چاہیئے ۔ کہ ہم اپنی ریڑھ کی ہڈی تک انگریز کے وفادار ہیں ہم ان فوائد کو سمجھتے ہیں، جو انگریزی حکومت نے ہم کو عنائت کئے ہیں ۔ ہم اس تعلیم کی دل سے قدر کرتے ہیں ۔ جو ہم کو دی گئی ہے ۔ اور اس نئی روشنی کی جو ہم پر ڈالی گئی ہے ۔ ہمارے اندھیرے کو اس نے اجالا کر دیا “ اس جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے دادا بھائی نوروجی نے سابقہ حکومتوں پر بالواسطہ نکتہ چینی کرتے ہوئے اعلان کیا ۔ کہ انگریز کی آمد سے ہم کو یہ نیا سبق ملا کہ ”بادشاہ رعایا کے لئے بنائے گئے ہیں لیکن رعایا بادشاہوں کے لئے نہیں ہوتی “ اس فقرے کا واضح مطلب یہ ہے کہ سابقہ حکمرانوں نے رعایا کو بھی ذاتی ملکیت سمجھ کر استعمال کیا تھا ۔

۱۸۹۰ء میں ایک سرگرم کانگرس رکن سر فیروزشاہ مہتا نے کانگرس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ” ہماری وفاداری کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو گیا ہے ۔ ایک بعد ایک وائسرائے نے ہمارے وفادارانہ پرامن مقاصد اور کوششوں کی پُرزور شہادت دی “ ہسٹری آف کانگرس “ کے مصنف مسٹر سیتا رامیا اپنی کتاب کی جلد اوّل میں بیان کرتے ہیں ۔

” ابتدائی زمانے میں کانگرس کو اپنی وفاداری کے مظاہرے کرنے کا عشق تھا ۔ جب ۱۹۱۴ء میں لارڈ پینٹ لینڈ گورنر مدراس، کانگرس کے پنڈال میں آئے تو صرف یہی نہیں کہ ایوان کے تمام آدمی ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے ۔ اور انہوں نے تالیاں بجائیں ۔ بلکہ مسٹر اے پی پیڈرد کو جو مہم پر چلنے والی ہندوستانی فوج کے بھیجنے پر تقریر کر رہے تھے، روک کر سر سرندر ناتھ بینرجی سے کہا گیا کہ تاج کے ساتھ وفاداری کے ریزولیوشن کی تحریک کریں اور انہوں نے بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا ۔

انگریز اس خوشامد سے پوری طرح آگاہ تھا اور اس نے اس سیاسی جماعت کی توجہ سیاسی طور پر تعمیری کام کی طرف لگانے کی بجائے اپنی ہی مہربانیوں کی طرف لگائے رکھی تھی ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کانگرس ہندوستان کے باشندوں کی سیاسی جماعت نہیں، بلکہ انگلش کانگرس تھی، انگریز ہیومین کی وساطت سے اس کانگرس کو دس ہزار سے پچاس ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ مل جاتی تھی، اجلاس کی صدارت کیلئے بالعموم برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان کو مدعو کیا جاتا تھا اور کمال کی بات یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کئی سال تک گلیڈ سٹون جو برطانوی وزیر اعظم تھا، کی سالگرہ مناتی رہی ۔ اس سے بڑھ کر خوشامد اور کیا ہو گی کہ ایک سیاسی جماعت اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے ان کے وزیر اعظم کی انفرادی حیثیت سے بھی تعظیم و تکریم کرتی رہی ۔

Marfat.com

انڈین نیشنل کانگرس کی آقا پرستی صرف ابتدائی سالوں ہی میں جاری نہ رہی تھی بلکہ ایک طویل مدت تک ہندوؤں نے انگریز کے تحکم کو تمام باشندوں پر اس طرح مسلط ہونے دیا جیسے ان کو ایک ناپسندیدہ حاکم سے نجات مل گئی ہو۔ اور ایک قابل قبول فرمانروا کی اطاعت میں لذت محسوس ہو رہی ہو۔ اور آزادی کی سانس لینے کے لئے انگریز کی فرمانبرداری میں عین مصلحت جانی اور کوئی اپنی برتری پیدا کرنے کی بجائے فرنگیوں کی برتری کو تقویت دینے کی کوشش کی۔ ہندو کی اس سست روی سے مسلمانوں کی مشتعل جذبات میں کمی پیدا ہونی شروع ہو گئی اور آخر کار ہندوؤں نے مل کر مسلمانوں کی عظمت کو مستقل طور پر نیچا دکھانے کیلئے انگریز کے خفیہ پروگراموں میں شریک ہونا شروع کر دیا۔ انگریز نے نے بھی سیاسی میدان میں ہندوؤں ہی کی زیادہ حوصلہ افزائی کی تاہم اس نے اپنے وقار میں فرق نہ آنے دیا۔

انڈین نیشنل کانگرس کے اغراض و مقاصد میں بالعموم لفظ "ہندوستانی" استعمال کیا گیا۔ اس لفظ سے اس کا بظاہر مطلب یہ تھا کہ ہر وہ شخص جو ہندوستان کا باشندہ ہو، اس میں مسلمان یا ہندو یا عیسائی ہونے کا کوئی امتیاز نہیں چنانچہ اس طرح کی فضا بحال رکھنے کیلئے چند ایک بارسوخ ہندوؤں نے چند ایسے مسلمان برگزیدہ شخصیات سے ناطے جوڑنے شروع کر دیئے جن کی معاشرے میں کچھ آواز تھی لیکن حقیقت یہ تھی مسلمان کا وقتی طور پر ظاہری ملاپ ہندوؤں کی اس چال کا ایک حصہ تھا۔ جس کے ذریعے اس نے انگریزی کو سیاسی آزادی کیلئے ہموار کرنے کی راہ نکالنا تھی۔ اصل میں ہندو جانتا تھا کہ اگرچہ اس نے انگریز کی رائے کو سیاسی آزادی کیلئے ہموار کر بھی لیا یا سیاسی مراعات حاصل کرنے کیطرف مائل کر ہی لیا تو انگریز کو آئینی طور پر سب سے بڑا اعتراض یہ مل جائے گا کہ ہندوستان کی دوسری اکثریتی جماعت مسلمان کی کیا پوزیشن ہوگی راہ ہموار رکھنے کے پیش نظر ہندو نے مسلمان کو اپنانے کی تکالیف برداشت کی ورنہ جب کبھی بھی کسی ہندو لیڈر کے منہ سے لفظ ہندوستانی نکلتا تھا۔ اسکا مقصد کشور ہندوستان کا ہندو باشندہ ہونا تھا۔ بدقسمتی سے مسلمان سیاسی انحطاط کے بعد بحیثیت قوم اس قدر گہرے گڑھے میں گر گئے تھے کہ انہیں اپنا سر اٹھا کر بھی دیکھنے کی قوت حاصل نہ تھی۔ جو لوگ ان میں ذی مرتبت تھے وہ ذلیل وخوار ہو رہے تھے جو دانشور تھے۔ انکی دانش وری نظام تعلیم بدل جانے کی وجہ سے تحیر وتغیر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ تاہم اس دور میں مسلمانوں میں ایک مرد جواں ہمت سرسید احمد خان نے انگریز کا نہایت عمیق انداز سے مطالعہ کیا۔ اس کی نفسیات وسیاسیات کی گہرائی میں گئے۔ اور ہندوؤں کی چال بازی کی باریکیوں کو سمجھ کر اپنے مسلمان بھائیوں کو ببانگ دہل مطلع کرنے لگے۔ زمانہ اسقدر تبدیل ہو چکا تھا کہ پرانی قدریں اور پرانے اصول و روایات بے کار ہو کر رہ گئی تھیں قدیم خیالات وتصورات متروک ہوتے جا رہے تھے اور

Marfat.com

خود ہندو اپنے آپ کو اس قدر تیزی سے انگریزی ماحول میں ڈھالتا جا رہا تھا کہ مسلمان اس کے مقابلے میں بے حد پیچھے رہ گئے تھے۔ ہندو نے انگریز کی قربت اس لئے جلد ڈھونڈنا شروع کی تا کہ وہ جلد از جلد انگریزی مضمرات سے واقف ہو کر ان کی رد میں مواد جمع کر سکے۔ لیکن شروع شروع میں اس ہندو نے خود کو انگریز کا بہت بڑا فائدہ دے کر انگریز سے بہت زیادہ ناجائز فائدہ اٹھایا ہندو نے اپنی مسکین مزاجی اور چرب زبانی سے بہت فائدہ اٹھایا لیکن مسلمان اپنی پرانی اقدار اور پرانے انداز فکر پر ہی نازاں رہتا تھا اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ہندو "ہزارپا" کی مانند اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ گہرے گاڑتا جا رہا تھا۔ اور جہاں کہیں کسی مفید نتیجے کا تعلق ہوتا تھا۔ انگریز کو اس کے لئے کسی ہندو سے مناسب شخص نہ ملتا تھا۔ کیونکہ انگریزی پڑھنے اور سمجھنے میں یہ لوگ مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو انگریزی تعلیم کے میدان میں بہت آگے رہتا تھا تا کہ پڑھ لکھ کر کسی انگریزی دفتر میں ملازم ہو جائے۔ اور سرکاری رازوں کو نہایت خوش اسلوبی سے رازداری کے صیغوں سے نکال کر منظر عام پر لایا جائے۔ بد قسمتی سے مسلمانوں میں باقاعدہ ایک جماعت کی شکل میں متعدد افراد اس بات کے شاکی تھے کہ انہیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کیلئے کہا ہی کیوں جاتا ہے لیکن ان مخلص مسلمانوں نے یہ نہ سوچا کہ چند ایک سال میں اگر مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں ہندو کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے تو یہ پھر کبھی نہیں انکے ہمراہ ہو سکنے اور اس مسلمان کی تعلیمی کمزوری سے ہندو کو بہت تقویت پہنچے گی چنانچہ اس خیال کے پیش نظر سر سید احمد خان نے اعلان کیا کہ تمام مسلمان مل کر انگریزی تعلیم حاصل کریں اور انگریزی معاشرہ کو سمجھنے کیلئے خود کو اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں تا کہ وہ انگریز کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے آگاہ ہو جائیں اور ہندو کو اپنی برتری قائم کرنے کا موقع نہ مل جائے انڈین نیشنل کانگرس ہندوؤں کے صرف ایسے مقاصد کی پرورش کے لئے وجود میں آئی جس سے صرف ہندو طبقے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔ چنانچہ ہندو نے نہایت چاپلوسی سے انگریز کو یہ بات سمجھا دی کہ انڈین نیشنل کانگرس میں لفظ ہندوستانی سے مراد صرف مسلم، سکھ، عیسائی نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف ہندو باشندہ ہے چنانچہ اس ہندو نے سیاسی چالوں کے ساتھ مسلمانوں کی مخالفت میں اضافہ کر دیا "سیاسیات ملیہ" از محمد امین زبیری میں درج ہے۔ کہ ہندو نے اپنی مطلب براری کی فطرت کے عین مطابق کانگرس کے پلیٹ فارم کو استعمال کیا۔ کبھی تو نہایت ہی خوشامدانہ انداز اختیار کیا اور کبھی باغیانہ انداز میں گفتگو سے بھی گریز نہ کی۔ کبھی تو انگریز کی ستائش وحمایت میں جلسے منعقد کئے جاتے لیکن کبھی حکومت پر نکتہ چینی پر مبنی کسی قسم کا لٹریچر جو نہایت باغیانہ انداز میں تحریر ہوتا تھا اور تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہندو کے اس رویے کو دیکھ کر خود لارڈ ڈفرن نے اہل کلکتہ کی ایک الوداعی پارٹی میں تقریر

Marfat.com

کرتے ہوئے کہا کہ عوام کو بالخصوص اور بنگالی اخبار نویسوں کو بالعموم یہ بات کہی جاتی ہے کہ کوئی فرد دوسرے فرد کو حکومت کے خلاف کسی قسم کا اشتعال نہ دلائے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے گا تو بہت ممکن ہے کہ ۱۸۵۷ء والے واقعات پھر رونما ہونے لگیں۔ اس پر کانگرس نے نہایت مدبرانہ غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا۔ کہ انگریز کے بارے میں کوئی ایسا جملہ جلسے میں استعمال نہ کیا جائے جس سے اس کی شہرت پر زد پڑتی ہو۔

کانگرس کی تشکیل میں انگریز کی سازش: انگریز نے انڈین نیشنل کانگرس اور اسکے طرز عمل کا بھی نہایت غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جو مقاصد لے کر یہ یہ کانگریس تشکیل پائی تھی وہ اگر پورے ہو جائیں تو انگریزی حکومت آج نہیں تو کل ضرور لرزاں ہوگی۔ اسکے ساتھ ہی اسنے یہ بھی بھانپ لیا کہ بیشتر مسلمان ہندوؤں کے جھانسے میں نہیں آنا چاہتے۔ وقتی تقاضوں کے لحاظ سے یہ ایک گونہ تقلید میں یا اپنے اکابرین ملت کے پیش نظر کچھ مسلمان اس میں ضرور شریک ہو گئے۔ لیکن انگریز نے ان دونوں بڑی قوموں میں کانگرس کے معنی بیان کر کے ہی پھوٹ ڈالنے کی کامیاب کوشش کی۔ انگریز نے انہوں ہی کی وساطت سے مسلمانوں کے دلوں میں انڈین نیشنل کانگرس کے خیال یہ بتلائے کہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جس میں صرف ہندو لوگ بحیثیت قوم آزاد زندگی گزاریں گے چنانچہ انڈین نیشنل کانگرس کا ترجمہ ہندوستانی قومی اجتماع بتایا گیا۔ اور ہندوستانی سے مراد ہندوستان کا ہندو قرار دیا گیا اسی لفظی ترجمے ہی سے مذہبی منافقت کی ابتدا ہو گئی انگریز نے اس منافقت کے بیج کو بہت بڑے خاردار درخت کی صورت دینے کیلئے بہت جتن بھی کئے تاکہ اہل ہندان کانٹوں میں الجھ کر رہ جائیں اور خود اپنے ہی ہاتھوں زخمی ہو کر رہ جائیں۔ سر سید احمد خان انگریز کی اس چال کو نہایت زیرکی سے جان گئے تھے چنانچہ انہوں نے فی الفور اعلان کیا کہ انگریزی تعلیم کا حصول مسلمانوں کی بقا کے لئے بے حد ضروری ہے اسلئے انہیں یہ صرف انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف نہایت حوصلہ مندی سے قدم اٹھانا چاہیئے بلکہ اس تعلیم کی مدد سے اپنے نظریات کی ترویج کیلئے بھی کوششیں جاری رکھنا چاہیئں چنانچہ اس سلسلے میں سر سید احمد خان نے ذاتی کوششوں سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اہتمام بھی کیا اور اس کانفرنس میں جو دسمبر ۱۸۸۷ء میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوئی، بہت سے اہم فیصلے کئے گئے جن میں مسلمانوں کیلئے سرکاری ملازمتوں کا تناسب، کونسلوں میں طریق انتخاب بر نظر ثانی اور مقابلے کے امتحانوں میں مسلمانوں کو تناسب کے لحاظ سے شرکت کرنے کی اجازت وغیرہ شامل تھی۔

اب سر سید احمد خان، نہایت بے باکی سے ہندو کے خلاف تنقید کرنے لگے ۱۸۸۸ء میں انہوں نے

Marfat.com

ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندو چالوں سے ہمیں نقصان پہنچائے جا رہا ہے۔ سیلف گورنمنٹ کی تشکیل کے سلسلے میں انگریزوں نے جن دھاندلیوں سے کام لیا وہ اس بات کی دلیل تھیں کہ مسلمان کو زیادہ سے زیادہ پس پردہ رکھا جائے۔ چونکہ ہندو کی یہ سازش شروع ہی میں فاش ہو گئی تھی اس لئے مسلمان شروع ہی میں محتاط ہو گئے تھے۔ انہوں نے کانگرس کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کا جواب دینے کی غرض سے ایک جماعت "یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" بنائی۔ اس جماعت نے دو سال تک نہایت موثر انداز میں کام کیا۔ بعد میں سرسید کی توجہ زیادہ تر علی گڑھ تحریک کی طرف مبذول ہو گئی جس نے پورے ہندوستان میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اس لئے دو سال کے عرصہ کے بعد مذکورہ ایسوسی ایشن خود بخود ختم ہو گئی۔

انڈین نیشنل کانگرس میں ہندو انگریز سازش کو مسٹر حسن ریاض مصنف "پاکستان ناگزیر تھا" نے اس طرح بیان کیا ہے "حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے بڑی ذہانت سے ہندوستان میں اپنے سیاسی تجربات استعمال کئے۔ مسلمانوں کو ان کی تہذیب، تمدن، علم اور سیاسی اقتدار کے بلند مقام سے گرا کر اور بالآخر ان پر معاش کے تمام دروازے بند کر کے اور حکومت کی تعزیری سے ڈرا کر اطاعت پر مجبور کیا اور ہندوؤں کو یہ یقین دلایا کہ برطانیہ کی طاقت و سنگینوں کی حمایت میں ان کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا موقع دیا جائے گا اور اپنی وفاداری پر آمادہ کیا۔ جس انداز کی پارلیمنٹری حکومت کا ۱۸۶۱ء میں آغاز کیا گیا وہ صاف اسی نتیجے کی طرف اشارہ تھی۔ سرسید نے اس ہولناک انجام سے بچانے اور اتنی مہلت حاصل کرنے کیلئے کہ اعلیٰ تعلیم پا کر مستقبل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے الگ رہ کر انگریزوں کا اعتماد حاصل کریں۔ اس طرح انگریزوں نے اپنی وفاداری کے معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رقابت پیدا کر دی۔

انگریز کی جانب سے رقابت کے بیج نے آخر کار وہی خاردار پودا پیدا کیا جس کی توقع تھی کانگرس کے ارکان رفتہ رفتہ متعصب ہندوؤں کے گروہوں کی شکل اختیار کر گئے۔ ان دریدہ دہن اور بدنیت ہندوؤں کی کثرت تعداد نے مسلمانوں کے لئے کانگرس کے دروازے کسی حد تک بند ہی کر دیئے مشہور کانگرسی لیڈر "بال گنگا دھر تلک" آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی، لالہ جپت رائے اور بی سی پال ان متعصب ترین کانگرسیوں میں شمار ہوتے تھے جنہوں نے اپنی شخصیت سے سوائے مسلم دشمنی کے اور کوئی کام نہیں لیا۔ ان لوگوں کے بد عزائم کو دیکھ کر سرسید احمد خان نے احتیاط برتتے ہوئے مسلمانوں کو سیاست سے وقتی طور پر الگ تھلگ رہنے کی تلقین کی۔

Marfat.com

مستقبل میں پیش آنے والے لاتعداد تاریخی واقعات نے ثابت کر دیا کہ کانگرس مخلوط سیاسی جماعت نہیں تھی بلکہ یہ ہندو قوم کی ایک اہم سیاسی جماعت تھی جس کا مقصد سب سے پہلے مسلمانوں کو ہر طرح کمزور کرنا اور ملک میں سیاسی آزادی حاصل کرنا تھا۔ ایسی آزادی جس میں نہ تو کوئی انگریز کا عمل دخل رہے اور نہ ہی کسی مسلمان کا۔ دیانند سرسوتی نے کانگرس کے ایک جلسے میں برملا اعلان کیا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے اور ہم مسلمانوں کو ایک غیر ملکی قوم گردانتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ اب یہ انہی ملکوں کو لوٹ جائیں جہاں کہیں یہ ہندوستان میں آئے تھے۔

انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل سے مسلمانوں کا ردعمل:

انڈین نیشنل کانگرس کا بظاہر قیام ایک ایسی جماعت کا وجود پذیر ہونا تھا۔ جو ملک کے تمام مکاتب فکر و مذاہب کے افراد کی مشترکہ نوعیت کی جماعت تھی اور جس کا ایک مشترکہ نصب العین اور لائحہ عمل ہو۔ لیکن واقعات و حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ جماعت صرف ہندوؤں کی ایک موثر سیاسی جماعت ہے جس کو انگریزوں کی واضح حمایت حاصل ہے اس طرح یہ جماعت ایک ایسے فریق کے کنٹرول میں تھی۔ جو پہلے ہی مسلمانوں کا ازلی دشمن تھا۔

ان حالات کو دیکھ کر سرسید احمد خان نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کو اس قسم کی جماعت میں شامل ہونے سے بہتر تو یہ ہے کہ اس کی رکنیت ہی حاصل نہ کی جائے۔ اور سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی جائے تاکہ مسلمانوں کے بچے آسانی سے تعلیم حاصل کر سکیں۔

اس کانگرس کی تشکیل ہی نے برصغیر ہندوستان میں دو قومی نظریے کو ہوا دی۔ اور عوام میں احساس پیدا ہوا کہ ہندو بحیثیت محکوم تو بہت تابعدار رعایا کی حیثیت سے رہ سکتے تھے۔ لیکن سیاسی برتری حاصل ہونے کے بعد اور انگریز سے قادرہ مل جانے کے بعد وہ مسلمانوں کے ایسے دشمن بن گئے جن کو وہ ایک پل بھر کے لئے بھی ہندوستان میں نہ دیکھنا چاہتے تھے جس کا صاف اور واضح نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان من حیث الجماعت ایک نئی سیاسی جماعت تشکیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سیاسی جماعت نے نہایت مردانہ وار کانگرس جیسی بوقلمون جماعت سے سیاسی مقابلہ کیا۔ اور آخر کار اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئی۔

Marfat.com

تحریک علیگڑھ

سوال: علی گڑھ کی تحریک کن حالات میں ابھری۔ اور اس نے کون کون سے ارتقائی مدارج طے کیئے۔ اور یہ کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔

پس منظر: تحریک علیگڑھ دراصل سرسید احمد خان کی ان مسلسل اور بے لوث خدمات کا نام ہے۔ جن کے لئے موصوف نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی جب وقت ہندوستان میں جنگ آزادی ہوئی اس وقت سرسید احمد خان کی عمر صرف اکتالیس سال کی تھی اور اس جنگ آزادی کے بعد سرسید مزید چالیس سال تک زندہ رہے۔ حقیقت میں ابتدائی چالیس سال تو عالم تحیر میں گزرے اور یہ وہ زمانہ ہے۔ جب ادھ تو کیا پورے ہندوستان پر انگریزی تسلط غالب آتا جاتا رہا تھا اور ۱۸۵۷ء میں تو انگریز کو اپنے پنجے زیادہ گہرائی سے گاڑنے کے مواقع مل گئے۔ بقول فرنگی بھارت فرد ہو چکی تھی۔ غدر کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ اب انگریز اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان عناصر (حریت پسندوں) کی تلاش میں سرگرداں تھا، جس نے اس غوغے کو ہوا دی، اور جو اس کی شدت کا باعث بنے، ہندو اپنی پوری مکاری سے انگریز کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ کہ یہ سارا ہنگامہ مسلمانوں نے کرایا تھا۔ اور مسلمان ہی اس کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی قوت گم کردہ کی بازیابی کے لئے یہ شور برپا کیا تھا۔ اور اپنی شازش کو کامیاب بنانے کے لئے "غریب" ہندو کو اپنے ساتھ ملوث کر لیا تھا اسے بدقسمتی کہہ لیجیے یا خودداری، مسلمانوں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا، جو اپنے نقطۂ نظر لوگوں کے علاوہ انگریز کو بھی اس انداز سے سمجھاتا جس سے مثبت انداز کی قوت فکری کو تحرک ہوتا ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کو بے بس و بے پر کرنے کے لئے انگریز نے سب سے پہلے ان لوگوں سے جائیدادیں چھین لی، پھر ان کی نگرانی میں مختلف جاگیروں کو غصب کیا۔ اور آخر میں اوقاف کی زمین اور اس سے ملحقہ تمام رقبہ بحق سرکار ضبط کر لیا۔

Marfat.com

جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسلمانوں کو انگریز کی سیاست کی سب سے زیادہ مار پڑی، ایک اندازے کے مطابق بنگال میں تقریباً ایک چوتھائی زمین تعلیمی اوقاف سے متعلق تھی۔ جس سے ہزاروں مسلمان علماء و فضلاء پلتے تھے، سینکڑوں مدرسوں کو مالی امداد مل جاتی تھی۔ اور اسلامی تعلیم کا بول بالا تھا ۱۸۶۸ء میں انگریز نے ایک قانون کے تحت ان اوقاف کی تمام جاگیروں کو ضبط کر لیا اور انہیں مختلف زمروں میں تقسیم کر دیا ان زمروں میں مشنری کے اخراجات، ہندو کی حوصلہ افزائی اور دیگر مسلم کش ہیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انگریز نے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے متعدد مسلم سیاسی رہنماؤں کو عمر قید کر کے جزائر انڈیمان بھیج دیا۔ انگریز کی زد میں سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جن کا زیادہ تر تعلق بہار اور اڑیسہ سے تھا۔ کیونکہ ان علاقوں میں انگریز کو نہ صرف مسلمانوں کی قوت کا احساس ہوا تھا۔ بلکہ ان کی طرف سے زبردست مزاحمت بھی ہوئی تھی انگریز نے ان علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو بے حد بے رحمی سے ظلم کا نشانہ بنایا، مسلمان کاشتکاروں پر لاتعداد اور ناقابل برداشت ٹیکس نافذ کر دیئے۔ ان ٹیکسوں کے نفاذ سے انگریز کا مقصد ان لوگوں کو اقتصادی طور پر بدحال کرنا تھا۔ اور انہیں زیادہ سے زیادہ پس ماندگی کے گہرے کنوئیں میں دھکیلنا تھا۔

مسلمان انگریز کی بدنیتی کو بخوبی سمجھتے تھے، لیکن قوت کے فقدان اور عدم رسائی کی بنا پر وہ کوئی ہاتھ پیر نہ مار سکتے تھے، انگریز کے سامنے جب بھی کوئی مسلمان آتا، تو انگریز کے ذہن میں مسلمان ایک غاصب حق اور باغی اوّل کی حیثیت سے آتا، مسلمان کو پس ماندہ کرنے کے لئے تجاویز بھی ہندو نے انگریز کو پیش کیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ پورا پورا اتفاق کرتے ہوئے۔ اور انہیں اپنی مسلم رعایا کے ہی ہم پلہ گردانتے ہوئے انہیں اس قدر زیادہ مراعات و حقوق سے نوازا ہوا تھا۔ جس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، متعدد سرکاری محکموں میں ان کا پورا کنٹرول تھا اور بہت سی سرکاری پالیسیاں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ بالخصوص مالیات کا محکمہ تو مغلوں نے ہندوؤں کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اور اس سلسلے میں یہ مغل بادشاہ ہندوؤں کے مشوروں کو ضرور زیر غور لاتے تھے۔ مالیات کا محکمہ ایک ایسا ادارہ ہے، جس میں ہر متعلقہ فرد کو لازماً کچھ نہ کچھ علم کا علمبردار ہونا پڑتا ہے۔ تعلیمی و اقتصادی و معاشرتی حیثیت سے متعدد و دیگر افراد کی نسبت زیادہ بہتر نوعیت و کا حامل ہوتا ہے اس کے علاوہ مغلوں نے ان لوگوں سے اس قدر حوصلہ افزائی کی ہوئی تھی۔ کہ

Marfat.com

پولیس، فوج اور عدلیہ میں بھی ان کو بہت عمل دخل تھا، اس طرح زندگی کو زیادہ اہم اور انتظامی حلقوں میں ان لوگوں کو مغلوں نے خود ہی مشتاق بنا دیا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے زوال پذیر ہوتے ہی ان لوگوں نے اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی لاتناہی کوششیں شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز کے برسراقتدار آتے ہی ان لوگوں نے خود کفالت محسوس کرلی، اور جو حلقہ ہائے حیات میں کچھ پڑھا تھا۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز کی پوری جدوجہد سے مدد کی۔

مسلمان ان دنوں میں ذہنی طور پر آزاد تھا ہی، لیکن فکر معاش نے اس کی تمام تر صلاحیتوں کو سلب کرلیا تھا۔ اس کی ذہن کی روشنی حالات کی تاریکی میں ڈوب کر رہ گئی، اس کا تمام تر عزم و ولولہ مایوسی کے گڑھے میں جا گرا، اس کی پوری کی پوری انتظامی صلاحیت حالات کی بد انتظامی کا شکار ہوگئی تھی اور یہ حالات انگریز کے ہی بنائے ہوئے تھے۔ اور اس کے لئے وہ باقاعدہ سازش کے تحت چل رہا تھا، اقتصادی، ذہنی اور تعلیمی طور پر بیدار مسلمان لیکن حالات سے بیزار بچارہ اپنی ہی دلسوزی کے اور کیا کر سکتا تھا، تاہم اس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اس وقت کی تلاش میں سرگرداں ہوا، جب اس کے روز حیات میں کسی آفتاب کے طلوع ہونے کی کرن نظر آنے لگے۔ مسلمان نے تاریخی طور پر جو زیادہ مار کھائی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی، کہ اسکی لیڈرشپ میں فقدان تھا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی ترجمانی کرنے کے لئے اور انگریزوں کو گمراہ کرنے کیلئے بہت سے ہندو دست بستہ انگریز کے حضور میں ایستادہ رہنے کو تیار تھے۔

تحریک علی گڑھ: اس صورت حال کو سرسید احمد خان نے بڑی شدت سے محسوس کیا سرسید نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء زندگی کے اس حصے میں بنظر خود دیکھا جب انسان عقلی اور ذہنی طور پر پختگی کے دائرے میں داخل ہوگیا ہوتا ہے۔ حساس طبیعت ہونے کے سبب سرسید نے فیصلہ کیا۔ کہ مسلمانوں کی گرتی ہوئی ساکھ کو حوصلے کی بیراگن دیکر کھڑا کرنا چاہیئے اور اس میں سیاسی طور پر چلنے پھرنے اور اپنے دشمن کا موثر مقابلہ کرنے کی پھر سے ہمت پیدا ہونی چاہیئے،

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سرسید نے قوم کو مختلف زاویوں سے تیار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور اسی طرح ہندو کے تعصب کے زور کو توڑنے کے لئے مدلل تقریریں شروع کر دیں انگریز کو گمراہی کے گڑھے سے نکالنے کے لئے ادبی، معاشرتی، اقتصادی اور علمی زاویوں سے جدوجہد

Marfat.com

شروع کردی اور ان کوششوں کے ذریعے انھوں نے انگریز کو اس امر کا احساس کامیابی سے دلا دیا۔ کہ "عذر" کی تمام تر ذمہ داری صرف مسلمان کے سر ہی نہیں تھوپی جا سکتی۔ اس میں ہندو بھی برابر کا شریک تھا، سرسید نے اپنی ایک تصنیف "اسباب بغاوت ہند" تحریر کر کے ثابت کر دیا۔ کہ ہندو نے بھی انگریز کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا۔ جو مسلمانوں نے، ہندو کے بھی وہی جذبات تھے جو مسلمان کے، اور ہندو بھی انگریز کا اتنا ہی مخالف تھا۔ جس قدر مسلمان، اس لئے ہندو اور مسلمان میں امتیاز روا رکھنا نہ صرف سراسر بے انصافی ہے۔ بلکہ اعتماد رعایا کو خاک میں ملا دینے کے مترادف ہے اور یہی وجہ تھی۔ کہ ابتداء میں انگریز اپنا کنٹرول قائم نہ کر سکا، کامیاب حکومت چلانے کے لئے ازبس ضروری ہے کہ عوام کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے، عوام کی جانب سے اعتماد کا ہونا کامیاب حکومت کی دلیل ہے اور فلسفہ تاریخ سیاست بھی اس امر کا متقاضی ہے کہ حکومت کی تشکیل عوام کے حقوق کے تحفظ کے لئے کی جاتی ہے۔ اگر کسی حکومت میں عوام کے حقوق محفوظ رہنے کی بجائے غارت ہونا شروع ہو جائیں اور عوام کو جان و مال اور روایتی اقدار کی بربادی درپیش ہو۔ تو اس وقت عوام کو حق پہنچتا ہے کہ وہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور اس حکومت کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں جب تک وہ جائز حقوق و مراعات کی داعی نہ بنے، انگریز نے آتے ہی عوام پر اپنا کلچر اپنی زبان اور اپنی اقدار کو مسلط کرنے کی حاکمانہ کوشش کی جس سے عوام میں بددلی پیدا ہوئی۔ حالانکہ اگر وہ ذرا صبر سے کام لیتا۔ تو شاید عوام کے مزاج کو اپنی مرضی کے مطابق اس طرح ڈھال لیتا، جس طرح اس کو ضروری طور پر ڈھالنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس نے اپنے تحکم کو قدرے سرعت سے جانے کی کوشش کی اور کوئی حکم دیتے وقت یہ نہ دیکھا۔ کہ اس سے عوام کے جذبات کس حد تک مجروح ہوں گے، جس کا لازمی نتیجہ مایوسی تھا۔ عوام اس کی سختیوں سے تنگ آ کر بجنگ آ ئے تھے، بہرصورت سرسید نے انگریز کو نہایت مدلل انداز میں حقائق سے آگاہ کیا اور اس کے ذہن سے مسلمان کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کیا۔ یہ اہم کام کرنے کے بعد انھوں نے اپنی توجہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی جانب کلی طور پر لگا دیں اور انہیں نئے سرے سے معاشی، معاشرتی، تہذیبی، دینی اور سماجی لحاظ سے یکجا کرنا شروع کر دیا، مسلمانوں میں ایک بار پھر جذبہ حریت پیدا کر دیا، اور ان میں احساس آزادی کی دبی چنگاریوں کو پھر سے جگا دیا، سرسید کی مسلسل کوششوں سے دس بارہ سال کے بعد انگریزی مصلحت کا رخ پلٹ گیا، انگریز نے محسوس کیا، کہ ہندو ان پر تیزی سے چھا جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اپنے مکارانہ لیکن بظاہر عاجزانہ انداز میں وہ حکومت میں دخل حاصل کرنا چاہتا ہے۔

Marfat.com

جب سرسید نے انگریز کے رویے میں کچھ تبدیلی پائی تو اس نے اس لچک سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے بعض مفید اقدام کئے، اس نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو قریب تر کرنے کی کوشش کی اور ان تمام مشترک نظریات کو یکجا کیا، جن کی بنا پر انگریز مسلمانوں میں کچھ اپنا پن محسوس کرنے لگے مذہب ہر قوم کی طاقت بھی ہوتا ہے، اور کمزوری بھی، کبھی طاقت بن کر چھا جاتا ہے، کبھی کمزوری بن کر دوسرے کو چھا جانے کا موقع دے دیتا ہے، سرسید اس فلسفے سے بخوبی آگاہ تھا۔ چنانچہ اس نے بائبل کی تفسیر لکھ کر دونوں مذاہب کے ان پہلوؤں کو یکجا کیا، جن میں بنیادی طور پر یگانگت پائی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے "تبیین الکلام" لکھی اس بالکل نئی نوعیت کی کتاب کو ترتیب دینے کے لئے مسیحی صحائف کے متعلق تمام ممکن الحصول کتابیں فراہم کرلیں، چنانچہ مسیحی صحائف کی کثیر تعداد عبرانی زبان میں تھی، اس لئے انہوں نے عبرانی زبان خاص طور پر سیکھی اس کتاب کا اصل مقصد ادبی یا مذہبی نوعیت کی شہرت حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ حقیقت میں وہ سیاسی رابطے بحال کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، بدقسمتی سے ان کے ساتھیوں نے اس کتاب کو اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ اور نہ ہی ان کی کوشش کو چنداں سراہا، کیونکہ ناقدین کی آراء کے مطابق سرسید ایک ایسے راستے کی طرف جا نکلے تھے جس سے نہ تو وہ اپنی ماضی کی عظمت کو یاد رکھ سکتے تھے۔ نہ ہی ان کے دل میں اپنے مذہب کا احترام باقی رہتا تھا، شریعت محمدی کے تحت اس قسم کی کوششیں انسان کو فلاح کی بجائے نقصان کی طرف لے جاتی ہیں، یہ کتاب لکھ کر سرسید نے خود کو روشن خیال اور مسلمانوں کو آزاد خیال ثابت کرنے کی کوشش کی اس سے ان کا سیاسی مقصد حاصل تو ہوگیا، لیکن اکابرین اسلام کا یہ اندیشہ درست نکلا، کہ سرسید کے اس مطالعے سے ان کے گمراہ ہوجانے کا خطرہ ہے۔

ان باتوں سے بہرصورت سرسید کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمانوں میں ایک ایسی تحریک پیدا کی جائے جس سے یہ لوگ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے میں ایسے خطوط حاصل کرسکیں۔ جن پر چل کر وہ منزل تک آسانی سے پہنچ جائیں، وہ مسلمانوں کے لئے سب سے پہلے ایک نہج مقرر کرنا چاہتے تھے۔ جو انہیں آزادی کی طرف لے جاتی، اس تحریک کو انہوں نے علی گڑھ سے شروع کیا، اور علی گڑھ ہی میں اس کو پروان چڑھایا۔ اس لئے اس تحریک کو تحریک علی گڑھ کا نام دیا گیا، ذیل کی سطور میں ہم تحریک علی گڑھ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں گے، جن سے ظاہر ہوگا، کہ سرسید نے وہ کون سے انداز

Marfat.com

اختیار کئے۔ جن کے ذریعے انہوں نے انگریزوں کی نظر میں مسلمانوں کے وقار کو ایک بار پھر بلند کیا۔

تعلیمی پہلو: تحریک علی گڑھ کے سلسلے میں تعلیمی پہلو سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے سرسید کو پتہ چل گیا تھا۔ کہ مسلمانوں کی پس ماندگی کا باعث انگریزی تعلیم کا فقدان ہے ہندو نے بلا تامل انگریزی تعلیم کو اپنایا، اور بہت جلد سرکاری ملازمتوں میں شامل ہو کر وہ تمام وہ تمام مراعات حاصل کرلیں، جو مسلمانوں کے زمانے میں انہیں اکثر آسامیوں میں حاصل تھیں، تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے دو اہم کام یہ کئے۔ کہ ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں فارسی کا ایک مدرسہ جاری کیا۔ اور پھر پانچ سال بعد یعنی ۱۸۶۴ء میں غازی پور کے مقام پر ایک انگریزی مدرسے کی بنیاد رکھی، غازی پور والے انگریزی مدرسے کے قیام سے پیشتر ۱۸۶۳ء میں سرسید نے ایک جدید سائنٹیفک سوسائٹی کا افتتاح کیا، اس سوسائٹی کا مقصد مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا، اور مسلمان کو اس کے حصول کی ترغیب دینا تھا، اس سوسائٹی کو زیادہ باوقار بنانے کے لئے سرسید نے بڑے بڑے انگریزوں کو اس کی سرپرستی کے لئے منتخب کیا۔ چنانچہ وزیر ہند مسٹر ڈیوک آف آرگائل کو اس کا سرپرست اعلیٰ چنا گیا۔ جس نے اپنے ساتھ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب اور ممالک شمال مغربی کو بھی بحیثیت سرپرست ملالیا، اس سوسائٹی نے ایک دو سال غازی پور میں کام کیا۔ لیکن جونہی سرسید احمد خان علی گڑھ منتقل ہوتے، اس وقت انہوں نے اس سوسائٹی کو بھی اپنے ہمراہ علی گڑھ لے جانا مناسب ترین جانا، چنانچہ علی گڑھ میں اس سوسائٹی کو چار چاند لگے، اس سوسائٹی کے تحت سرسید نے اپنی علمی سرگرمیوں کو نہایت عاقلانہ انداز میں جاری رکھا، اس سوسائٹی کے زیر اہتمام مختلف اوقات پر سائنسی اور علمی سرگرمیوں کو پر مذاکرے کرائے گئے، انگریزی اور اردو میں کئی ایک کتابیں شائع کرائی گئیں۔ ایک اخبار بھی جاری کرایا، جس کو بیک وقت دو زبانوں میں شائع کیا۔ یعنی ایک ہی روز میں اور ایک ہی اخبار میں ایک کالم اردو میں اور ایک انگریزی میں ہوتا تھا، جس سے انگریز اور مسلمان کی باہمی دوستی کی آئینہ داری کی گئی اس اخبار میں شائع ہونے والے اکثر و بیشتر مضامین معاشرتی اصلاح اور سیاسی حالات کے جائزے پر مبنی ہوتے تھے ۱۸۶۸ء میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں علی گڑھ سے تبدیل ہو کر جب بنارس چلے گئے، تو راجہ جے داس نے تمام کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا، راجہ جے داس کی شمولیت اس امر کی آئینہ دار تھی کہ سرسید نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے کبھی تعصب سے کام نہیں لیا۔ سرسید کی علمی کوششوں کا چرچا تو تقریباً تمام ہندوستان میں ہو چکا تھا۔ اور سرسید کی روز افزوں شہرت ہندوؤں کے لئے باعث تشویش تھی، ادھر سرسید علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس پہنچے

Marfat.com

ادھر بنارس والوں کو یہ فکر لاحق ہوئی، کہ شاید ان کی ہندی خطرے میں پڑ گئی، حفظ ماتقدم کے طور پر انہوں نے پہلے ہی سے ایک سکیم تیار کر لی جس کے تحت "اردو" کے خلاف ایک باقاعدہ تحریک شروع ہوگئی، کیونکہ منافق ہندو دیکھ رہا تھا، کہ مسلمانوں کا تعلیمی انداز تھوڑے عرصے میں مسلمانوں کو اس قدر بیدار کر گیا ہے۔ کہ وہ اب تعلیمی اعتبار سے تحفظ محسوس کرنے لگے ہیں اور کسی حد تک مطمئن ہیں۔ ہندو کو مسلمان کی تسکین ایک آنکھ بھی نہیں بھا سکتی۔ چنانچہ بنارس کے چند ایک شرانگیز افراد کی وساطت سے اُردو کے خلاف ایک تحریک چلا دی، جس نے اُردو کے بارے میں بہت زہر اگلا اس واقعہ سے پیشتر سرسید کا خیال تھا، کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہمی اشتراک کے ساتھ کسی خاص منزل تک بآسانی اور جلدی لے جا سکیں گے، لیکن ان کا یہ خیال بالکل مایوسی میں تبدیل ہوگیا، کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا، کہ ان کی زندگی صرف مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف ہے وہ خود اردو میں سارا کاروبار کریں گے، اور صرف مسلمان ہی کی تقویت کے لئے کوشاں رہیں گے۔ حالانکہ علی گڑھ کے قیام کے دوران سرسید نے ہندوؤں اور عیسائیوں کے اتحاد کے پیش نظر ایک انجمن برٹش "انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے تشکیل دی، لیکن اردو ہندی چپقلش کے بعد سرسید کو صاف پتہ چل گیا، کہ ہندو مسلمان کو زیر کرنے میں ہی خوش ہے، اور وہ مسلمان کی کسی ایسی جماعت کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا جس کی وساطت سے مسلمان سماجی اور عملی ترقی کر سکیں۔

سرسید یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان کے دورے پر نکلے اور تقریباً ڈیڑھ سال وہاں قیام کرنے کے بعد ہندوستان واپس لوٹے اس سفر نے سرسید کے خیالات کو مزید نہ صرف جلا بخشی بلکہ ان کے عزائم میں مزید پختگی اور خواہشات میں اور ترقی پیدا ہوگئی، انگلستان کے سفر نے انہیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ کیونکہ انگلستان میں وہ زمانہ اس کے عروج کا زمانہ تھا، اور لندن کا شہر دنیا بھر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور بارونق تھا، اس کے علاوہ وہاں کون سی ایسی چیز تھی، جو چاہے دنیا کے کسی بھی گوشے میں پائی جاتی ہو، وہاں موجود نہ ہو، غربت، کسالت اور نجالت کا وہاں نام تک نہ دیکھا، اس چیز نے سرسید کو اور زیادہ چونکا دیا، اکتوبر ۱۸۷۰ء میں جب وہ انگلستان سے واپس وطن پہنچے تو ترقی کی راہیں تیزی سے طے کرنے کے لئے ایک خاص کمیٹی تشکیل دی۔ جس کا نام "خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند" رکھا، اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا۔ کہ وہ معلوم کرے۔ کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے بنیادی اسباب کیا ہیں، اور ان

Marfat.com

کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے، بقول ہدایت اللہ چوہدری مصنف "تاریخ پاکستان و ہند" اس کمیٹی کی درخواست پر اس سلسلے میں مختلف موضوعات پر مقالے لکھے گئے، جن سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے گئے۔

۱۔ بیشتر مسلمان علماء انگریزی تعلیم کو اسلام کے منافی گردانتے ہیں۔

۲۔ مسلمان طلباء کی تعداد مدارس میں بہت کم ہے۔

۳۔ مسلمان نظام تعلیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس لئے بچوں کو گورنمنٹ سکولوں میں نہیں بھیجتے۔

۴۔ جدید مدارس میں عربی اور مذہبی تعلیم کا فقدان ہے، لا مذہبیت کے جذبات ابھارے جاتے ہیں۔

۵۔ انگریزی مدارس میں مسلمانوں کا عدم احترام۔

۶۔ حکومت ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے مسلمان افلاس میں مبتلا ہیں۔ اور متوازی تعلیمی ادارے کھولنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

۷۔ مشنری سکولوں اور کالجوں کے عزائم خطرناک ہیں۔

چنانچہ کمیٹی نے ان وجوہات کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ:۔

۱۔ مسلمان قوم خود ہی اپنے تعلیمی اخراجات برداشت کرے،

۲۔ مسلمانوں کو ترقی کرنے کے لئے لازم ہے۔ کہ وہ علوم جدیدہ کی ضرور تحصیل کریں۔

۳۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج کھولا جائے۔

کمیٹی کا جائزہ اور فیصلہ جب دوسرے اکابرین مسلمین نے دیکھا، تو اسے پسند کیا۔ اور نقص کم نکالے، مانا کہ یہ درست ہے، کہ جدید تعلیم کے حصول کے بغیر اب مسلمان نہ تو زندگی کی دوڑ میں ہمگام رہ سکتا ہے، اور نہ ہی سیاسی اعتبار سے اس کو کوئی منفعت حاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے ایک کالج قائم کیا جائے، اس کا نام "محمڈن کالج" رکھا جائے اس کالج کے لئے جن مبلغات کی ضرورت پڑے وہ ایک فنڈ کے قیام سے پوری کی جائے، چنانچہ سرسید کی ہمت سے ہی محمڈن کالج فنڈ کمیٹی کا قیام ہوا، حکومت ہند کو جب اس کمیٹی کی تشکیل کی اطلاع ملی تو یہ خبر ان کے لئے خوشی کا باعث ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان کے "وائسرائے لارڈ" "نارتھ بروک" نے اس وقت اس کالج کے قیام کے فنڈ

Marfat.com

میں اپنی جیب سے دس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا، ان کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے انگریز افسروں نے بھی وافر مالی امداد دینے کا وعدہ کیا۔ جو بعد میں ایفا بھی کیا گیا۔

محمڈن کالج کے قیام کے لئے اگرچہ چندہ بڑی تیزی سے جمع ہو رہا تھا۔ لیکن سرسید چاہتے تھے کہ ان کی تعلیمی سرگرمیاں جلد از جلد آغاز پذیر ہوں، چنانچہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو انھوں نے ایک ہائی سکول کا باقاعدہ افتتاح سر ولیم میور کے ہاتھ سے کرایا۔ اس کے بعد ملک کے گوشے گوشے میں سے محمڈن کالج کے لئے عطیات اور چندہ آنا شروع ہو گیا، چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں اس کالج کا افتتاح ہوا، اس کالج کا قیام سرسید احمد خان کی بے لوث حب الوطنی اور حب ملّی کا سب سے بڑا ثبوت ہے، چنانچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی تعلیم کی بنیاد ڈال گئے۔ جس کو حاصل کر کے مولانا محمد علی جوہر جیسی عظیم شخصیتیں وجود میں آئیں، اس کالج کو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نام دے کر نہ صرف وقار کے لحاظ سے بلکہ عظمت و احترام کے لحاظ سے ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں نامور بنا دیا۔

۱۸۸۶ء میں جبکہ انڈین نیشنل کانگریس کو تشکیل پذیر ہوئے ایک سال ہوا تھا۔ سرسید نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی، یہ ایجوکیشنل کانفرنس علمی و ادبی اعتبار کے لحاظ کے علاوہ پروپیگنڈہ کے لحاظ سے بہت زیادہ مفید و موثر ثابت ہوتی، اس کانفرنس نے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوتے اور بیٹھے ہوتے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا موقع دیا، جب کبھی اس کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے ملک کے دور دراز حصوں سے بڑے بڑے ادیب اور مفکر حضرات اس میں حصہ لینے کے لئے آتے اور اپنا کلام سناتے، ان عظیم شخصیتوں میں شبلی نعمانی الطاف حسین حالی، مولانا نذیر احمد، نواب محسن الملک اور خواجہ غلام الثقلین قابل ذکر ہیں۔

معاشرتی پہلو: ہر معاشرے کی ترقی اور قدر اس میں اپنے ہی لوگوں کی نفاست پر مبنی ہے، مسلمان اگرچہ تمدن کے لحاظ سے پاکیزہ ترین اور اخلاقی بلندیوں کی مالک قوم ہے، لیکن مفلسی اور بدحالی انسان سے بعض اوقات قیمتی سے قیمتی سرمایہ بھی چھین لیتی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا۔ کہ سرمائے کا زیاں کرنے والا شخص بذات خود ناقص ہے یا اس کی نسل دقومیت میں گراوٹ پائی جاتی ہے بلکہ وہ وقتی طور پر حالات کے شکنجوں میں جکڑے رہنے کی وجہ سے اس کیفیت سے دوچار ہے جو ایک بلند مرتبت شخص میں نہیں ہونی چاہیئے۔ سرسید نے جب بنظر غور دیکھا تو ملت اسلامیہ بالخصوص اسی بدحالی و مفلسی کا بُری

Marfat.com

طرح شکار تھی۔ سرسید نے علمی وادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اجتماعات کا انعقاد شروع کر دیا جس سے مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلے پھر سے بندھ گئے۔ اور مسلمانوں کو یہ احساس ہو گیا کہ ابھی ان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت باقی ہے۔ یہ سکت اس وقت قوت میں بدلی جب مسلمانوں کو سرسید نے ہندوؤں سے علیحدہ معاشرتی وقار سے روشناس کرایا اور جدید ترین تقاضوں سے نبٹنے کے لئے انہیں سائنس کی دنیا سے آگاہ کیا۔ انگریز کی حمایت جیت کر اس کے پہلو میں بیٹھ کر وار کرنے والے ہندو کی اس سازش کو جلد ہی بے نقاب کر دیا گیا۔ جس کے تحت یہ بدطینت قوم منہ سے انکساری کی انتہا کرتی ہوئی قریب ترین پہنچ کر کاری وار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

مذہبی پہلو: سرسید احمد کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں اس قدر آزاد خیال یا روشن خیال ہو گئے تھے کہ وہ اسلام کی مذہبی ماہیت کو فراموش کر گئے تھے ان کے بارے میں یہ خیال اگرچہ غلط بھی نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک قیاس کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے عقائد پر مندرجہ ذیل باتوں نے بہت زیادہ اثر کیا حالانکہ بنیادی طور پر اور خاندانی طور پر وہ ایک سچے مسلمان تھے اور اسلام کے پرستار اور مبلغ تھے جہاں تک ان کے رفقاء بالخصوص الطاف حسین حالی، محسن الملک، نذیر احمد کا تعلق ہے۔ ان کے نظریاتی اختلاف کی بنا وہ کٹر پن تھا جو قدیم الفکر اصحاب میں پایا ہی جاتا ہے۔ سرسید کا اصل مقصد قوم کو ڈھارس دینا تھا اور اس کے لئے انہیں ہر قسم کا لٹریچر پڑھنا ہوا۔ جب مغربی ادب پر سے ان کی نظر گزری تو ان کے عقائد ایمان بالغیب کی نسبت فطرت کی طرف زیادہ راغب ہوئے جس کی وضاحت انہوں نے اپنے مختلف لیکچروں اور تقریروں میں کی۔ تاہم مذہب کے لحاظ سے وہ کسی مسلمان کو عقیدہ تبدیل کرنے کی تلقین نہ کرتے تھے ایک لمحہ کے لئے اگر سوچ لیا جائے کہ انہوں نے اسلام کو من وعن تسلیم کرنے سے گریز کیا اور اس میں مختلف بدعات کے بارے میں ایک زبردست یورش کی، تو اس سے اسلام تو خطرے میں نہیں پڑتا تھا۔ وہ اگر معجزات کو نہیں مانتے تھے یا مافوق الفطرت باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے، تو یہ کوئی بنیادی قسم کا اختلاف نہیں بلکہ سطحی نوعیت کا ہے۔ سرسید نے اپنے مذہب کی ٹکر دو غیر مسلم قوموں سے لی تھی اور وہ نہایت خیر سگالی کے جذبات سے سرشار ہو کر دوسری قوموں کے نمائندوں سے بات کرنا چاہتے تھے۔ غیر مسلم کو اپنی صرف وہ خوبیاں بیان کی گئیں جن کے بارے میں مادی امثال بھی موجود تھیں۔

Marfat.com

سرسید کا خیال تھا کہ مذہب کے نام پر کسی بھی چیز پر کورا ایمان لے آنا کوئی بڑی صفت نہیں دل کی تسکین اشد ضروری ہے، چنانچہ ان کے خیال کے مطابق مختلف قدیم روایتی رسوم سوائے زیاں اوقات اور کچھ بھی نہیں ان کے خیال میں یہ نذریں، نیازیں، منتیں، پیر پرستی، عرس، قبر پرستی اور اسی قسم کے دوسرے اوہام سوائے خود فریبی کے اور کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے اور قوم کی تعمیر میں چنداں ممد ثابت نہیں ہو سکتے، سرسید کے دور میں ہر ایسے قدم کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی، جس سے کوئی تعمیری فائدہ ہو۔ نہ کہ صرف روحانی روحانیت کی قدر سید صاحب کے خیال میں تبھی ہے، جب سماجی قدر پیدا ہوگی، فطرت کے قانون کو نہ ماننا بھی ایک زبردستی ہے، اس لئے وقت کے تقاضوں کو پیدا کرنے کے لئے اور فضولیات سے بچنے کے لئے ازبس ضروری ہے کہ مذہب کے معاملات میں صرف اس حد تک الجھا جائے، جس سے ایمان کی تکفیر نہ ہونے پائے، فرائض مسلمہ کی ادائیگی اور فرائض منصبی کی شناسائی ہر اہل ایمان کی صفت ہے۔

سرسید نے انگریز کی حقیقت کو جاننے کے لئے تلقین کی، کہ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے کیونکہ انگریز کے بھید تو اردو زبان میں نہیں آ سکتے، اور نہ ہی وہ عربی و فارسی زبان میں کسی بھی نوعیت کی سائنس کی ترویج کر سکتا ہے۔

اگر دنیا کا رجحان سود پسندی ہے، تو اس کو کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے بلکہ ہر دم کوشش یہ ہونی چاہیئے، کہ ایمان کو اپنی سب سے قیمتی چیز جان کو محض دنیاوی باتوں میں آلودہ نہ کر دینا چاہیئے۔ انگریزی تعلیم کے حصول اور مغربی سائنسی علوم سے شناسائی کی تلقین بعض مسلم اکابرین کے لئے کفر کا مصداق بنی، حالانکہ ان حضرات کی سوچ میں فرق تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے نہایت بے باکی سے اپنے ضمیر کی ترجمانی کر دی لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس ترجمانی سے اسلام کے کسی بنیادی اصول کو تو نقصان نہیں پہنچا، اگر ان کی ترجمانی بے ضرر ثابت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں آسودگی کا باعث بنتی ہے تو اس پر کافر کہہ دینا زیادتی ہے۔ تاہم سرسید کا ایمان ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل پر ہر مسلمان کا فرض، اور اس میں ہر وہ بات آجاتی ہے، جس کا ذکر قرآن پاک میں ملتا ہے۔ سرسید احمد خان کی ضمیر کو قرآن پاک اور تعلیمات الہیّت نے روشن کیا، یہ سب کلام پاک کی برکت تھی، کہ ان کو معاشرے میں ایک ایسا مقام ملا۔ جو بڑے بڑے سیاسی

Marfat.com

لیڈر کو عمر صرف کر کے بھی نہیں ملتا، سرسید کے ایمان کی پختگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر کی سات جلدیں تحریر کی ہیں، بعض مسلمان بزرگوں کو اس تفسیر پر بھی بہت اعتراض ہے، تاہم سرسید کا نظریہ مذہب بھی ایک طرح سے تعمیری نوعیت کا ہے۔

سرسید احمد خان نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا تھا اور ان سب میں سے اچھے اچھے نکات سے متاثر ہو کر ایک مخصوص رائے قائم کر لی تھی، جن مذہبی اصلاحات کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ قدیم ذہن کے مالک کے لئے لازماً دخل فی الدین کے مترادف ہے۔ لیکن یہ بات بھی تو مدنظر رکھنا پڑتی ہے، کہ سرسید کی ترجمانی کا مقصد آخر کیا تھا۔ اس سلسلے میں شیخ محمد اکرام "موج کوثر" میں فرماتے ہیں کہ سرسید کی مذہبی تصنیفات کا مقصد مشنریوں کے مقابلے سے زیادہ ان اعتراضات کی تردید تھا۔ جو سر ولیم میور دیگر مغربی مصنف اور خود مشنری اسلام پر کیا کرتے تھے، دوسرے لفظوں میں سرسید کا براہ راست ذہنی مقابلہ تھا، عیسائیوں اور ہندوؤں سے اس مقابلے میں سرسید یقیناً سرخرو ہوتے ہیں۔

ادبی پہلو: تحریک علی گڑھ نے جدید اردو ادب کا آغاز کیا ہے۔ سرسید احمد نے قدیم طرز تحریر کو ترک کر کے ایک آسان طرز تحریر کو اپنایا۔ ترجمہ کے کام کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی۔ چنانچہ عمدہ انگریزی کتب کو اردو زبان میں ڈھالا گیا۔ ۱۸۶۳ء میں جس سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کا اہتمام ہفت روزہ اخبار کی اشاعت کے انتظام سے کیا گیا۔ یہ اخبار "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے ایک عرصہ دراز تک جاری رہا۔ یہ اس تحریک کا اثر تھا، کہ مولانا الطاف حسین حالی جو ایک قدامت پسند مشہور شاعر کے عزیز تھے نے شاعری کی قدیم فرسودگیوں اور نقائص گن کر علیحدہ علیحدہ بتا دیئے، جدید شاعری کے اصول مرتب کئے، اور انہیں اس انداز سے پیش کیا کہ شاعرانہ تنقید کی تاریخ میں ایسی تنقید کا مقابلہ نہیں۔

سیاسی پہلو: اس تحریک کا سب سے اہم پہلو سیاسی نوعیت کا ہے، سرسید کو انگریز سے نہ تو محبت تھی، اور نہ ہی وہ انگریزی کلچر کے دلدادہ تھے، وہ اگر فرنگی کی زبان اور ثقافت کی حمایت کرتے تھے، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز کے تمدن

Marfat.com

سے براہِ راست واقف ہو کر اور اس کی کمزوریوں سے آگاہ ہو کر ہی ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں، جب تک انگریز کی اصلیت ہمارے سامنے حقیقی انداز میں نہیں آتی اس وقت تک اس رنگین صورت والے گھس کر بیٹھنے کو ہند سے نکالنا آسان نہیں۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے دشمن کو نکالنے کے لئے لازم تھا کہ اس کے مضمرات کو تلاش کر لیا جائے۔ کیونکہ وہی مضمرات اس کی کمزوریوں کے مترادف ہوں گے۔ اس طرح سرسید انگریز کی حکومت کو ہندوستان سے ختم کرنے کے لیے یہ چاہتا تھا کہ ہمیں انگریز کی زبان و تہذیب سے مزین ہو کر ایک کاری حملہ کر دینا چاہیئے تاکہ انگریز ہمیشہ کے لئے اس ملک کو ترک کر کے چلا جائے اور ایک غیر ملکی آہنی پنجے سے نجات حاصل ہو جائے یا اپنی عزت و احترام کا تحفظ مکمل طور پر حاصل ہو جائے اس کے لئے سرسید نے مسلمانوں کے ایک ایک گھر میں جا کر عظمت اسلامیہ کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔

انگریز تو ہمارا دشمن تھا ہی اس سلسلے میں ہندو نے بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اس نے مسلمانوں کو پس پشت ڈالنے کے لئے خود انگریزی تعلیم کو اپنایا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ اس نے حکومت کے سامنے سر تسلیم اس لئے خم کیا تاکہ بہت جلد اس خم کو بلندی سے بدل دے ادھر مسلمان نے آٹھ دو نو سو سالہ حکومت کے بعد اس قدر پستی محسوس کی کہ اس کے تصور سے ہی ان کے کلیجے پگھلتے تھے۔ چہ جائیکہ ذاتی طور پر ان پر یہ کیفیات گزرے۔ ہندو نے خود کو انگریز سے بھی زیادہ خطرناک دشمن ثابت کیا۔ تحریک علی گڑھ میں اس احساس کو موثر انداز میں بھڑکایا گیا اور انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف تن دہی سے نبرد آزمائی شروع کی۔ انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اب اس امر کا یقین ہو گیا ہے کہ ہندو مسلمان سیاسی معاملات میں ایک دوسرے کے ہمرکاب نہیں ہو سکتے۔ سرسید کی نظر دور رس نے بھانپ لیا تھا کہ ایک وقت ایک آئے گا کہ جب ہندو حکومت سنبھالنے کے لئے کوشاں ہو گا۔ اس صورت میں مسلمان ہندو کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چند ہی سالوں بعد مسلمانوں نے واضح طور پر ہندو کی مخالفت میں سیاسی محاذ قائم کر لیا ۱۹۰۶ء میں انڈین نیشنل کانگرس جو بظاہر ہندوستانیوں کی جماعت تھی اور حقیقت میں ہندوؤں کی سیاسی جماعت تھی
کے مقابلہ میں ایک نئی سیاسی جماعت مسلم لیگ نے جنم لیا۔

سرسید احمد خان ۱۸۷۶ء میں سرکاری ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد ملک کی سیاست میں ایک رہنما کی حیثیت سے داخل ہوتے۔ ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی مجلس قانون ساز کے ممبر بنے

Marfat.com

اور نو سال تک مسلسل اس ممبر شپ پر فائز رہے۔ اسمبلی کی رکنیت کے دوران انہوں نے بار ہا اس امر پر زور دیا کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں اور مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے، اور اس سلسلے میں انہوں نے پر زور انداز میں بسا اوقات تقاریر بھی کیں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے اس موضوع پر لکچر دیتے ہوئے واضح الفاظ بیان کر دیا کہ "انتخابات کے ذریعے نمائندگی کے معنی یہ ہیں کہ آبادی کی کثرت کو اپنے مفادات کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ ایک ایسا ملک جس میں ذات پات کی تفریق نمایاں ہو۔ جہاں ابھی تک نسلیں ایک دوسرے میں مدغم نہ ہو چکی ہوں، جہاں جدید تعلیم سے آبادی کے سارے طبقات مساوی طور پر بہرہ مند نہ ہو چکے ہوں۔ وہاں سادہ جمہوری طریق انتخاب بہت سی برائیوں اور فتنوں کا موجب ثابت ہو گا۔ جب تک ہندوستان میں امتیاز مذہب و نسل اور ذات پات کی غیر معاشی و سیاسی نظام میں ایک جزو کی حیثیت ختم نہیں ہو جاتی جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اکثریت اقلیت کے معاشی اور معاشرتی اساس کو پامال کر دے گی۔ ان حالات میں جمہوری اقدام ان اختلافات کو ادر ہوا دے گا اور اس کے لئے عوام حکومت کو ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔ سر سید کی یہ تقریر ان کے سیاسی خیالات کی تمام تر ترجمانی کا موجب ہے اور اسی تقریر کی بنا پر تحریک علی گڑھ کو سیاسی نوعیت کی عظمت حاصل ہوئی۔

مندرجہ بالا سطور کے مطالعے کے بعد اس بات کا اندازہ نہایت آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو غدر کے بعد اگر کسی چیز نے کوئی ڈھارس دی تو وہ تحریک علی گڑھ تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ تحریک علی گڑھ نے ہندوستان کے مسلمان کو جو تنا و مایوسی کی وادی کی طرف تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ جو پسماندگی کے عمیق گڑھے میں گر چکے تھے جن کے حوصلے پست ہو چکے تھے ایک بار پھر اس قابل کر دیا کہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ اس تحریک کے دوران مسلمانان ہندوستان کو واضح طور پر پتہ چل گیا کہ ان کے خطہ زمین میں ایک کی بجائے دو دشمن قومیں سرگرم عمل ہیں۔ جن کے ساتھ مقابلے کی گرانقدر صلاحیت مسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک علی گڑھ مسلمانوں کے لئے تحریک احیاء سے کم تر نہیں تھی۔ اس تحریک کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کو نشاط ثانیہ نصیب ہوئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سر سید احمد خان کے مخالفین ان کی زندگی میں ان کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اس لئے کرتے رہے کہ وہ انگریز کی حمایت میں بات کرتے

Marfat.com

تھے وہ انگریز جنہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھین لی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرسید احمد خان جرأت سے کام لے کر اپنی قوم میں مغربی علوم کی ترویج نہ کرتے تو اس اسلامیہ پسماندگی کے گڑھے سے کبھی بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ سرسید کا انگریز سے تعاون محض قومی بہبود کی بنا پر تھا انہیں کوئی ذاتی منفعت نہ تھی۔ ان کا کردار اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ انہوں نے زندگی بھر جو قدم اٹھایا۔ اس میں بے لوث قومی محبت کے زبردست جذبات پائے جاتے ہیں جس طرح وہ تبلیغ احوال کے لئے جگہ جگہ پھرے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ انہوں نے مغربی تعلیم کے خلاف نہایت مدلل انداز میں اس تعصب کو دور کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی پھوٹ پڑ جانے کا اندیشہ تھا تاہم حالات نے بتا دیا کہ انگریزی تعلیم نے ہی پھر مسلمانوں کو جاہ و منصب حاصل کرنے کے قابل بنا دیا۔

چنانچہ سرسید کی ذات انیسویں صدی میں ہندوستان کی سرزمین پر ایک نعمت سے کم نہیں تھی اور تحریک علی گڑھ سیاسی و معاشی کامیابی کی دلیل ہونے کے کسی صورت بھی کم نہ تھی تحریک کامیاب ہوئی اور سرسید جاوداں ہوئے۔

Marfat.com

انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ئہ تا ۱۸۹۲ئہ

س : انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء و ۱۸۹۲ء کا جائزہ لیجئے کہ یہ ایکٹ کن حالات کی بنا پر بنے، اور ان کے مندرجات واثرات کیا تھے؟

ج : ہندوستان میں سیاسی زندگی کی عوامی سطح پر بحالی کی بنیادیں دراصل ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ہی قائم کر دی تھیں اور انگریز کو احساس ہو گیا تھا کہ اگر ہندوستان کے لوگوں کو کچھ حقوق ومراعات نہ دی گئیں تو یہ لوگ حکومت انگلشیہ کی کامیابی میں ہمیشہ رکاوٹ کا باعث بنتے رہیں گے۔

شروع شروع میں انتقامی طور پر اگرچہ انگریز نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ بے انتہا ظلم ظلم وستم روا رکھے اور جان بوجھ کر بے جا قسم کی تکالیف میں مبتلا رکھا۔ تاہم بعد میں آ کر اس نے آہستہ آہستہ عوامی زندگی کو جمہوری قدروں سے نوازنے کے لئے کچھ اقدام کئے۔

ان میں سے سب سے پہلا قدم انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل تھی۔ جس کی لارڈ ڈفرن نے فراخدلی سے ہندو کی حوصلہ افزائی کی، انڈین نیشنل کانگرس نے قدم جماتے ہی مطالبے شروع کئے کہ انہیں سیاسی زندگی میں حصہ لینے کی اجازت دے دی جائے۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے اس مطالبے کو نہایت عمیق نظروں سے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ ہندوستانیوں کو ایک محدود حد تک حکومت کے کاروبار میں شامل کر لیا جائے تا کہ انہیں یہ احساس ہو جائے کہ وہ انگریز کے محض ذاتی غلام بن کر نہیں رہ رہے اور ان کے دلوں میں بغاوت کے عناصر نہ پائیں چنانچہ

Marfat.com

۱۸۶۱ء میں ایک ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے مندرجہ ذیل اہم باتیں وقوع پذیر ہوئیں۔

۱۔ مدراس اور بمبئی کی حکومتوں کو قانون سازی کے اختیارات دوبارہ تفویض کر دیئے گئے۔ صوبائی سطح پر یہ اختیارات ۱۸۳۳ء میں واپس لے لئے گئے۔

۲۔ وائسرائے کی قانون ساز کونسل میں ارکان کی تعداد کم از کم چھ اور زیادہ سے زیادہ بارہ کر دی گئی۔ ان ارکان کو وائسرائے خود نامزد کرتا تھا اور وہ رکن وائسرائے کی خوشی کے مطابق کام کرتا تھا۔ تاہم زیادہ سے زیادہ عرصہ اس کی نامزدگی کا دو سال کے لئے مخصوص تھا۔

۳۔ وائسرائے کی قانون ساز کونسل میں نصف ارکان سرکاری عملے سے ہوتے تھے اور نصف غیر سرکاری عملے سے ہوتے تھے۔ اور نصف غیر سرکاری افراد ہوتے تھے۔

۴۔ وائسرائے کے قانون سازی کے اختیارات بہ اجلاس کونسل کا اطلاق تمام باشندگان ہند پر ہوتا تھا۔

۵۔ کونسل کے اختیارات صرف قانون سازی تک ہی محدود تھے۔ کونسل کا کوئی رکن نہ تو کوئی قرارداد پیش کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی مسودہ قانون پر انگریزی حکومت کے خلاف کوئی رائے زنی کر سکتا تھا۔

۶۔ ہنگامی حالات میں وائسرائے کو آرڈیننس جاری کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اس آرڈیننس کی زیادہ سے زیادہ عمر چھ ماہ تک کی ہوتی تھی۔ بعد ازاں اس آرڈیننس کو باقاعدہ قانونی شکل دینے کے لئے قانون ساز مجلس جو وائسرائے کے نامزد ارکان پر مشتمل ہوتی تھی، پیش کیا جاتا تھا بالعموم منظور کر ہی لیا جاتا تھا۔

۷۔ اس ایکٹ کی رو سے وائسرائے کے NON REGULATED صوبوں کے داخلے کے متعلق قوانین کو دوام بخشا۔ یہ قوانین اس ایکٹ کے پاس ہو جانے سے پہلے جاری ہو چکے تھے آئندہ کیلئے انکے بارے میں وائسرائے کے اختیارات کو قدرے محدود کر دیا گیا۔

۸۔ وائسرائے کی ایک انتظامی کونسل تشکیل پذیر ہوئی اور ملکی افواج کا سپہ سالار بھی ایک سے زائد رکن کی حیثیت سے کونسل کی کارروائیوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

۹۔ انتظامی کونسل کی صورت میں وائسرائے کو اختیار حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کسی وقت وائسرائے کی عدم موجودگی کی صورت میں ان اجلاس کی صدارت کے فرائض ادا کر سکے۔

Marfat.com

۱۰۔ وائسرائے کو اپنے زیر اختیار علاقوں میں مختلف صوبے بنانے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ اس طرح وہ جغرافیائی تبدیلیاں بھی کر سکتا تھا۔

۱۱۔ وائسرائے کو اختیار مل گیا کہ وہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بنگال جیسے صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی کثرت تھی کونسلیں قائم کر سکتا تھا۔

۱۲۔ ان کونسلوں کے ارکان کو انتظامی معاملات میں دخل دینے کی اجازت دینے کے لئے خاص خاص شعبوں کا نگران بھی مقرر کر سکتا تھا۔ اس طرح ان صوبوں کے سر برآوردہ افراد کو حکومت کے معاملات میں براہ راست مداخلت کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔

اس ایکٹ کے نفاذ سے اگرچہ باشندگان ہند کو وہ آزادی ہرگز نہ مل سکی جس کے وہ متمنی تھے۔ البتہ حصول آزادی کی طرف انگریز کو تھوڑا سا سرکا ہوا پایا۔ قانون سازی میں اگرچہ ارکان کونسل کو نکتہ چینی کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن کوئی بھی مسودہ قانون اس وقت تک پاس کئے جانے کے لئے پیش نہ کیا جاتا تھا جس کو پہلے سے ان ارکان کو دکھا نہیں دیا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں غیر قانونی توثیق ان لوگوں سے پہلے ہی سے کرائی جاتی تھی۔ اس موقعہ پر اگر کوئی رکن اس مسودہ قانون میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتا تھا اس کو زیر غور کر لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انتظامی معاملات میں ہندوستان کے باشندوں کو اتنی اجازت مل گئی تھی کہ وہ کوئی ایسا حکم صادر نہ ہونے دیں جس کا اطلاق اخلاقی وسماجی لحاظ سے ممکن نہ ہو۔

اس ایکٹ کی رو سے گورنمنٹ کے کاموں کی تقسیم ہو گئی۔ لیکن تقسیم سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے جو پہلے سے انگریز کی حمایت حاصل کر چکے تھے۔ ظاہر ہے اس قسم کی حمایت حاصل کرنے والے لوگوں میں ہندوؤں کی کثرت تھی لیکن اس ایکٹ کے پاس ہونے سے بس اتنا محسوس کیا گیا جیسے سکوت گرما توڑنے کے لئے فضا میں ذرا سی حرکت پیدا ہو۔ اس حرکت سے اگرچہ تمازت میں تو کمی واقع نہ ہوئی نہ ہی کوئی خوشگوار ماحول بننے کی صورت نکلی۔ تاہم ایک جمود کے ٹوٹ جانے کی خوشی ہوئی۔

انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء:

۱۸۹۲ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لینسڈاؤن تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اکتیس سال قبل جو انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء میں بنایا گیا تھا اس سے نہ تو ہندوستانیوں کی تشفی ہوئی

اور نہ ہی وہ چنداں مقصد کے حصول کا باعث ہے۔ علاوہ ازیں اکتیس سال عرصہ گزر جانے کے بعد برطانوی حکومت کے استحکام کے لئے موافق حالات کے کئی پشتے لگ چکے تھے۔ "باغی نسل" یا تو ختم ہو گئی تھی یا اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ ان میں آزادی کے حصول کی وہ چمک دمک باقی نہ رہی تھی۔ اس وقت ہندوستانی باشندے باقاعدہ تاج برطانیہ کے غلام بن چکے تھے اور انگریز کا تحکم مسلم ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ چنانچہ لینسڈاؤن کو اس امر کا احساس ہوا کہ انڈین نیشنل کانگرس کے اس مطالبے پر ہمدردانہ غور کر ہی لینا چاہیئے جس میں وہ کونسل میں نہ صرف وسعت کر سکیں اور ارکان کونسل کو محض زیبائشی طور پر استعمال نہ کیا جائے بلکہ ان لوگوں کو فعال ہونا چاہیئے اور وہ عوام کے نظریات و احساسات کی موثر انداز میں ترجمانی کر سکیں۔ اس ترجمانی کا مطلب صرف "سماع" ہی نہ ہو بلکہ اس کے بعض مثبت نتائج نکلنے چاہیں۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں ایک اور ایکٹ پاس ہوا جس کا نام انڈین کونسل ایکٹ مجریہ ۱۸۹۲ء رکھا گیا۔ اس ایکٹ کی رو سے مندرجہ ذیل اہم باتیں طے پائیں۔ جو باقاعدہ قانون کی صورت اختیار کر گئیں۔

۱۔ وائسرائے کی کونسل کے ارکان کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء کی رو سے اس کونسل کے ارکان کی تعداد زیادہ سے زیادہ بارہ تھی۔ اب یہ تعداد سولہ تک کر دی گئی۔

۲۔ بمبئی اور مدراس کی کونسلیں کم از کم (۸) اور زیادہ سے زیادہ بیس (۲۰) ارکان اور یوپی و بنگال کی پندرہ اور بیس ارکان پر بالترتیب مشتمل ہوں گی۔

۳۔ وائسرائے بہ اجلاس کونسل کو بااختیار بنا دیا کہ وہ وزیر برائے امور ہند حکومت برطانیہ کی منظوری سے زائد ارکان کونسل نامزد کرنے کے لئے قواعد و ضوابط بنا سکتا ہے۔

۴۔ قانون سازی کے دوران کونسل میں گذشتہ کونسل ایکٹ کے تحت کسی رکن کو مخالفت یا تنقید کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اور نہ ہی کوئی رکن اس قانون کے بارے میں کوئی سوال پوچھ سکتا تھا لیکن اس قانون میں نہ صرف قانون کے بارے میں سوال پوچھنے کی اجازت دے دی گئی۔ بلکہ اس پر بحث و تمحیص کی اجازت بھی دے دی۔

۵۔ قبل ازیں جو قانون ایک دفعہ وائسرائے اور ارکان مجلس قانون کی وساطت سے نافذ ہو جاتا اس کو منسوخ کرنے کا حق نہ تو ارکان کو ہوتا نہ ہی وائسرائے کو لیکن اس قانون میں مقامی کونسل قانون ساز وائسرائے کی پیشگی منظوری سے مرکزی مجلس قانون ساز کے

Marfat.com

بھی آئین کو جو ان کے خیال میں مقامی لوگوں کی بہتری کے لئے نہ ہو منسوخ کرنے کا حق مل گیا۔

۶۔ تمام ہندوستان میں انتخابات کا انعقاد کرنے کے انتظامات کر لئے گئے اور اس کے لئے مخصوص قواعد مرتب کرنے کی ہدایات جاری کی گئیں جن پر مثبت انداز میں عمل ہوا۔

۷۔ پنجاب میں بھی ایک کونسل قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ حالانکہ سابقہ انڈین کونسل ایکٹ میں اس قسم کی رعایت حاصل نہ تھی۔

انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء پر تبصرہ:

اگرچہ لارڈ ڈینسڈاؤن نے ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی کونسلوں کی رکنیت میں برطانوی پارلیمنٹ نے قانون کی وساطت سے مزید اضافہ کر دیا اور سرکاری وغیر سرکاری ارکان کو انتظامی معاملات میں حکومت کے بجٹ اور بجٹ پر تبصرہ کرنے کی اجازت دے دی لیکن یہ ان توقعات سے بہت کم تھا جو انڈین نیشنل کانگرس نے قائم کر رکھی تھیں۔ اس قانون کے ذریعے اگرچہ انتخابات کرانے کی اجازت دی گئی تھی لیکن بدقسمتی سے یہ انتخابات مخلوط نوعیت کے تھے۔ اس صورت حال میں ہندوستان میں آباد مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا کیونکہ تعداد کے لحاظ سے تو ہندوؤں ہی کی اکثریت تھی۔ دوسرے معنوں میں یہ کامیابی نہ صرف انڈین نیشنل کانگرس کی ہی تھی بلکہ ہندوستان کے ہندوؤں کی تھی۔ یہ درست ہے کہ انتخابات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو کسی بھی علاقے سے کسی بھی رکنیت کے لئے کھڑے ہونے کی اجازت تھی لیکن یہ واقعتاً مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں شکست دلانے کی پہلی سازش تھی۔

انہی دنوں ہندوستان میں مقابلہ کے امتحانات کے بارے میں کانگرس اس امر کا زور لگا رہی تھی کہ ہندو چونکہ انگریزی تعلیم کے حصول میں بہت زیادہ آگے ہیں۔ اس لئے انہیں اس جدید کاوش کا ثمرہ ملنا چاہیئے اور ہندوؤں کو بھی مقابلہ کے امتحانات میں شرکت کی اجازت دی جائے ادھر صورت حال کچھ اس قسم کی تھی کہ مقابلے میں بنگالی بھائیوں سے کوئی شخص بازی نہیں جیت سکتا تھا مسلمانوں کو اپنی اس کمزوری کا احساس ہو گیا تھا۔ سرسید نے اس سلسلے میں ذاتی کوششوں سے مسلمانوں کو اس حقیقت پر متفق کرایا کہ اب دور آچکا ہے جبکہ وہ لازماً انگریزی تعلیم حاصل کریں اور کم از کم ہندو کے مقابلے میں سینہ سپر ہوں۔ اس کے علاوہ جب تک مسلمانان ہند انگریزی تعلیم حاصل نہ کرتے اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تو کیا تمام

Marfat.com

باشندوں کے لئے ترقی کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ مسلمانوں کو شاید یہ بات سمجھ میں نہ آتی لیکن انگریزی پڑھنے والے ہندوؤں کی طرف انگریز کی مشفقانہ نظر دیکھی تو انہوں نے محسوس کیا کہ ہم کیوں ایک تعصب کی بناء پر ملکی و معاشی ترقی کی راہ میں حائل ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی سیاسی حقوق کے تحفظ کی خاطر سر سید احمد خان کی نگرانی میں ایک ایسوسی ایشن بنائی جس کا نام "ایم اے او ڈیفنس ایسوسی ایشن رکھا گیا۔

جب مسلمانوں نے اس قانون کا جائزہ لیا تو واضح ہو گیا کہ انگریز نے اس قانون کے اطلاق سے صریحاً ہندو کو خوش کیا ہے کیونکہ جہاں کہیں بھی مسلمان کے مقابلے میں ہندو کھڑا ہوا وہ قومیت کے لحاظ سے شکست کھا ہی نہیں سکتا تھا اور اگر بدقسمتی سے کوئی مسلمان ہندوؤں کے ووٹوں پر کامیاب بھی ہو جاتا تو وہ مسلمان نام کا تو ضرور مسلمان ہوگا۔ لیکن کفر کی امداد سے اسلام کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ اس نظریئے کے تحت سر سید احمد کے بیٹے سید محمود نے بڑی جرأت مندی سے کہا کہ مخلوط طریق انتخاب سے تمام طبقوں کو صحیح نمائندگی ہرگز نہیں مل سکتی۔ البتہ ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی مرضی سے کسی کو بھی منتخب کر سکتے تھے لیکن یہ بات اکثر نقصان دہ ثابت ہوئی۔ جمہوریت لازماً کثیر تعداد میں لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کا نام ہے۔ اس طریق سے معاشرے میں طبقاتی نمائندگی مفقود ہو جاتی ہے اور علاقائی خود مختاری کو زبردست ضرب لگتی ہے۔

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ بالخصوص متحدہ ہندوستان کے جغرافیہ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ یہاں متعدد نسلوں کے لوگ اور مختلف نظریات و احساسات کے افراد بستے ہیں اور ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اس ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد ہندو بہت خوش ہوئے کیونکہ اس کو احساس ہو گیا کہ انگریز نے ان کا مطمع نظر سمجھ لیا ہے اور وہ اب آئینی طور پر اقتدار میں ان لوگوں کو شامل کرنا چاہتا ہے۔ ادھر مسلمانوں کے اندر ایک تحریک پیدا ہوئی جس کے تحت مطالبہ کیا گیا کہ لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات کے لئے ہندو ہندوؤں کے اور مسلمان مسلمانوں کے حلقوں سے منتخب کئے جائیں۔ کیونکہ مذہبی نکتہ سے مسلمان ہندو سے بہت دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ خطرہ لاحق ہوا کہ یہ لوگ سیاسی میدان میں مخالفانہ رویے کے ساتھ ابھرنا شروع ہو گئے تو بہت سے علاقے میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جائیں گے اور ہندوؤں کا کبھی کوئی ووٹ مسلمانوں کے مفادات کی خاطر استعمال نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس مسلمان

Marfat.com

اپنی وسیع النظری کی بنا پر ہندو کو بھی ایسی مراعات دیئے جاتا رہا ہے جس سے نہ صرف مراعات دینے والے کو نقصان ہوا بلکہ ہندو کی ہی کوشش سے مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوا۔ چنانچہ مناسب گردانا گیا کہ مسلمانوں کو حلقوں کی بجائے مذہبی نکتہ نظر سے آبادی کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے اور مخلوط انتخابات کی جگہ براہِ راست انتخابات کا انعقاد کرایا جائے تاکہ ہر طبقے کے لوگوں کو بالکل صحیح اور متناسب نمائندگی مل سکے گی۔

یہ ایکٹ دراصل انگریز کی بخشی ہوئی مخصوص جمہوریت کی طرف پہلا قدم تھا۔ جس سے تمام تر فائدہ ہندو کو پہنچتا تھا اور مسلمانوں کو سراسر نقصان تھا۔ اس ایکٹ کے پاس کرانے میں زیادہ تر ہندوؤں کو ہی حکومت کے ساتھ عمل دخل حاصل تھا جس سے وہ انگریز کی رائے کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔

Marfat.com

تقسیم بنگال

وہ کون سے شواہد تھے۔ جن کے تحت بنگال کو تقسیم کیا گیا تھا اور کیا یہ تقسیم کا اقدام کسی حد تک درست بھی تھا یا نہیں ؟ تفصیل سے بیان کیجئے

اسباب : انگریز نے سیاسی رنگ میں سب سے پہلے بنگال میں قدم جماتے جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے انہوں نے ایک باقاعدہ حکومت شروع کی ۱۹۰۵ء تک انگریزوں نے پورے بنگال کو اپنے مکمل کنٹرول میں لے لیا ہوا تھا اور اس وقت بنگال بہت بڑا صوبہ تھا۔ اس صوبہ میں دراصل بہار، اڑلیسہ اور آسام بنگال کے ساتھ ہی شامل ہو کر ایک صوبہ بناتے تھے اور یہ وسعت اس صوبہ کو انگریز کی بتدریج افزائش یافتہ حکومت کی بدولت نصیب ہوئی تھی۔

۱۸۷۴ء میں آسام اور اس کے ساتھ تین اضلاع سلہٹ، کچھار اور گولپاڑہ جن کی زبان بنگلہ تھی کو علیحدہ کر کے ایک چیف کمشنری بنا دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود بنگال اتنا بڑا تھا کہ اس صوبے کا رقبہ ایک لاکھ نواسی ہزار مربع میل کے لگ بھگ تھا اور اس کی آبادی سات کروڑ سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی، اس گنجان آباد وسیع علاقے میں انتظامی نوعیت کے بہت سے مسائل پیدا ہوتے تھے اور مزید پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

انگریزی قواعد کے مطابق کسی بھی صوبے میں تعینات لیفٹیننٹ گورنر پانچ سال سے زیادہ عرصہ تک کسی صوبے میں تعینات نہیں رہ سکتا تھا۔ اس صورتحال میں اس طویل وعریض صوبے میں لیفٹیننٹ گورنر اپنے تمام زمانہ قیام کے دوران ڈھاکہ اور چاٹگام جیسے اہم شہروں کا دورہ صرف ایک ہی بار کر سکتا تھا۔ اس تمام علاقے میں مسلمانوں کو بھاری اکثریت حاصل تھی لیکن حکومت کی

Marfat.com

بد انتظامی اور سرکاری نظم و نسق کی کمزوری کی وجہ سے انتظام حکومت شدید بحران کا شکار ہو گیا تھا۔ جرائم کی تعداد تشویشناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ مشرقی بنگال کے شعبہ رفاہ عام کی مد میں جس قدر محصول وغیرہ جمع ہوتا تھا وہ سب کا سب کلکتے اور مغربی بنگال کے دوسرے حصوں کی ترقی پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

اس صورتحال میں ظاہر ہے کہ عوام میں سخت نوعیت کی بے چینی پھیلی۔ حکومت کو بھی اپنی سیاسی کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں ہندوستان میں متعین انگریز حکام نے خود ہی اس کو تقسیم کر دینے کی کئی تجاویز پیش کی گئیں۔ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن تھے۔ اس نے ان تجاویز پر بڑے تحمل سے غور کرنے کے وقت یہی مناسب سمجھا کہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ایک مشرقی بنگال دوسرا مغربی بنگال۔ اس سے نہ صرف جغرافیائی لحاظ سے اس صوبے کی بہت زیادہ وسعت میں کمی واقع ہو گی بلکہ انتظامی نکتۂ نظر سے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس تقسیم سے بنگال بہار۔ اڑلیسہ اور آسام کے مسلمانوں کو سیاسی نکتۂ نظر سے بہت فائدہ پہنچتا تھا کیونکہ نمائندگی کی صورت میں مسلمانوں کی پوزیشن مجموعی طور پر ہندوؤں کے مقابلہ میں کسی حد تک مضبوط ہو جاتی تھی۔ ہندو مسلمان کی کسی صورت میں کوئی افادیت دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا اور اس سے یہ کیسے برداشت ہوتا کہ مسلمان کو چند مخصوص علاقوں میں پھر وہ برتری حاصل ہو جس کو غیر شریفانہ ملی بھگت کے ذریعے اور انگریزوں کو گمراہ کر کے اس نے حاصل کیا ہوا تھا۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر لارڈ کرزن نے پورے صوبہ بنگال کا ایک تفصیلاتی نوعیت کا دورہ کیا، اور وہاں کے عوام کی خواہشات کا بھی بذات خود جائزہ لیا اس دورے کے دوران چند ایک ہندوؤں نے انڈین نیشنل کانگرس کے غیر مسلم ارکان کی ہدایت کے مطابق وائسرائے کے سامنے غوغا کرنے کا انتظام کیا اور وائسرائے کو اس تقسیم کے نظریئے کے خلاف بہت سے دلائل پیش کیے جن میں سے ایک دلیل یہ بھی تھی کہ انگریز حکومت نے اگر اس صوبے کو تقسیم کر دیا تو مسلمان بہت جلد اپنی سیاسی برتری کو بحال کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جو بعد ازاں ان کے احساس حکمرانی کو جلا بخشے گی جو نتیجتاً انگریز حکومت کے خلاف کسی نہ کسی شدید نوعیت کے معاندانہ اقدام کا باعث بنے گی اور بہت ممکن ہے کہ مسلمان عربی اونٹ کی مانند سیاست کے خیمے میں اس طرح داخل ہو کر آہستہ آہستہ وہ خیمے کے مالک (یعنی انگریز) کو ہی خیمے سے نکال باہر پھینکے۔ لارڈ

Marfat.com

کرزن نے اس قسم کی اور بھی بہت سی مخالفانہ تقریریں سنیں لیکن ان تمام تقریروں کا جواب اس نے خود ہی نہایت مدلّل انداز میں ہندوؤں کو دیا اور جگہ جگہ ہندوؤں کو حکومت کی اس نبت سے آگاہ کیا کہ وہ کسی ایک جماعت کی پرورش کے لئے جانبداری سے کام نہیں لے سکتی۔ حکومت کی نگاہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مقام اس لئے ایک دوسرے سے مخالفانہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندوستان کے باشندے ہونے کی صورت میں وہ سب لوگ ایک ہی جیسی حیثیت کے مالک ہیں اور ان سب کو یکساں حقوق و مراعات حاصل ہونی چاہئیں اور حکومت کے مقرر کردہ انداز و پیمانہ کے مطابق سب سے یکساں نوعیت کا سلوک روا رکھا جائے۔ لارڈ کرزن نے مزید کہا کہ حکومت کو جہاں عوام کی بہبود کا خیال ہے وہاں ملک میں امن و امان کی بحالی اور استقامت نظم و ضبط کا بھی شدید احساس ہے۔

تقسیم بنگال: بالآخر ستمبر ۱۹۰۵ء میں بہت زیادہ غور و خوض کے بعد اور ہندوؤں کی شدید مخالفت کے باوجود لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کی تجویز حکومت برطانیہ کی منظوری کے لئے ارسال کر دی۔ ایک ہی ماہ کے اندر اس تقسیم کی منظوری تاج برطانیہ سے وصول ہو گئی جس کا نفاذ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے کر دیا گیا۔

اس تقسیم کے ذریعے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا یعنی مشرقی بنگال اور مغربی بنگال۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی:

"تقسیم کی اس سکیم کے مطابق اضلاع ڈھاکہ۔ میمن سنگھ۔ فرید پور۔ نواکھلی چٹاگانگ۔ راج شاہی۔ دیناج پور جل پگڑی۔ رنگ پور۔ بوگرا۔ پبنہ اور مالدہ پر مشتمل نیا صوبہ بنا دیا گیا۔ اگرچہ یہ صوبائی تقسیم انتظامی بنیادوں پر عمل میں آئی تھی لیکن اتفاق سے مشرقی حصے میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو گئی وہ کل تین کروڑ دس لاکھ میں سے ایک کروڑ اسی لاکھ ٹھہرے اور ہندو ایک کروڑ بیس لاکھ رہ گئے جب کہ مغربی حصے میں ہندوؤں کی کل آبادی پانچ کروڑ بیس لاکھ میں سے چار کروڑ بیس لاکھ تھی اور مسلمان نوے لاکھ رہ گئے۔ باقی دوسری قوموں کے افراد تھے۔"

تقسیم ہند دراصل مسلمانوں کی سیاسی میدان میں سب سے پہلی فتح تھی۔ اس تقسیم کو مسلمانان بنگال نے نہایت احسن انداز میں سراہا اور اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ نواب سلیم اللہ بہادر نواب ڈھاکہ نے اس تقسیم کے نفاذ کے روز ہی نمشی گنج میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

Marfat.com

"اس تقسیم نے ہماری بے عملی رفع کر دی ہے اور ہمیں مسلسل جدوجہد کیطرف متوجہ کر دیا ہے۔"

حوصلہ افزائی کے اس اقدام سے مسلمانوں کو سیاسی میدان میں باقاعدہ عمل پیرا ہونے کا موقع مل گیا نواب صاحب مذکور نے اپنے دیگر رفقاء سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو بالکل اسی انداز میں سربلند کر کے چلنا سیکھنا چاہیئے جس کے وہ مسلمہ طور پر اہل ثابت ہو چکے ہیں اور تمام مسلمانوں کو ہندو کی سازشوں سے بہر صورت باخبر رہنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی تنظیم اور سیاسی و معاشرتی امور میں ان کی ترجمانی کیلئے ایک انجمن قائم کی جس کا نام "محمڈن پراونشل یونین" رکھا گیا۔

ردِ عمل: بنگال کی تقسیم ہندوؤں کو اس قدر ناگوار گزری جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہندو جو انگریز کو اپنا سب کچھ مانتا تھا اور جس کے سامنے وہ ہر دم آنکھیں بچھاتا تھا اور جس کے ہر مسلم کش اقدام کو عین تقاضائے انصاف قرار دیتا تھا اور ذاتی افادیت کے لئے اپنی اقدار کو بھینٹ چڑھا دینے میں گریز نہ کرتا تھا اب اس قدر مخالفانہ رویہ اختیار کر گیا کہ اس نے اس انگریز کے بارے میں کہنا شروع کر دیا کہ انگریز نے ایک نیا لیکن غلط اصول اپنا لیا ہے کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو"۔ ہندو نے انگریز کے اس اقدام کے خلاف نہ صرف زبانی نعرے بلند کئے بلکہ عملی طور پر اس کو ناکام بنانے کی مہم تیار کر لی۔ انڈین نیشنل کانگرس نے فیصلہ کیا کہ ملک گیر مظاہرے کئے جائیں، انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اور سودیسی چیزوں سے کام چلایا جائے۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ بنگال ہی میں تشدد آمیز اور دہشت ناک کارروائیوں پر اتر آئے اور بموں اور پستولوں کے استعمال کو روا رکھنے میں گریز نہ کیا۔ اس سے ملک بھر میں دو قسم کے نظریات اپنی پوری وضاحت سے سامنے آئے۔ ایک یہ کہ انگریز کو علم ہو گیا کہ ہندو صرف اپنی قوم کی خاطر مکاریاں بھی کر سکتا ہے اور فریب دے کر انصاف کا گلا بھی گھونٹ دینا چاہتا ہے ادھر مسلمانوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ انڈین نیشنل کانگرس جس کا قیام اس تقسیم سے بیس سال پیشتر عمل میں آیا تھا واضح طور پر اس امر کی دلیل بن گئی کہ اس کو محض ہندو مفادات کا حصول مقصود ہے اور اس کو مسلمانوں سے براہ راست یا مسلمانوں کے مفاد کی کسی بھی چیز سے لگاؤ نہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے وہ مسلمانوں کے خلاف ایک متنوع ادارہ ہے۔ ہندوؤں میں اس زبردست تکلیف کا موجب دراصل وہ تحریک تھی جو مذہبی جوش و جنون کی شکل میں ہندوؤں کے دلوں میں

Marfat.com

متلاطم تھی اور جس کو مختلف مذہبی رہنماؤں نے زبردست ہوا دے کر نیا رکر رکھا تھا۔ انگریز اس راز سے اچھی طرح واقف تھا کہ بابو رام موہن رائے نے دہریت کا مقابلہ کرنے کے لئے اور عیسائی مشنریوں کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے معاشرتی اور مذہبی اصلاحات کی ایک تحریک شروع کی تھی جس سے برہمو سماج پیدا ہوا۔ بعد ازاں کیشب چندر رائے نے اسی نوعیت کی تحریکیں بنگال کی طرح دوسرے صوبوں میں پھیلانا شروع کر دیں جس سے مخصوص نوعیت کے سماج بننے لگے۔ پونا میں پرارتھنا سماج ایم جی رانا ڈے کی رہنمائی میں وجود میں آیا شمالی ہند میں آریہ سماج مقبول بنایا گیا۔ انگریزوں میں بھی ایک ایسا طبقہ رہا ہے جو مکمل طور پر ہندوؤں کی حمایت کرتا رہا ہے اور جس کی خواہش یہ رہی ہے کہ ہندو کو ساتھ ملا کر اور انہیں صرف چند مراعات دے کر اپنے ساتھ ہمیشہ رکھا جائے اور اس کی مسلمان کے خلاف چلنے پر نہ صرف تحسین کی جائے بلکہ حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق حاصل کرتے ہیں مسلسل ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے اور مسلمان ہمیشہ ہندو ہی کو اپنا اصل دشمن تصور کر کے ان سے لڑتے رہیں اس طرح فرقہ وارانہ فسادات سے عوام میں اگرچہ ابتری پیدا ہوتی رہے گی لیکن اس کے ساتھ ہی لوگوں کو ایک مضبوط نوعیت کی انتظامیہ کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔ اس طرح ملک میں سیاسی گڑبڑ پیدا کرنے کا اصل مقصد یہی تھا کہ "ان کو آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو"۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں آریہ سماج کبھی تقویت نہ پکڑتا اگر اس کو انگریز کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی جو متھرا کا ایک ذہین طالب علم تھا انگریز کی حوصلہ افزائی کے ساتھ آریہ سماج کے عقائد کو پھیلانے میں مصروف ہوا۔ چونکہ آریہ سماج کی کامیاب کارروائیوں کا سبب بھی یہی تھا کہ انگریز درپردہ ہندو کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا اس لئے وہ ایسے افراد کی تلاش میں تھا جو ملک کے مختلف گوشوں میں بدامنی کا کچھ نہ کچھ مظاہرہ کرتے رہیں۔ انگریز نے اس قسم کا اقدام محض اس لئے اٹھایا کہ وہ ہندوستان کی دو عظیم قوموں کو کسی ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہتا تھا دونوں قوموں کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا نہ صرف محال تھا بلکہ ناممکن تھا۔ انگریز نے سوامی شردھانند اور لالہ لاجپت رائے کو بھی بہت بڑا لیڈر قرار دے کر بہت بڑا غلط قدم اٹھایا۔ ان دونوں لیڈروں نے اسلام دشمنی کے اقدامات اس حد تک اٹھانے شروع کر دیئے کہ سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ انہوں نے مذہبی تحریک بھی شروع کر دی۔ اس نئی مذہبی تحریک کا نام شدھی کی تحریک تھا۔

Marfat.com

اس تحریک کا ہدف صرف مسلمان قوم تھی۔ آریہ سماج کے لیڈروں نے انگریزوں کو پہلے سے بتا دیا تھا کہ وہ کسی عیسائی پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی نہیں کریں گے اور ان کا دائرہ عمل صرف مسلمانوں کے حلقے ہوں گے۔ اس سلسلے میں وہ ہر طرح کا زور لگائیں گے اس پر انگریز کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ تو پہلے ہی چاہتا تھا کہ ایسے حالات پیدا ہوں کہ باشندگان ہند کی توجہ سیاست سے ہٹ کر کسی اور طرف لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ بات بھی بالکل واضح ہے کہ مسلمان بھی اسی تحریک کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہ کر سکتا تھا چنانچہ مسلمانوں کے عزائم ہندوؤں کے خلاف اور زیادہ مضبوط ہوئے اور انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ سیاسی رنگ کی ایک علیحدہ تنظیم بنائیں جو کل ہندوستان کی بنیاد پر تشکیل پذیر ہو۔ اس قسم کے جھگڑوں سے ہندوستان میں دو اہم نتائج برآمد ہوئے۔ اوّل یہ کہ دو قومی نظریہ وجود میں آیا اور دوسرے یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

اگرچہ تقسیم بنگال کے نتیجے کے طور پر ہندوؤں کے مدمقابل دو نظریاتی چیزیں آ گئیں تھیں تاہم ہندوؤں نے اپنی معاندانہ کوششوں کو ترک نہ کیا اور وہ تقسیم بنگال کی تنسیخ کی سعی میں ہمہ تن مصروف رہے جس میں بالآخر وہ کامیاب بھی ہو گئے۔

Marfat.com

شملہ وفد ۱۹۰۶ء

شملہ وفد سے آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ وفد کس لئے، کب اور کس کو ملنے کیلئے گیا، اور اس کے مقاصد کیا تھے، اس وفد کی کامیابی یا ناکامی کی تفصیلات بیان کیجئے۔

جواب - انگریز نے ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں کی طرف ملتفت ہوکر جب یہ محسوس کیا کہ اہل ہندوستان میں آزادی کی رو میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور یہاں کے مختلف حصوں سے متنوع خبریں براہ راست انگلستان پہنچنا شروع ہوئیں تو حکومت برطانیہ نے اس امر کی ضرورت کو محسوس کیا کہ کچھ مزید مراعات دی جانی چاہیئں - اور ملک میں آزادی کی سانس کو تازگی بخشنے کے لئے کچھ آئینی اصلاحات نافذ کرنی چاہیئں ۱۹۰۵ء میں انگلستان کی مرکزی حکومت میں برطانوی لبرل پارٹی انتخابات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرکے برسر اقتدار آگئی - یہ پارٹی انتخابات میں حصہ لیتے وقت بھی اس امر کے حق میں تھی کہ ہندوستان کے لوگوں کو زیادہ دیر تک محض غلام تصور نہ کیا جائے بلکہ ان کو حکومت کے کام کاج میں حصہ دیا جائے تاکہ انہیں حکومت سے کچھ دلچسپی ہو اور وہ اپنے اوپر چلنے والے قوانین اور احکام کو بحالت مجبوری بادل ناخواستہ زیادہ دیر تک زبردستی مسلط تصور نہ کریں انکا خیال تھا کہ اگر ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی ہدایات کے مطابق اور برطانوی منشا کے خطوط کے مطابق قانون بنانے کی اجازت دے دی جائے گی تو وہ لوگ اسی میں ہی کافی خوش ہونگے اور وہ ہر ایسے قانون کی توثیق کرنے کے حق میں ہوں گے جو انکی مرضی کی شمولیت سے بنایا جائے گا۔ لبرل پارٹی کو یقین تھا کہ ہندوستان کے لوگ اخلاقی طور پر اس قدر پست ہو چکے ہیں کہ وہ صرف اس حقیقت کو اپنے لئے نعمت عظمیٰ تصور کریں گے کہ انہیں حکومت کے معاملات میں کسی حد تک شامل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ لبرل پارٹی نے برسر اقتدار آتے ہی اعلان کیا کہ وہ ہندوستان میں کچھ اور اصلاحات نافذ کرے گی۔

تقسیم بنگال کے بعد ہندوؤں کو بایں ہمہ ایک زبردست تشویش کا سامنا تھا کہ مسلمانان ہند

Marfat.com

کو بھی عملی انداز میں سیاست کے میدان میں کامیابیاں نصیب ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ اب مسلمان ہندوؤں کی سیاست میں رکاوٹ کا باعث بنتے رہیں گے۔ ہندوؤں کا وہ پروگرام کہ انڈین نیشنل کانگرس میں ہمہ جماعتی نظام رائج کر کے کسی سطح پر آکر یہ اعلان کر دیا جائے گا کہ مجموعی طور پر چونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کو واضح اکثریت حاصل ہے اس لئے مرکزی برتری ہندوؤں کو حاصل ہو گی۔ مسلمان کانگرس کے اس ہونے والے شعبدے سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ کیونکہ ہر قوم ایک فطرت کی مالک ہوتی ہے چنانچہ ہندوستان کے ہندو سوائے مکاری کے اور خفیہ خنجر زنی کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ کسی بھی صورت میں مردان میدان نہیں۔ وہ ہمیشہ خارجی قوت کا سہارا طلب کرتے ہیں اور ان کے کندھوں پر بندوق رکھ کر لگاتار فائرنگ کرتے ہیں اور ہندو سمجھ گئے تھے کہ ہندوستان میں ان کا دشمن انگریز نہیں ہے بلکہ مسلمان ہے جس نے ایک عرصہ دراز تک غلامی کی سلاسل میں انہیں جکڑے رکھا۔ ہندو کی اس نفرت سے مسلمان اچھی طرح آگاہ تھے۔ ہندوؤں نے مسلمان کے خلاف مختلف شکلوں میں پروپیگنڈا وغیرہ شروع کر دیا اور اس کے علاوہ بہت سے تنازعات پیدا کر دیئے جس میں اردو ہندی تنازعہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

سر سید احمد خان اور نواب محسن الملک ان حالات کا باقاعدہ اور مسلسل جائزہ لیتے جا رہے تھے اور وہ اس حقیقت کو بھی بھانپ گئے تھے کہ ہندو اب ایک اور چال چل کر انگریزوں کے اس انداز فکر میں تبدیلی لانے کی کوشش کرے گا جس کی وجہ وہ مسلمانوں کے حق میں کچھ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ہندو اپنی منافقت آمیز عاجزی کی انتہا کے تحت انگریزوں کی حمایت جیت گیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی کسی ظالم حکومت کی رگ انصاف بھی پھڑکتی ہے جو اس کو نیکی کرنے کی طرف راغب کرتی ہے لیکن اکثر اوقات شیطانیت حائل بھی ہو جاتی ہے۔ تاہم سر سید احمد خان اور محسن الملک نے مل کر فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی حالت زار بیان کریں موجودہ سیاسیات میں مسلمانوں کو مناسب ترین حد تک حصہ لینے اور ہندوؤں کے مقابلے میں متناسب انداز میں حقوق و مراعات حاصل کرنے کے لئے وائسرائے ہند سے بالمشافہ بات چیت ہو جس میں مسلمانوں کی طرف سے کسی ایک یا دو منتخب لیڈروں کی وساطت سے کی جائے اور وائسرائے ہند کو ان حقائق سے واضح کیا جائے جن کے تحت وہ انگریز کو غلط ڈگر پر لگایا گیا ہے اس کام کے لئے سر آغا خان مرحوم کو بھی بلا لیا گیا۔

۱۵ اور ۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو یہ تمام حضرات بمقام لکھنؤ جمع ہوئے اور انہوں نے مل کر اپنے احوال کا بغور جائزہ لیا۔ جن میں تقسیم بنگال، جداگانہ نیابت کی مخالفت، پارلیمانی جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ اور سرکاری ملازمت کے لئے مقابلہ کے امتحان میں شرکت کے مطالبے جیسے مسائل بھی شامل تھے۔ ان حضرات نے یہ بھی دیکھا کہ اگرچہ مسلمانوں کو سیاست سے باز رکھنے کی مذموم کوششیں مسلسل جاری رہی ہیں پھر بھی ملک کی ہر تحریک اور

Marfat.com

حکومت کا ہر اقدام ان بے چاروں پر ہمیشہ منفی انداز میں اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ لکھنو کے اس اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ مسلمانان ہندوستان کا ایک اعلیٰ درجے کا وفد وائسرائے ہند سے ملاقات کرے اور اس میں تمام مسلم باشندگانِ ہند کے مجموعی طور پر مطالبات پیش کرے چنانچہ ملاقات کا وسیلہ مسٹر آرکبولڈ پرنسپل ایم۔اے۔او کالج جو ان ایام شملہ میں گرمیوں کی تعطیلات گزارنے گئے ہوئے تھے (اور اتفاق سے وائسرائے لارڈ منٹو بھی شملہ ہی میں تھے) کو بنایا گیا۔ مسٹر آرکبولڈ نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کرنل ڈنلپ کی ہدایت کے مطابق وفد کے ارکان کو مطلع کیا گیا کہ وائسرائے نے وفد سے ملنے کی درخواست قبول کر لی ہے۔ اس لئے مطالبات وسپاس نامے کا ڈرافٹ تیار کرکے اسے ارسال کر دیا جائے۔ اس نے یہ بات بڑے واضح الفاظ میں کہہ دی کہ جہاں مسلمان دوسرے مطالبات پیش کریں گے، وہاں یہ بھی لکھ دیں کہ ہندوستان میں جمہوری نظام کارفرما نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کی نمائندگی نامزدگی سے ہونی چاہیئے۔

بالآخر یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سر آغا خان کی قیادت میں سات افراد پر مشتمل مسلمانوں کا ایک وفد شملہ میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملا۔ اور اسے مندرجہ ذیل باتیں بتائیں۔

۱۔ نیابتی نظامات کا طریقہ انتخاب متناسب نمائندگی کے اصول کے تحت ہونا چاہیئے تاکہ مخصوص علاقوں کے مخصوص تعداد میں مسلمان منتخب یا نامزد ہو سکیں۔

۲۔ مسلمانوں کو ان کی تاریخی اہمیت اور سیاسی حیثیت کا اندازہ کر کے انہیں آبادی کے تناسب کے علاوہ کچھ اور بھی نشستیں دی جائیں۔

۳۔ سرکاری گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ ملازمتوں پر آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مسلمان افسران کا تقرر کیا جائے۔ اس طرح مسلمانوں کو ملک کی اعلیٰ اور کلیدی آسامیوں سے ان کا تقرر ہونا چاہیئے۔

۴۔ جن میں ہائی کورٹ اور چیف کورٹ کے جج حضرات اور ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی حیثیت سے ان کا تقرر ہونا چاہیئے۔

۵۔ یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹوں اور سینٹوں کے لئے چند نشستیں مسلمانوں کے لئے مخصوص کی جائیں۔

۶۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے امداد دی جائے۔

۷۔ مسلمانوں کے سیاسی۔ معاشرتی اور ثقافتی تشخص کی بقا کے لئے قابل اور معتمد مسلمانوں

Marfat.com

کی خدمات حاصل کی جائیں۔

لارڈ منٹو نے مسلمان وفد کی تمام باتوں کو پوری توجہ سے سنا اور نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ میں آپ سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان کمیونٹی اس پر یقین کر سکتی ہے کہ کوئی جدید انتظامی تنظیم جس سے میرا تعلق ہو گا، اس میں ایک فرقے کی حیثیت سے ان کے سیاسی حقوق اور مفاد کا تحفظ کیا جائے گا اور یہ کہ آپ اور ہند کے لوگ اس کے لئے برطانوی حکومت پر پورا اعتماد کریں کہ جس طرح ہمیشہ اس نے فخر کے ساتھ کیا ہے وہ اس عظیم مخلوق کے مذہبی عقائد اور قومی روایات کا احترام کرے گی۔ جس پر ملک معظم کی سلطنت کی آبادی مشتمل ہے۔" (پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۵۲)

لارڈ منٹو نے میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ اداروں کے الیکشن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہ دعویٰ آپ کے سپاس نامے کا ماحاصل ہے کہ الیکشن کے ہر طرز میں خواہ اس کا اثر میونسپل بورڈ پر ہو ڈسٹرکٹ بورڈ پر ہو یا مجلس قانون ساز پر جس میں بھی انتخابی نظام داخل کرنے کی تجویز ہو یا اس میں کسی اضافے کی۔ اس میں مسلمان کی شرکت ایک الیکشن پارٹی کی حیثیت سے ہونی چاہیئے۔ میں اس میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔"

(ہسٹری آف فریڈم موومنٹ۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۵۷ء۔ ۱۹۶۳ء۔
جلد سوم۔ حصہ اول)

لارڈ منٹو کے یہ الفاظ کہ انتخابی کارروائیوں میں مسلمانوں کی شمولیت محض انفرادی نوعیت کی نہیں ہونی چاہیئے بلکہ جماعتی نوعیت کی ہونی چاہیئے، ایک معنی خیز بات تھی اور اس کی اس بات سے ہی مسلمانوں کو ایک انجمن یعنی پارٹی بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں میں یہ احساس اندرونی طور پر کافی پہلے سے پایا جاتا تھا لیکن اسے کسالت کہہ لیجئے یا شرافت۔ مسلمانوں نے من حیث الجماعت ہندوؤں سے الجھنا نہیں چاہا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کو بہت عرصہ سے پتہ چل گیا تھا کہ ہندو نے انگریز کے ساتھ مل کر نہانی طور پر مسلم مفادات

Marfat.com

کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا ہے لیکن مسلمان اپنی عالی ظرفی کی بنا پر ہندو کے اس منافقانہ ہتھکنڈے سے نہ تو پریشان تھا اور نہ اسے اس کے ناپاک ارادوں سے چنداں خوف زدہ تھا البتہ جب ہندو تقسیم بنگال کے بعد کھل کر مخالفت کے لئے سامنے آئے اور اس نے مختلف فروعی معاملات کو قومی سطح پر ہوا دینا شروع کر دی اور انڈین نیشنل کانگرس کے منشور کی سراسر کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے صرف ہندو کے تحفظ کی ٹھانی تو مسلمانوں کو بھی سیاسی تحرک کرنا پڑا اور اس سیاسی تحرک کی ابتداء شملہ وفد سے ہوئی۔

شملہ وفد کی وائسرائے سے ملاقات کے بعد ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی بالکل منفرد اور علیحدہ حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا اور انگریز کو پتہ چل گیا کہ اس کے مفتوحہ ملک میں ان دو قوموں میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اس سے انگریز کو خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ خوشی اس امر کی کہ اس برصغیر کے تمام مسلمان مل کر ایک نئی سیاسی جماعت کی صورت میں حکومت برطانیہ کے لئے نئے مسائل کھڑے کریں گے اور انتظامی معاملات میں بھی گڑبڑ ہوگی۔ جس کے نتیجے کے طور پر انگریزی حکومت ان فسادات اور اختلافات کو فرو کرنے کے بہانے ہمیشہ طاقت استعمال کرنے میں حق بجانب ہوگی اور دونوں جماعتوں کو یکے بعد دیگرے دبایا جاتا رہے گا۔ اور مذہبی جذبات کو اشتعال دے کر ان کو آپس ہی میں لڑایا جاتا رہے گا۔

انگریز رنجیدہ اس امر پر تھا کہ اگر ان کے اختلافات زیادہ ہی شدت پکڑ گئے تو ملک کا انتظام سنبھالنا دشوار ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ اندیشہ بالکل درست نکلا۔

Marfat.com

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء

ہندوستان میں مسلم لیگ کا قیام کن حالات میں وجود میں آیا اس کے قیام میں کن اکابرین ملت کی خدمات بالخصوص اہمیت کے ساتھ شامل ہیں۔ اور اس نے برصغیر میں کیا اہم کردار ادا کیا؟ تفصیل سے بیان کیجئے۔

پس منظر: انگریزوں کی آئینی اصلاحات کے رجحان کو دیکھ کر ہندوؤں کا مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویے کا جائزہ لے کر برصغیر ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں جو بے چینی پیدا ہوتی تھی وہ بیجا یا غلط نوعیت کی نہیں تھی بلکہ ملکی سیاست کو ایک نئے موڑ پر لاکر کھڑا کر دینے والی تھی۔ مسلمانوں کو انگریزوں کے سلوک سے بالعموم اور ہندوؤں کے کردار سے بالخصوص اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ سیاست ہند سے علیحدہ نہیں رہ سکتے اس غرض کے لئے انہوں نے مل کر ایک ڈیپوٹیشن تیار کیا جس کی قیادت سر آغا خان نے کی۔ اور جس میں نواب محسن الملک جیسے مدبر مسلمان نے حصہ لیا۔ جو یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ کے مقام پر لارڈ منٹو وائسرائے ہند سے ملا جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں بیان کر دی گئی ہے اور یہاں سے واضح طور پر ان کو احساس ہوا۔ کہ ملکی سیاست میں عملی حصہ لینے کے لئے مسلمانوں کی ایک علیحدہ انجمن کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ اگرچہ وائسرائے سے ملاقات کے دوران بنگال کے مسلمانوں میں انڈین نیشنل کانگریس کا جواب تیار کرنے کے لئے ایک نئی جماعت کی تشکیل کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور اس سلسلے میں سر سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ نے آل انڈیا کنفیڈریشن کے متعلق اپنا ایک نوٹ بھی شائع کیا

Marfat.com

آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل:

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ ڈیپوٹیشن جب اپنے مطالبات کو تحریری اور بالمشافہ طور پر لارڈ منٹو کو دے آیا تو اس پر مزید کارروائی کے لئے مسلمانوں نے سیاسی میدان میں قدم کچھ اور آگے بڑھانا شروع کر دیئے۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کے مقام پر "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" طلب کی گئی جس میں ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل پر تفصیلی انداز میں غور و خوص کیا گیا۔

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو اس کانفرنس کا ایک اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی جماعت ہو گی جس کا نام "آل انڈیا مسلم لیگ" ہو گا۔ اس اجلاس میں صدارتی خطبہ پڑھتے ہوئے نواب وقار الملک نے فرمایا کہ:

"جس مقصد کے لئے یہ اجلاس طلب کیا گیا ہے، اس کی ضرورت دراصل ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہی محسوس نہیں کی گئی، بلکہ اس مقصد کا احساس تو ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء ہی کو ہو گیا تھا جبکہ انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آئی تھی۔ مسلمان اگر واضح طور پر کسی قسم کی چپقلش سے بچا رہا ہے تو وہ محض سر سید احمد خاں کی ہدایات کی تعمیل کے پیش نظر تھا۔ اگر ان جیسا بردبار اور سنجیدہ رہنما مسلمانوں کو اس دور میں نہ ملتا تو شاید مسلمان کو ہندوستان میں کوئی بھی مقام نہ ملتا۔ اب چونکہ حالات اس نوعیت کے ہو گئے ہیں کہ مسلمانوں کو نہ صرف اپنے مطالبات منوانے کے لئے اجتماعی کوششیں کرنی چاہئیں بلکہ اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیئے۔"

انہوں نے مزید فرمایا کہ:

"اس وقت انگریز نے جمہوری اقتدار کی جو بنیاد رکھ دی ہے اس کے لحاظ سے ہندوؤں کو گنا ہی جائے گا چنانچہ اگر گنتی کا خیال رکھا گیا تو ظاہر ہے کہ مخالفین مسلمین کی تعداد ان بے چاروں سے چار گنا زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے ہندوؤں کی اکثریت غالب ہے اور اگر من حیث الجماعت مسلمان ایک پلیٹ فارم پر اپنے مخصوص مطالبات کے حصول کے لئے یکجانہ ہوتے تو واضح ہے کہ ان کا مال۔ ان کی آبرو، ان کا مذہب اور ان کا مستقبل سب

Marfat.com

خطرے میں پڑ جائیں گے ، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اخلاقیات کے دائرہ کے اندر رہ کر ایک پُرامن انجمن کی تشکیل کریں جس کے ذریعے نہ صرف مسلمانان ہند کے مطالبات حکومت برطانیہ تک پہنچتے رہیں بلکہ مسلمانوں کی خصوصی حیثیت کو بھی تسلیم کیا جائے۔

پہلی قرارداد: نواب وقار الملک کی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ نے باقاعدہ ایک ریزولیوشن پیش کیا جس کے مندرجات حسب ذیل ہیں۔ اور جس کی تائید حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا ظفر علی خاں نے کی۔

"قرار پایا کہ یہ جلسہ جو ہندوستان کے مختلف حصوں کے ان نمائندوں پر مشتمل ہے جو ڈھاکہ میں جمع ہوئے ہیں، یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے جس کا نام "آل انڈیا مسلم لیگ" رکھا جائے اور جس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں"

۱۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کی طرف سے وفاداری کے جذبات کو ترقی دینا اور کسی قسم کی آئندہ تدبیر کی نسبت حکومت کے ارادوں کے متعلق اگر کوئی بدگمانی ہو تو اس کو رفع کرنا۔

۲۔ مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنا اور انہیں آگے بڑھانا اور ان کی ضروریات اور تمناؤں کی حکومت کے سامنے ادب سے ترجمانی کرنا۔

۳۔ دوسری جماعتوں کے خلاف مسلمانوں میں جذبات، عداوت کی نشو ونما کا اس طریقے پر انسداد کرنا کہ مسلم لیگ کے مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کو نقصان نہ پہنچے۔

مسلم لیگ کی تشکیل میں سب سے نمایاں اور قابلِ ستائش بات یہ تھی کہ اسکی مدمقابل سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگرس کی اساس ہندوؤں کی بجائے انگریزوں کے سرکاری افسروں نے رکھی۔ اور انکے بانی مبانی سرکاری افسروں میں ایلن ہیوم ، ویڈربرن ، رپن وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں، اور کئی سالوں تک کانگرس کے سالانہ اجلاس بھی انگریز افسروں کی زیر صدارت ہوتے رہے لیکن اس کے برعکس مسلم لیگ کے قیام کا محرک خود مسلمانوں کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا اور مسلمانوں نے ہی اس کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں نے ہی اس کی صدارت کی۔ مسلمانوں ہی کے موقف کو بیان

Marfat.com

کرنے کے لئے یہ سرگرم عمل رہی۔

بہر حال اس اساسی اجلاس میں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو آل انڈیا مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا، ایک اور قرارداد کے ذریعے ایک پراونشل کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ارکان کی تعداد ساٹھ تھی۔ ان ساٹھ ارکان میں وہ تمام حضرات شامل تھے جو شملہ وفد کی حیثیت سے لارڈ منٹو کو یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ملے تھے۔ اس کمیٹی کو مسلم لیگ کا آئین اغراض و مقاصد بالتفصیل، تیار کرنے کے لئے کہا گیا۔

اس کے لئے انہیں تقریباً دو ماہ وقت دیا گیا اور ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس آئین کو منظور کرنے کے لئے مسلم لیگ کا ایک باقاعدہ اجلاس دسمبر ۱۹۰۶ء کو کراچی میں انعقاد پذیر ہوگا۔ جہاں جماعت کے دوسرے مسائل پر بھی تفصیلی غور کیا جائے گا۔ جن اکابرین ملت نے مسلم لیگ کی تشکیل میں مدد دی ان میں نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ۔ نواب سید نواب علی چودھری آف بوگرا، مسٹر (جسٹس) شاہ دین آف لاہور۔ جناب مظہر الحق آف پٹنہ۔ جناب حکیم اجمل خان آف دہلی۔ جناب رفیع الدین آف پونہ۔ نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد آف علی گڑھ اور سید وزیر حسن آف لکھنؤ، کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

مسلم لیگ کا آئین ایک برگزیدہ ہستی نے جنہوں نے علی گڑھ اور آکسفورڈ میں نہایت ہی اعلیٰ معیار کی انگریزی پر عبور حاصل کیا، تیار کیا۔ اس ہستی کا نام محمد علی جوہر تھا۔ آئین کے مسودے کو ڈھاکہ ریزولیوشن کے تحت وسیع پیمانے پر عوام تک پہنچایا گیا، تاکہ وہ پوری پوری توجہ سے اس پر رائے زنی کر سکیں۔ اس کے بعد اس کی باقاعدہ منظوری کے لئے مسلم لیگ کا ایک باقاعدہ اجلاس کراچی میں طلب کیا گیا۔

مسلم لیگ کا سب سے پہلا باقاعدہ اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں انعقاد پذیر ہوا، اور اس کی صدارت بمبئی کے سر آدم جی پیر بھائی نے کی یہ اجلاس مسلم لیگ کے مسودہ آئین پر بحث کرنے اور اس کی منظوری دینے کے بعد دوسرے دن ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو ملتوی ہو گیا۔

دوسرا اجلاس: آل انڈیا مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں نواب مزمل اللہ خان جو علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں کے جائنٹ سیکرٹری تھے، کے گھر پر ہوا۔

Marfat.com

(جسٹس شاہ دین نے صدارت کی، دراصل یہ اجلاس مسلم لیگ کا ایک فعال اجلاس تھا اور اس میں مندرجہ ذیل امور طے پاتے گئے۔

۱۔ سر آغا خان کو صدر آل انڈیا مسلم لیگ منتخب کیا گیا۔

۲۔ میجر سید حسن بلگرامی کو سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ قرار دیا گیا۔

۳۔ حاجی محمد موسیٰ خاں کو نواب وقار الملک کی جگہ جائنٹ سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ نواب وقار الملک دراصل نواب محسن الملک کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بن گئے تھے۔ اس لئے وہ زیادہ تر وقت اس خدمت میں گزارنا چاہتے تھے۔

۴۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ لندن میں عزت مآب جناب سید امیر علی کے ہیں مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ کے فنڈ سے مالی امداد کا بندوبست کیا جائے اور اسے لندن میں مسلم لیگ کی شاخ ہی قرار دیا جائے۔

۵۔ جو مطالبات شملہ وفد نے لارڈ منٹو کو ۱۹۰۶ء میں پیش کئے تھے انہیں جماعت کی طرف سے آئینی صورت دینے کے لئے پھر دہرایا گیا۔

۶۔ عدلیہ اور انتظامیہ کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے۔

۷۔ جداگانہ طریق انتخاب کو اپنایا جائے۔

۸۔ عدالتوں میں مسلمان جج بھی تعینات کئے جائیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی ابتدائی کامیابیاں: ۱۹۰۶ء کے ماہ دسمبر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وجود تشکیل پذیر ہوا اور اس سے صرف دو ماہ پیشتر شملہ وفد نے جو مطالبات لارڈ منٹو کو پیش کئے تھے اس سلسلے میں آئندہ دو تین سالوں میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی۔ مسلم لیگ کا تیزی سے وجود میں آنا، اس کے ٹھوس مطالبات کا حکومت کی نظر میں قابل قدر ہونا اور پھر ان کا منظور ہو جانا، نہ صرف مسلمانوں کی نمایاں کامیابی تھی بلکہ ہندو کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ تھی جن معاملات میں مسلم لیگ دو ہی سال کی تگ و دو میں کامیاب ہو گئی، ان میں سے مندرجہ ذیل بہت اہمیت رکھتے ہیں:

۱۔ جداگانہ طریق کار کو تسلیم کر لیا گیا۔ اور ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے آئینی اصلاحات میں اسکی وضاحت بھی کر دی گئی اس سے ہندوؤں کی سیاست کی کمر ٹوٹ گئی۔

Marfat.com

۲۔ ہائی کورٹ اور دوسری چیف کورٹس میں مسلمان ججوں کو بھی متعین کر دیا گیا۔ چنانچہ کلکتہ ہائی کورٹ میں جناب شریف الدین الہ آباد ہائیکورٹ میں جناب کرامت حسین اور لاہور ہائی کورٹ میں جناب شاہ دین کو جج مقرر کر دیا گیا اس کے علاوہ نواب عماد الملک سید حسن بلگرامی کو وائسرائے کی کونسل کا رکن بھی منتخب کر لیا گیا۔

۳۔ مسلمانوں کی اوقاف کی جائیدادوں کے فوائد مسلمان متولیوں کو حاصل کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح مسلم لیگ نے بہت سی مفلوج جائیدادوں میں پھر سے جان ڈال دی جو ہندوؤں کے لئے سخت ناگوار بات تھی۔ اوقاف بل جناب محمد علی جناح (قائد اعظم) نے تیار کیا تھا، وہ اس وقت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔

مسلم لیگ کی وفاداری اور انگریز کی بدعہدی: آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے سب سے پہلے اجلاس میں جو سب سے پہلی قرارداد منظور کی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان اور آل انڈیا مسلم لیگ ہمیشہ اپنی وفاداری انگریز کے ساتھ وابستہ رکھے گی اور اس کے صلے میں ایک طرف سے پیش کئے ہوئے مطالبات پر انگریز نہایت ہمدردی سے غور کر کے مسلمانوں کے مفادات وحقوق کا تحفظ کرے گا لیکن انگریز ایسا کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا انگریز نے ادھر مسلم لیگ کی باتیں سن کر ادھر کانگرس کو ان کے خلاف بھڑکا دیا، اور وہ قومی رازوں کا تحفظ جان بوجھ کر نہ کر سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو کو پوری پوری شہ مل گئی۔

انگریز نے ہندوؤں سے مل کر مسلمانوں کے مفادات کو زیادہ سے زیادہ کچلنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو شملہ وفد میں دی گئی تسلیوں کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کرنے اور ہندو کو خوش کرنے کیلئے اس نے ہندوستان میں داخلی اور خارجی طور پر مندرجہ ذیل قبیح کرتوتیں کیں۔

۱۔ بنگال کو بڑی محنت سے مسلمانوں نے تقسیم کرایا تھا جس سے مسلمانوں کی پوزیشن برصغیر میں بہت مضبوط ہو گئی تھی لیکن ۱۹۱۱ء میں اسکو منسوخ کر کے بنگال کو پھر سے متحد کر دیا۔

۲۔ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے اور اپنے فاتحانہ تحکم کو جتانے کے لئے ۱۹۱۲ء میں کانپور کی مسجد کا مچھلی والا بازار بغلی دالان محض سڑک چوڑی کرنے کی خاطر توڑ دیا گیا مسلمانوں نے جب احتجاج کیا تو گولی چلا کر متعدد مسلمانوں کو ہلاک کر ڈالا۔

۳۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔

Marfat.com

۴۔ مسلم لیگی رہنماؤں اور قابل ترین مسلمان لیڈروں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو نظر بند کر دیا گیا۔

۵۔ ۱۹۱۲ء میں انگریزوں کی شہ پر روسیوں نے مشہد پہ گولہ باری کی۔ اسی سال بلقانی ریاستوں نے مل کر ترکی پر حملہ کر دیا۔

ان تمام حالات کو انگریز نے دیدہ دانستہ خراب کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ کی روزافزوں مقبولیت کو ہندو ہی کے ہاتھوں نیچا دکھایا جائے۔

کانگرس اور لیگ کی مفاہمت :

انگریز کے اس قسم کے غیر یقینی رویے سے مسلمانوں میں بد دلی پیدا ہو گئی اور انہیں اپنی جماعت کو ان اغراض و مقاصد کے تحت چلانا کسی حد تک مشکل ہو گیا۔ جس کے تحت مسلم لیگ کی تشکیل کی گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں لیگ کو اپنے دستور اور مقاصد میں ترامیم کرنا پڑیں۔ ان ترامیم کی وجہ سے مسلم لیگ کی شفاف مسلمیت اور عصبیت پر مبنی خیالات میں قدرے فرق آ گیا اس کے علاوہ ارباب اختیار نے سوچا کہ انگریز کا یہی رویہ رہا تو بہت ممکن ہے کہ وہ کسی سطح پر ہندو کی طرح بالکل کھل کر سامنے آ جائے اور ایک ہی سیاسی پارٹی کے جاری رکھنے کا حکم دے دے چنانچہ مصلحت اس میں گردانی گئی کہ آئین مسلم لیگ میں مناسب تغیر کر ہی لیا جائے چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ مسٹر محمد علی جناح (قائداعظمؒ) جو ان دنوں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی تھے، مسلم لیگ کے آئین میں ان تبدیلیوں سے متفق ہو گئے چنانچہ وہ مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن بن گئے۔

ان کے مسلم لیگ میں آ جانے سے اور لیگ کے آئین میں ترمیم ہو جانے سے کانگرس کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہونے کی بجائے موافق ہو گئے اور ایک بار پھر یہ عنصر غالب ہوا کہ مسلمان اور ہندو دونوں مل کر انگریز کو ملک سے نکالنے کے لئے ہم خیال ہو جائیں۔ چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ مسلم لیگ کی کانگرس کے اجلاس مشترکہ ہونے لگے۔ اس صورت حال سے انگریز کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ اس میں کانگرس کی برتری اور لیگ کی ہزیمت کے عناصر کارفرما تھے۔ لیکن انگریز کی یہ چال بھی زیادہ دیر تک کامیاب نہ رہ سکی اور مسلم لیگ اپنے اصل مقاصد میں کامیاب ہو گئی۔

Marfat.com

منٹو مارلے اصلاحات
۱۹۰۹ء

سوال: انگریز بیسویں صدی کے شروع میں اس حقیقت کو پہچان گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کو زیادہ دیر تک اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتا۔ عوام میں بے دلی مسلسل پیدا ہو رہی تھی۔ اس بے چینی کو کسی حد تک دور کرنے کے لئے ۱۹۰۹ء میں کچھ اصلاحات نافذ کی گئیں۔ وہ اصلاحات کیا تھیں اور باشندگان ہند کس حد تک اس سے مستفید ہوئے؟

پس منظر: یہ درست ہے کہ انگریز کو اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اس کو ایک خارجی حکمران تصور کرتے ہیں اور اسکی اطاعت محض چند مصلحتوں کی بنا پر اور ذاتی کمزوریوں کی بنا پر کر رہے ہیں۔ انگریز کی پالیسی بھی یہی تھی کہ کسی طرح اس ملک کے باشندوں کو متحد نہ ہونے دیا جائے۔ اس نے یہ بات تو جان لی تھی کہ یہاں کے لوگوں کو لڑانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہندو مسلم میں افتراق و انتشار پیدا کیا جائے لیکن اس انتشار پر اتنی نظر ضرور رکھی جائے کہ شہری آبادی ذاتی اور مذہبی معاملات کی حدود کو عبور کر کے سیاسی حدود کو نہ چھونے لگیں اور اگر چھونے بھی لگیں تو انہیں مرکزیت مملکت انگلشیہ کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق نہ ہو جائے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہیں سیاسی آزادی کی طرف گامزن کرنے کیلئے مختلف نوعیت کے اقدام اٹھا رہا تھا اور دوسری طرف ان دو قوموں (ہندو اور مسلمان) کو آپس میں غیر مربوط رکھنے کے لئے مختلف چالیں چل رہا تھا۔ اس

Marfat.com

کی یہ چالیں اسقدر پُر فریب تھیں یہ بظاہر دونوں قومیں اسی کو اپنا حمایتی تصور کرتی تھیں لیکن وہ حقیقت میں کسی کی حمایت نہ کرتا تھا بلکہ ذاتی افادیت کے حصول کی پالیسیوں پر عمل پیرا تھا مسلمانوں کے مطالبے پر ۱۹۰۵ء میں صوبہ بنگال کو از سر نو جغرافیائی ترتیب دے کر تقسیم کر دیا۔ اور چند سالوں کے بعد ہندوؤں کے مطالبے کو تسلیم کر کے اس تقسیم کو منسوخ کر دیا۔

اس بست و کشاد کے دوران اس نے افراد معاشرۂ ہند کی توجہ سیاسیات کے مثبت پہلو کی طرف لگانے کے لئے مناسب سمجھا کہ انہیں کچھ ایسی اصلاحات بخشی جائیں جن سے یہ لوگ کم از کم اتنا تو سمجھ سکیں کہ انگریز ہم پر بزور شمشیر مسلط نہیں رہنا چاہیئے اور ہمیں زبردستی غلام بنا کر اپنے احکام مسلط نہیں کرنا چاہتا، چنانچہ اس نے سیاسی اصلاحات کا اجرا کیا۔

ان سیاسی حالات کے پس منظر سے باخبر ہونے کے بعد یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ ان اصلاحات کے نفاذ کے لئے انگریز کے پاس قانونی نوعیت کا کیا جواز تھا۔ در اصل ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے ہندوستان کے وائسرائے کے عہدے سے استعفٰی دے دیا، اور اسکی جگہ حکومت برطانیہ نے لارڈ منٹو کو نیا وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا۔ اسی سال برطانیہ میں لبرل پارٹی نے انتخابات جیت کر اقتدار حکومت سنبھالا تھا۔ چنانچہ مرکزی کابینہ میں برطانیہ میں وزیر ہند کا عہدہ لارڈ مارلے کو دیا گیا۔

ان دونوں نے ہندوستان کے معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی سال بنگال کو تقسیم کر کے مسلم اکثریت کو علیحدہ حصے میں بانٹ دیا، جو ہندوؤں کے لئے سخت تشویش کا باعث بنا۔ ہندوؤں کا ارادہ تھا کہ مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگرس کی رکنیت کا جھانسہ دیکر انہیں منتشر ہی رکھا جائے اور بالآخر سیاسی اقتدار پورے ملک کی واحد سیاسی جماعت یعنی کانگرس کو ملے جس کے بعد آبادی کے لحاظ سے اکثریت ہونے کی بنا پر مسلمانوں کو دوسرے درجے کی قوم بنا کر ان پر حکومت کی جائے اور اس طرح سے قائم ہونے والی حکومت کو کبھی زوال آ ہی نہیں سکتا تقسیم بنگال کے بعد ہندو نے نہ صرف مسلمانوں سے ناراض تھے بلکہ وہ انگریز کے خلاف بھی برانگیختہ ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف بنگال میں بلکہ پورے ہندوستان میں سازشوں کا جال بچھا دیا۔ شورش کا آغاز کیا۔ شر پسند ہندو عناصر نے متعدد سرکاری ملازمین کو جن میں بیشتر انگریز اور کسی حد تک دیسی لوگ بھی شامل تھے قتل کرنا شروع کر دیئے۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے پوری پوری نگرانی کی جا رہی تھی لیکن سازشوں کی اسقدر کثرت تھی کہ انگریز اپنی تمام تر پھرتی

Marfat.com

کے باوجود ان پر قابو نہ پاسکا تھا۔

ہندوؤں کے اس طرز عمل پر ظاہر ہے کہ مسلمان بھی پریشان ہو گئے تھے لیکن مسلمانوں کی پریشانی بجائے منفی پہلو پر غور کرنے کے اس بات کی طرف متوجہ تھی کہ اس بحران پر قابو کس طرح پایا جا سکتا ہے اگر اس وقت ہندوؤں کے زور کو برداشت کر لیا گیا تو وہ انگریز سے رہائی حاصل کرنے کے بعد ہندوؤں کے جنگل میں پھنس جائیں گے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی جداگانہ حیثیت کو منوانے کے لئے مثبت انداز کے اقدام اٹھانے شروع کر دیئے چنانچہ مسلمانوں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل کی اور اس سیاسی جماعت نے سب سے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ انہیں قانون ساز اداروں میں جداگانہ نیابت حاصل ہو۔

اس جداگانہ نیابت کے حق کی حصول کی نہ صرف سیاسی وجوہات تھیں بلکہ مسلمان ہند سے کئی وجوہات کی بنا پر بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یہ ہندو سے مختلف تھا۔ ثقافت کے لحاظ سے اسکی حیثیت متفاوت تھی، اور مذہبی اور تاریخی نکتہ نظر سے تو اس کی انفرادیت سارے عالم کو تسلیم ہے اور یہ دونوں قومیں اس لحاظ سے ایک دوسرے سے کسی بھی زاویے سے اشتراک کا سلسلہ جوڑ نہیں سکتیں۔ مذہب کی ترغیب کی بنا پر یہ قوم ہندوستان میں داخل ہوئی تھی اور مذہب کے نام پر یہاں پروان چڑھی تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ انگریز کو خوش کرنے کے لئے اور ہندوؤں سے قارورہ ملانے کے لئے وہ اپنی عظمت رفتہ کو فراموش کر کے از خود ماتحت قوم بن جائے۔ اس لحاظ سے انگریز کو اس اندرونی بے چینی کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان بھر کے انتظامی معاملات میں پختگی اور اصلاح پیدا کرنے کے لئے جمہوری اقدار کی پرورش کو ضروری گردانا۔

۱۹۰۸ء میں ایڈورڈ ہفتم شاہ انگلستان و مقبوضات دیگر نے اپنی گولڈن جوبلی پر حکومت ہند کو جو پیغام بھیجا۔ اس میں کہا کہ انگریزی حکومت کی شروع ہی سے یہ خواہش رہی ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ جمہوری اقدار کے مطابق سلوک کیا جائے اور سیاسیات ہندوستان کو عین جمہوری تقاضوں کے مطابق پنپنے دیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۰۹ء میں اس غرض کے لئے باقاعدہ ایک ایکٹ کا نفاذ کیا گیا۔ یہ ایکٹ اصلاحات پر مبنی تھا۔ جن کا نام وائسرائے ہند لارڈ منٹو اور وزیر برائے امور ہند مسٹر مارلے کے

Marfat.com

نام پر "منٹو مارلے اصلاحات رکھا گیا۔

چیدہ چیدہ اصلاحات: ۱۹۰۹ء کے اس ایکٹ کی رو سے مندرجہ ذیل امور کو قانونی صورت دیدی گئی۔

۱۔ مجالس قانون ساز کو وسیع کر دیا گیا۔
۲۔ وائسرائے کی کونسل کے زائد ارکان کی تعداد کو بڑھا کر ۶۰ کر دیا گیا۔
۳۔ بنگال۔ مدراس۔ یوپی۔ بمبئی۔ بہار اور اڑیسہ کی مجالس قانون ساز کی تعداد کو پچاس تک بڑھا دیا گیا۔
۴۔ پنجاب۔ برما اور آسام کی مجالس قانون ساز کو ۳۰ تک بڑھا دیا گیا۔
۵۔ ہر صوبائی مجلس قانون ساز میں غیر سرکاری ارکان کی تعداد سرکاری ارکان سے بڑھا دی گئی۔ اس طرح غیر سرکاری ارکان، سرکاری ارکان کے معاملے میں اکثریت میں ہو گئے
۶۔ جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔
۷۔ دونوں قوموں (ہندو اور مسلم) کے رائے دہندگان کے ناموں کے جدا جدا رجسٹر تیار کرنے کا حکم دے دیا گیا۔
۸۔ کونسلوں کو وسیع تر اختیارات دے دیئے گئے اور ان کے دائرہ بحث کو بھی وسیع کر دیا گیا اس وسعت سے ہر رکن کو اجازت دی گئی کہ وہ کوئی بھی قرارداد جس کا تعلق ٹیکسوں میں کمی یا کسی دیگر قانون سے ہو، اسمبلی میں بحث کے لئے پیش کرنے کا حق رکھتا تھا۔
۹۔ قانون ساز اسمبلی کو بجٹ پر شق بہ شق بحث کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔
۱۰۔ اسمبلی میں ضمنی سوالات کے حق کو تسلیم کر لیا گیا البتہ انتظامی کونسل کے رکن کو فی الفور جواب دینے کی بجائے اسے کچھ وقت دیئے جانے کے لئے واضح ہدایت کی گئی تاکہ وہ مناسب جواب دے سکے۔
۱۱۔ صدر کونسل کو بغیر وجہ بتلائے کسی بھی قرارداد کو مسترد کرنے کا حق حاصل رکھا گیا۔
۱۲۔ مفاد عامہ سے تعلق رکھنے والے امور پر کونسل میں بحث کرنے کے بارے میں قوانین مرتب کر لئے گئے۔
۱۳۔ بنگال، بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں لیفٹیننٹ گورنر مقرر کرنے کی اجازت دے دی گئی اور انہیں اپنی اپنی کونسلوں کی تشکیل کی اجازت دے دی گئی۔

Marfat.com

۱۴۔ یونیورسٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں۔ میونسپل کمیٹیوں اور تجارتی اداروں کو اپنے ارکان منتخب کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

۱۵۔ حکومت کی طرف سے مقرر کردہ داخلی امور کے سربراہ کو اجازت دے دی گئی کہ وہ کسی بھی سیاسی مجرم کو انتخابات میں حصہ لینے کا اہل قرار دے دیں کیونکہ قبل ازیں کسی سیاسی مجرم کو ملک کی سیاسیات میں حصہ لینے کی ممانعت تھی۔

۱۶۔ وائسرائے کی انتظامی کونسل جو پہلے صرف انگریز ارکان پر ہی مشتمل تھی۔ اس میں اب ایک ہندوستانی رکن کو بھی شامل کر لیا گیا۔

تبصرہ: منٹو مارلے اصلاحات دراصل کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱ء اور کونسلز ایکٹ ۱۸۹۲ء میں نمایاں اصلاحی بنیادوں پر مبنی تھا۔ عوام کو ملکی معاملات میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی اور ان کا دائرہ عمل پہلے سے بہت وسیع ہو گیا۔ سب سے اہم بات یہ کہ قانون سازی میں انہیں اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا موقع دیئے جانے سے بہت سا بغض صاف ہو گیا۔ انگریز کے خلاف نفرت کے جذبات میں قدرے کمی واقع ہوئی لیکن اس کے باوجود انگریز نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے اس حق کو محفوظ رکھا کہ صدر مجلس جب چاہے اور جس سوال کے متعلق چاہے اس کو مسترد کر سکتا تھا۔ اور اس استرداد کی وجہ بتلانے کا وہ پابند نہیں تھا، تاہم ارکان اسمبلی کو قانون پاس کرانے کا اگر نہیں تو دلی جذبات حکومت تک واشگاف الفاظ میں پہنچانے کا حق تو مل گیا۔ اسی طرح بہت سی ایسی باتیں جو محض اقتدار کے نقارخانہ میں طوطی کی آواز بن کر رہ جاتی تھیں، اب حکومت کے کانوں تک پہنچنا شروع ہو گئیں۔

ملک میں انگریزی تسلط کے بعد پہلی دفعہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا اور ہندو اور مسلمان دو بالکل مختلف قومیں ہیں اور دونوں کو جداگانہ طور پر اسمبلیوں اور کونسلوں میں نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے اس لئے مسلمانوں کے لئے الگ اور ہندوؤں کے لئے الگ رائے دہندگان کی فہرستوں کے مکمل کئے جانے کا حکم دیا گیا۔ اس بات نے ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگرس کی اس منطق کو توڑ کر پاش پاش کر دیا کہ ہندوستان کے عوام متحدہ طور پر ایک ہی قوم ہیں اور انہیں مذہب واصول دین سے کوئی سیاسی دلچسپی نہیں۔ اس اصلاحی ایکٹ کے نفاذ نے مسلمانوں کو بھی احساس دلا دیا کہ انہیں الگ خطوط پر اپنی کاوشوں کو تیز تر کر دینا چاہیئے۔

چنانچہ اس کے نفاذ کے ساتھ ہی انڈین نیشنل کانگرس میں تعصب کے دھندلکے ڈھل کر

Marfat.com

واضح مخالفت کی صورت میں نمایاں ہو گئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی بنا پر تشکیل کی ہوئی سیاسی جماعت مسلم لیگ کو مستحکم کرنے کی ٹھانی اور بہت سے اکابرین ہند اس جماعت میں بلا تامل داخل ہونے لگے۔ بہت سے ایسے افراد بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے جو ابتدائی طور پر انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ منسلک تھے۔

وائسرائے کی انتظامی کونسل میں تمام تر ارکان انگریز ہوتے تھے جس کی وجہ سے اس کونسل کی تمام تر کارروائی ان کے ذاتی خیالات پر ہی مبنی ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ کونسل باشندگان ہند کے نزدیک ایک معمہ سے کم نہ تھی۔ جو کچھ بھی کرتی تھی اس کا عوام کو خاطر خواہ علم نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ ہی کوئی ایسا فرد ان میں شامل تھا۔ جو واقعی طور پر انہیں درپیش مسائل سے آگاہ کر سکتا۔ اس حقیقت کا احساس انگریز نے خود بھی کیا۔ چنانچہ اس رازداری کے پنجرے میں ایک ہندوستانی رکن بھی داخل ہوا جو اگرچہ باشندگان ہند کے مسائل سے حکومت کو براہ راست مطلع رکھنے اور انہیں کسی بہتر نتیجے تک پہنچانے کی غرض سے شامل کیا گیا تھا لیکن ہر کہ درکان نمک شد۔ اکثر دیکھا گیا کہ اس رکن کو وائسرائے کے ہی انتظامات داخلی کا مداح و معاون پایا جو ہندوستانی باشندوں کے مفادات سے زیادہ انگریزی مفادات کے تحفظ کے لئے کوشاں رہتا تھا۔

خامیاں :

اگرچہ انگریز نے اس وقت اپنی بساط سے بڑھ کر اصلاحات و رعایات کا اعلان کیا۔ لیکن ہندوستان کے عوام ان سے قطعی طور پر مطمئن نہ ہوئے کیونکہ یہ اصلاحات جن کا چرچا ۱۹۰۵ء سے لگاتار کیا جا رہا تھا، عوام کی توقعات کے مطابق قدرے زیادہ مراعات کی حامل متوقع تھیں لیکن بلی جب تھیلے سے باہر نکلی تو اس کی میاؤں نہ کسی کو متحیر کر سکی اور نہ ہی خوش کر سکی

ان اصلاحات سے تو عوامی جذبات کے احترام سے زیادہ نوکر شاہی کو اور زیادہ تقویت مل گئی۔ حکومت عوام خود اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے تھے لیکن انگریز نے اسے عوام کی بجائے افسروں کے ہاتھوں میں دے دیا۔

انگریزوں نے ان اصلاحات کے اطلاق سے یہ سمجھا کہ اس نے باشندگان ہند پر زبردست احسان کیا ہے اور اب یہاں کے لوگوں کو زیادہ جز بز نہیں ہونا چاہیئے، وہ سمجھتا تھا کہ لوگ ذہنی طور پر اس قدر پست ہو چکے ہیں کہ وہ ان اصلاحات کو غنیمت سمجھ کر اپنانے میں ایک

Marfat.com

لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن یہ اس کا خیال خام نکلا، اس کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ ہندوستان والوں نے اس ایکٹ کا چنداں مسرت و تشکر سے استقبال نہیں کیا۔ اگر کسی شخص نے انگریز کا انفرادی طور پر کوئی شکریہ ادا کر بھی دیا ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انگریز نے پورے برصغیر کے عوام کا دل موہ لیا ہے۔

ان اصلاحات میں جو چیزیں عوام کو مایوس کر رہی تھیں، ان میں سے مندرجہ ذیل بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ان اصلاحات میں بالواسطہ انتخابات کے نظام میں ابتدائی رائے دہندگان کو کونسل کے نمائندوں سے براہِ راست کوئی سابقہ نہیں پڑتا۔

۲۔ جہاں تک انتخابی حلقے متعین کرنے کا تعلق ہے، حکومت ان میں انصاف سے کام نہ لے سکی اور بعض حلقے تو مایوس کن حد تک چھوٹے بنا دیئے گئے۔

۳۔ کونسل کی تشکیل اور اس کے طرز عمل میں نمایاں فرق تھا۔ اگرچہ اس کا وجود پارلیمنٹ سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن ان دونوں میں آسمان کا فرق تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ آزاد ملک کے آزاد باشندوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے سرگرم عمل تھی لیکن ہندوستان میں تشکیل والی کونسلیں ایک غلام قوم پر قوانین تیار کر کے مسلط کرنے کے اداروں سے کم نہ تھیں۔ بالخصوص امپیریل کونسل تو بس عیاش مقننوں کا ایک قحبہ خانہ تھا۔ جس میں صرف ایک انداز فکر کارفرما تھا۔ کہ ہندوستان کے باشندوں کو غلام رکھا جانے میں کون سی تدابیر زیادہ مؤثر ہوں گی اور اس انداز سے کون سا قانون مسلط کیا جا سکتا ہے جس سے بظاہر ہندوستان کے عوام کے لئے بہتری پائی جاتی ہو لیکن حقیقت میں وہ فرنگی حکومت کے تسلط کی استواری کا موجب ہو۔

حقیقت میں لارڈ منٹو اور لارڈ مارلے دونوں اس بات کے بنیادی طور پر مخالف تھے کہ ہندوستان میں برطانوی طرز کے اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتے اور وہ اس امر کا اعتراف بارہا اعلانیہ کر بھی چکے تھے۔

ان اصلاحات سے اگرچہ دستاویزی لحاظ سے پارلیمانی نظام کا لالچ دیا گیا تھا۔ لیکن حقیقت میں لوگ عجیب و غریب مخمصے میں پھنس گئے تھے۔ اس لئے کہ اصلاحات تو پارلیمانی طرز کی تھیں لیکن ذمہ داری کے لحاظ سے کسی کو کچھ بھی میسر نہ آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں عوام

Marfat.com

کو صرف بہلایا گیا تھا اور صرف بچوں کے کھیل کی طرح عوام کو نمونے کے پارلیمانی نظام کی ریہرسل کرنے میں مصروف کر دیا گیا تھا ان پارلیمانی اداروں کا کیا فائدہ تھا جو نہ تو خود با اختیار تھے اور نہ ہی وہ حکومت سے کوئی بات منوا سکتے تھے اور حکومت جس پر انگریز کا ہر طرح کا تسلط تھا، کسی صورت بھی کوئی ایسا قانون پاس کرنے کے حق میں نہ تھی جو انگریزی مفادات کے ذرہ بھر بھی خلاف جاتا ہو کیونکہ مختلف کونسلوں میں نامزد ارکان کی تعداد زیادہ تھی۔ امپیریل کونسل میں انگریزوں کی غالب اکثریت تھی اور صرف ایک نمائندے کو گھن چکر بنانے کے لئے کونسل کے ذریم میں جڑ دیا گیا۔ اس کی حیثیت سوائے "لابہ گیر" کے اور کوئی ہو سکتی ہی نہیں تھی جب انگریز کی توجہ ان باتوں کی طرف دلائی گئی تو اس نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ کہ ابھی ہندوستان کے لوگوں میں حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہلیت پختہ نہیں ہوئی۔

ان اصلاحات کا فائدہ محض وقتی نوعیت کا تھا۔ لوگ کچھ دیر تو اس کے متعلق سوچتے رہے لیکن جلد ہی ملک میں شور و غوغا برپا ہو گیا۔ چاروں طرف شورشوں کا بازار گرم ہوا اور زیادہ تر ہندوؤں نے اس کے خلاف بہت چرچا کیا۔ ہندوؤں کے زیادہ پریشان ہونے کی دو وجوہات تھیں۔

ایک یہ کہ — بنگال تقسیم ہو کر اس تخصیص کی تصدیق کر گیا تھا کہ مسلمان علیحدہ قوم ہیں اور وہ کسی صورت بھی ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔

دوسرے وہ اس وقت زیادہ مشتعل ہوئے۔ جب انہی اصلاحات کے تحت مسلمانوں کو جداگانہ طور پر الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی اور جس سے بالآخر مسلم لیگ کو تقویت ملی۔

اس سلسلے میں سید حسن ریاض کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوتا ہے جو انہوں نے ہسٹری آف دی انڈین نیشنل کانگرس از سیتا رامیا کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کتاب "پاکستان ناگزیر تھا" میں درج کیا ہے کہ:

"منٹو مارلے اسکیم اصلاحات کی نئی قسط ضرور تھی۔ لیکن اس سے ہندوستان کے سیاسی مرتبے اور اختیار میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ کانگرس کے لیڈروں نے پھر بھی حکومت برطانیہ کی تعریفیں کیں اور کانگرس نے اپنے ۱۹۱۰ء کے جلاس

Marfat.com

ہیں جس کے صدر مسٹر ویڈربرن تھے، ایک ریزولیوشن میں یہ فیصلہ کیا، کہ گورنر جنرل کی خدمت میں اظہار تشکر گزاری کے لئے ایڈریس پیش کرے ہندو ناخوش صرف اس بات پر تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ بڑی رعایت اور ان کی بڑی طرف داری کی گئی ہے۔ منٹو مارلے اسکیم میں یقیناً مسلمانوں کی جداگانہ انتخاب کا حق تو ملا جس سے اس کی ضمانت ہوگئی کہ معینہ تعداد کے اندر مسلمانوں کے نمائندے مسلمان ہی ہوں گے اور وہی مسلمان جن پر مسلمانوں کو اعتماد ہو۔ نہ ہندو مسلمانوں کا حق نیابت غصب کر سکیں گے اور نہ ایسے مسلمان منتخب ہو سکیں گے جو کونسل کی نشست کے لئے مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا ہندوؤں کے ہاتھوں سودا کر سکیں لیکن تمام صوبوں کی کونسلوں میں سیاسی اہمیت کی بناء پر اضافی نشستیں تو کجا مسلمانوں کو اتنی نشستیں بھی نہیں دی گئی جتنی بر بنائے تناسب آبادی ان کو ملنی چاہیئے تھیں۔

Marfat.com

تنسیخ تقسیم بنگال
۱۹۱۱ء

سوال:۔ کن حالات میں بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی گئی اور اس سے کیا اثرات وقوع پذیر ہوئے۔ تفصیل سے بیان کیجیے؟

جواب: اس حقیقت میں تو کوئی شک نہیں کہ انگریز اور ہندو کی ملی بھگت بالکل اس دن سے چلی آ رہی ہے۔ جب اس فرنگی نژاد نے سرزمین ہندوستان پر پہلا قدم رکھا تھا۔ انگریز نے بہت سے ہندوؤں کے سہارے مغلیہ دربار کے سرکردہ افراد تک رسائی حاصل کر کے مغلیہ بادشاہ کے حضور باریابی حاصل کی تھی اور شاید اس ذریعہ باریابی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اور اس کو نشان منزل تصور کرنے کے صلے میں انگریز نے ہندو کو اپنا بہترین دوست تصور کیا اور کرتا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے سامنے فرنگی اس وقت تو نہ ٹھہر سکا۔ کیونکہ اس وقت اسے پاؤں پر کھڑا رہنے کے لیے سب سے اہم اور لازمی سہارا مسلمانوں کی حمایت کا حصول ہی تھا جو محض اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کیا جاتا اس ابن الوقت فرنگی نے اپنے وقار کی گرتی ہوئی دیوار کو ڈھارس دینے کے لیے مسلمانوں کے مطالبات کو مان لیا اور ان کے کہنے کے مطابق ۱۹۰۵ء میں بنگال کو تقسیم کر دیا۔

بنگال کی تقسیم دراصل ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے وقار کے منہ پر زبردست تھپڑ کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کا درد اور سرخی کو وہ دیر تک محسوس کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں میں نہ صرف ذہنی حسد اور حزن کی آگ بھڑکی بلکہ ان کی پوری قوم میں باقاعدہ ایک تحریک پیدا ہو گئی۔ جو بیک وقت موجودہ حاکم قوم انگریز اور سابق حاکم قوم مسلمان کے خلاف چلائی گئی۔ ہندوؤں نے اس تحریک کو نہایت دہشت گردی کے مظاہرے سے شروع کیا اور رہا بجا ہنگاموں کا بازار گرم کیا۔ بجائے پرامن مظاہروں کے انہوں نے جگہ جگہ فسادات کرانے اور مختلف علاقوں میں گڑبڑ پیدا کرنے کے لیے مختلف غنڈوں کو متعین کیا۔ ان ہندو غنڈوں نے سرکاری افسروں کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی دہشت زدہ اور ہراساں کرنا شروع کیا۔ اس سے انگریز کو اپنی بیا[illegible]ت پر ندامت

Marfat.com

محسوس ہونے لگی۔ لیکن کیا کر سکتا تھا۔ ایک طرف اکثریت کا معاملہ تھا۔ دوسری طرف ملی بھگت کا بھانڈہ پھوٹنا تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں لارڈ ہارڈنگ نے ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا تھا۔ یہ شخص اگرچہ سفارتی آداب سے ناواقف تھا۔ اور اس کو انتظامی معاملوں میں بھی چنداں تجربہ حاصل نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ اہل ہند سے ہمدردانہ جذبات کا حامل تھا۔ اس کا وائسرائے ہونا محض خاندانی برتری تھی۔ اس کا دادا لارڈ ہارڈنگ ہندوستان ہی میں سکھوں کے خلاف جنگ میں نبرد آزما ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے نرم رویے کی بنا پر ہندوؤں نے بہت سا ناجائز فائدہ اٹھایا۔

لارڈ ہارڈنگ اگرچہ ایک کمزور وائسرائے تھا۔ لیکن اس سے قبل ہی ہندوستان کے ہندو اس قدر دریدہ دہن ہو چکے تھے کہ اپنے پریس کے ذریعے اپنے ناپاک عزائم کا اظہار کر چکے تھے۔ کلکتہ کے اخبار "جوگنتر" نے اپنی ۳۰ مئی سنہ ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں ایک زبردست زہر آلود اداریہ لکھا جس میں بیان کیا گیا کہ "ماتا پیاسی ہے اور اپنے بیٹوں کو بتا رہی ہے کہ کون سی واحد چیز اس کی پیاس کو بجھا سکتی ہے۔ انسانی خون اور کٹے ہوئے سروں سے کم کوئی چیز اس کو مطمئن نہ کر سکے گی۔ بنا بریں اس کے بیٹوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی ماتا کی پوجا کریں اور ان چیزوں کو ان کی بھینٹ چڑھائیں۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی نہیں ہچکچانا چاہیئے۔ جس روز ماتا کی پوجا ہر گاؤں میں اس انداز سے کی جائے گی۔ اس روز سے ہندوستان کے لوگ آسمانی روحوں سے سرشار ہو جائیں گے اور آزادی کا تاج ان کے ہاتھوں میں آن گرے گا۔

اس قسم کی اخباری اشتعال انگیزیوں نے ہندوؤں میں تقسیم بنگال کے خلاف مذہبی رنگ میں زہر بھرنا شروع کر دیا۔ اور اس تحریک کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لیے عملی دہشت گردیاں شروع کر دیں ہندو لوگوں میں اشتعال کی شدت کا یہ عالم ہوا کہ انہوں نے بنگال کے گورنر پہ چار مرتبہ قاتلانہ حملہ کرنے سے گریز نہ کیا۔ لارڈ منٹو کو بھی قتل کرنے کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پر بم پھینکا گیا۔ کئی انگریز عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور کئی فرنگیوں کو زخمی کر دیا گیا۔ لندن میں لارڈ مارلے جو ہندوستان کے معاملات کا مرکزی وزیر تھا اس پولیٹیکل سیکرٹری کو قتل کر دیا گیا۔ مسٹر تلک اور سر سریندر ناتھ بینرجی نے کالی دیوی کے مندر میں جا کر دیگر ہندوؤں کے ہمراہ ہر اس شخص کے خلاف عملی جنگ لڑنے کی قسم کھائی۔ جو اس کی حمایت کرتے تھے۔ مسلمانوں سے ٹکر لینے کے لیے انہوں نے گئو ماتا کی حفاظت کا نعرہ بلند کیا۔ اور مسلمانوں کو زچ کرنے کے لیے مساجد اور دیگر عبادت گاہوں کے سامنے گانا بجانا شروع کر دیا۔ "بندے ماترم" کو قومی ترانے کا درجہ دے کر مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست مہم کا آغاز کیا گیا۔ ہندو اس وقت ملک میں سوائے ہندو کے دوسرے کسی سے تعاون کرنے کو تیار نہ تھا اس کے سامنے

Marfat.com

صرف ایک مسئلہ تھا جس کو اس نے سیاسی و ذاتی اور مذہبی مسئلہ بنا لیا تھا وہ تقسیم بنگال کے حکم کی واپسی تھا حالات کی دن بدن ابتری کو دیکھ کر وائسرائے ہند نے بظاہر بہت سے حفاظتی اور انتظامی نوعیت کے فرامین جاری کئے لیکن اس کے باوجود وہ کنٹرول نہ کر سکا انگریزوں نے اس سلسلے میں جو احکام جاری کئے۔ اگرچہ انتظامی اعتبار سے وہ کسی حد تک سخت تھے لیکن یہاں یہ ماننا پڑے گا کہ ان احکام کے اطلاق میں انگریز نے دیدہ دانستہ کمزوری سے کام لیا۔ حالانکہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ انگریز جس نے کچھ سال پیشتر ایک زبردست بغاوت کو فرو کر کے ایک ایسی مستحکم حکومت قائم کر لی تھی جس میں "جدید رعایا" کو کسی مسئلہ پر محض ایک درخواست کا موقع دیئے جانے کو بھی غنیمت شمار کیا جانے لگا یہ کیسے ممکن تھا کہ اس قدر وسیع پیمانے پر ہنگامے ہونے دیئے جاتے یہ تمام زلفٹ انگریز کی اندرونی طور پر ہندو نوازی کی سازش تھی۔ جس کو اس نے مسلمانوں کے خلاف اس انداز میں ہوا دیئے جانے میں مدد دی۔ اس تحریک میں اس نے اگرچہ کچھ اپنے انگریز بھی مروائے لیکن اس میں بھی وہ مسلم کشی کے عنصر کو فروغ دے گیا۔

خود انگریز کی پراسرار ہندو نوازی کی تحریک مخالفت تقسیم بنگال کو جائز قرار دینے اور ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے کے لیے فرنگی حکمران جارج پنجم مع ملکہ میری رسم تاج پوشی منانے کے بہانے دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی پہنچے اور ۱۲ دسمبر کو ایک نہایت شاندار دربار منعقد کیا۔ اس دربار کی تزئین وافزائش شان و سطوت میں مسلمانوں نے خلوصِ دل کے ساتھ حصہ لیا۔ مسلمان اس دربار کے انعقاد میں اتنے ہی خوش تھے۔ جتنے کہ خود انگریز۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ فرنگی حکمران جوڑا کس قدر مکروہ اعلان کو جنم دینے کے لیے یہاں پہنچا ہے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو جارج پنجم کی تاجپوشی کے سلسلے میں کی جانے والی متوقع عالیشان تقریر کو سننے کے لیے مسلمان بڑے ہی خلوص و اشتیاق اور پورے انہماک کے ساتھ گوش بر آواز بیٹھے تھے۔ جارج پنجم نے اپنی اس تقریر کے دوران بالکل غیر متوقع طور پر ایک زبردست اہم اعلان کیا جس کے تحت تقسیم بنگال منسوخ قرار دے دیا گیا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کا یہ اعلان بالکل اچانک کیا گیا۔ جارج پنجم نے مزید کہا کہ ماضی میں ہندوؤں کو حکومت کے خلاف نہ تو کوئی باغیانہ کارروائی کرنی چاہیئے نہ ہی عدم تعاون کی تحریک کو جاری رکھنا چاہیئے اس اعلان سے بنگالیوں کے تمام مطالبوں کی تسکین ہو جاتی ہے اس لیے اب کسی بھی بنگالی کو ماضی میں کیے جانے والے فیصلے کو یاد بھی نہ کرنا چاہیئے۔ اس طرح انگریز کے ذہن بنگالی کہنے کا مطلب بنگالی ہندو تھا نہ کہ بنگالی مسلمان یہ اعلان نہایت قبیح انداز میں مسلم مفادات کے گلے کو دبا دینے کے مترادف تھا مسلمان قوم

Marfat.com

میں اس اعلان سے زبردست مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور اس کے برعکس ہندوؤں نے گھی کے چراغ جلائے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۰۶ء میں قائم ہونے والی مسلم لیگ کے اپنے اغراض و مقاصد میں ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں حکومت کے متعلق وفاداری کے جذبات پیدا کیے جائیں گے۔ اور بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ لیکن انگریز کے اپنے رویے نے مسلمانوں کو اپنے اغراض و مقاصد میں ترمیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ انگریز نے یہ چھری چلا کر مسلمانوں کی شاہ رگ کو کاٹ دینے کی ناکام کوشش کی مسلمانوں کے لیڈر نواب سلیم اللہ خان نے تو انگریز کے اس قدم کو نہ صرف نہایت خوفناک قرار دیا بلکہ انگریز کی منافقت کی انتہا بتایا۔ انہوں نے کہا کہ انگریز کی اس چال سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ دیدہ دانستہ مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی طور پر پچھاڑنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس قوم کو سرے سے ہی برباد کرنے کے درپے ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس حکومت پر اب ذرا احتیاط سے ہی اعتماد کرنا ہوگا اور اس کے بارے میں جو بدگمانیاں پیدا ہونے والی ہیں ان کا دور کرنا تو درکنار رہا۔ اب ان یقینی بداعمالیوں سے تحفظ کی تدابیر کو سوچنا ہوگا۔ نواب وقار الملک نے علی گڑھ گزٹ کے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۱ء کے شمارہ میں اس اعلان تنسیخِ بنگال پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح الفاظ میں تحریر کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان ان حالات کا جائزہ لیں جب وہ حکومت پر بھروسہ کرنا ترک کریں۔ اور اس کے پیدا ہونے ہوتے نتائج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار رہیں۔

اس اعلان سے مسلمانوں کو اس حقیقت کا بالوضاحت علم ہو گیا۔ کہ انہیں ہندوستان میں اب ایک قوم نہیں بلکہ دو قوموں کے ساتھ جنگ لڑنا پڑے گی۔ ایک حاکم قوم فرنگیوں کی اور دوسری لا یہ گیر اور ریڑھنے سورج کی پوجا کرنے والی قوم ہندوؤں کی۔ ان دو تو دو قالب و یک جان قوموں کے باہمی عناد کا مقابلہ مسلمانوں کو ایک مضبوط قوم ہونے کی صورت میں ڈٹ کر کرنا ہوگا۔ نواب وقار الملک نے تمام مسلمانوں ہند کو آگاہ کیا کہ انگریز اپنے عہد پر پورا نہیں اتر سکا۔ اور جان بوجھ کر مسلمانوں کو دھوکا دے گیا ہے۔ اب ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم کس حد تک اس حاکم کے ساتھ وفاشعار رہ سکتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے جب اس اعلان کو سنا تو انہوں نے نہایت متانت سے کہا کہ انگریز کا یہ اقدام بالکل غیر شریفانہ نوعیت کا ہے۔ اس نے مسلمانوں کی وفاداری کا ثمرہ ان کی تذلیل کی صورت میں دیا ہے۔ اور واضح طور پر جانبداری کا مظاہرہ کیا

Marfat.com

ہے۔ تنسیخ تقسیم بنگال کے اعلان نے جہاں مسلمانوں میں بددلی پیدا کی، وہاں ہندوؤں کے دلوں میں انگریز کے ساتھ مزید مستحکم حالات کے پیدا ہونے کے امکانات کو روشن کیا لیکن اس اعلان میں بھی انگریز نے دو رخی چال سے کام لیا۔ جارج پنجم کے اس اعلان سے اگر کسی قوم میں نفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ تو وہ ایک اقلیتی جماعت مسلمانوں کی تھی ہندوؤں کی اکثریت والی جماعت کی حمایت تو اس کو حاصل ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی پورے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہر ایک کے اپنے اپنے وقار کے مسئلے کو ہوا دینے سے بہتر بڑھ کر کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس اعلان سے ہندوؤں میں احساس برتری پیدا ہوا۔ ان میں احساس کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف احساس کہتری کے عناصر کے پیدا ہونے کے اسباب مہیا ہوئے جس سے دونوں قوموں میں انفرادی طور پر دشمنی بڑھ گئی۔ مسلمان ایک عجیب موڑ پر آن کھڑے ہوئے۔ یہ موڑ ان دونوں قوموں کو بعد میں آپس سے اس قدر دور لے گیا کہ وہ دوبارہ ایک نہ ہو سکیں۔

Marfat.com

لکھنؤ پیکٹ

۱۹۱۶ء

سوال:۔ لکھنؤ پیکٹ کن حالات کے تحت طے پایا گیا اور اس کے اہم نکات کیا تھے؟ علاوہ ازیں اس امر پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالیں کہ اس پیکٹ سے کیا اثرات پیدا ہوئے۔

جواب:۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے اچانک حکم نے برصغیر میں ایک عجیب گومگو کا عالم برپا کر دیا تھا۔ بالخصوص مسلمانوں کے لئے نہایت غیر یقینی مستقبل کا سامنا تھا۔ مسلم لیگ نے جس قسم کا نصب العین ابتداء میں تیار کیا تھا۔ اس کے نبھنے کی اب کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی چنانچہ مسلمانوں نے مل کر مسلم لیگ کے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنا شروع کیا۔ مسلمان اس حقیقت کو بالکل مُبین انداز میں سمجھ گئے تھے کہ انگریز کی پالیسی یہی ہے کہ اگر ہندوستان میں اپنے پنجے گاڑے رکھتے ہیں۔ تو یہاں کی دو عظیم قوموں مسلم اور ہندو کو آپس میں ہر وقت لڑاتے رہو۔ اور کچھ نہ کچھ ایسے اقدامات کرتے رہو جن سے کبھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا رہے اور کبھی ہندوؤں کو۔ اس طرح جب مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا تو ہندو ان سے حسد کی آگ میں جل کر مریں گے اور اگر ہندوؤں کی افادیت کو تھپکی دی گئی تو مسلمانوں کے لیے دلسوزی کا باعث ہوگا۔ جس کے نتیجے میں یہ دونوں قومیں کبھی اتحاد و اتفاق سے نہیں رہ سکیں گی اور انتظامی امور کا سہارا لے کر ان دونوں قوموں سمیت سارے ہندوستان پر حکومت کی جاتی رہے گی اس قسم کے احساسات ہندوؤں میں بھی پائے گئے۔ اور سمجھ گئے کہ انگریز کو اس بھید کا پتہ چل گیا ہے کہ گزشتہ صدی میں دیانند اور تلک جیسے مذہبی تعصب کے پرستار افراد نے ہندو مسلم منافرت کو ہوا دی تھی اور اس مذہبی منافرت سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے چنانچہ

Marfat.com

اس نے کبھی بنگال کو تقسیم کر دیا اور کبھی اس تقسیم کی تنسیخ کر دی۔ سیاست کو ان دو قوموں کے لیے ایسا کھلونا بنا دیا۔ جو صرف کھلانے والے ہی کے ہاتھ میں رہتا تھا چنانچہ انگریز کی اس سکیم کو حل کرنے کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں شروع ہوئیں اس سلسلے میں مسٹر محمد علی جناح جو اس وقت کانگرس کے ایک اہم رکن تھے میدانِ عمل میں نکلے اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے انہوں نے اپنی جذبات دونوں قوموں کے سامنے پیش کیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت تک انڈین نیشنل کانگرس کے منشور میں یا کانگرس کے دستور رکنیت میں یہ پابندی ہرگز موجود نہیں تھی کہ کوئی شخص جو انڈین نیشنل کانگرس کا رکن ہے کسی دوسری سیاسی جماعت کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتا اس قانونی آسودگی کے پیشِ نظر مسٹر محمد علی جناحؒ نے مسلم لیگ کی رکنیت بھی اختیار کر لی تھی۔

قبل ازیں مسلم لیگ کے سر برآوردہ حضرات جن میں علی گڑھ کے نواب محسن الملک سید مہدی علی شاہ پور پنجاب کے ملک عمر حیات خان ٹوانہ، لاہور کے میاں شاہ دین، میمن سنگھ بنگال کے نواب سید نواب علی چوہدری پٹنہ کے سید علی امام۔ پونہ کے مولوی رفیع الدین احمد، امرت سر کے شیخ غلام صادق، دہلی کے حکیم اجمل خان، لکھنؤ کے مولوی احتشام علی اور سید نبی اللہ بیرسٹر اور الہ آباد کے سید کرامت حسین بالخصوص قابل ذکر ہیں نے متفقہ طور پر اعلان کیا، کہ انگریز کی مخالفت اب اعلانیہ کی جانی چاہیئے۔ کیونکہ وہ انگریز کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں (یاد رہے کہ یہ تمام حضرات ۱۹۰۶ء والے شملہ وفد کے ارکان میں سے تھے جن کی سربراہی آغا خاں صاحب نے کی تھی) مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ سے ہی مسلم لیگ کا صدر مقام ڈھاکہ سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔ یہاں پہنچ کر مسلم لیگ کو نہ صرف اچھے کارندے میسر آئے بلکہ باعمل رہنما بھی ملے اور اسی جگہ مسٹر محمد علی جناح نے بھی مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔ لکھنؤ سے جاری ہونے والے مسلم لیگی بلیٹنوں میں فرنگی حکومت پر واضح نکتہ چینی کی جانے لگی اور ایک ذمہ دار حکومت جو نہ صرف مفاداتِ عامہ کا تحفظ کر سکتی بلکہ افادیت سیاست برصغیر کا پر خلوص انداز سے جائزہ لے کر منصفانہ فیصلہ کر سکنے کی جرائت رکھتی کے حصول کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کے نصب العین میں بھی ترمیم کر دی گئی ۱۹۱۲ء میں اس نئے نصب العین کے تحت طے پایا کہ۔

۱۔ مسلم لیگ ہندوستان کے لیے ذمہ دار حکومت کے حصول اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے اس وقت تک مسلسل کوشاں رہے گی تاوقتیکہ وہ اپنے ارادوں میں

Marfat.com

کامیاب نہیں ہو جاتی۔

مسلم لیگ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مفادات کے تحفظ کی بھی کوشاں رہے گی۔

۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں میں اور دوسری قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے مسلم لیگ اپنی تمام پر خلوص کوششوں اور اپنے وسائل کو بروئے کار لائے گی اور باہمی اتحاد و تعاون کی فضا استواری کے ساتھ پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔

۴۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے درمیان جذبۂ اخوت و محبت کو استوار کرنے کے لیے مسلم لیگ پورے انہماک کے ساتھ کوشش کرے گی۔

چونکہ مسلم لیگ کے اس اعلان میں خلوص و محبت کے رنگ کا امتزاج موجود تھا۔ اس لیے بہت جلد ہندوستان کی فضا میں کچھ سکون سا نمایاں ہونے لگا۔ شروع شروع میں دونوں سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا لیکن جب اس میں شامل سرکردہ افراد کی حقیقی کوششوں کا جائزہ لیا گیا تو ۱۹۱۳ء کے شروع ہوتے ہی ہندو مسلم اتحاد کے آثار دکھائی دینے لگے۔ کانگرس کے رہنماؤں نے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کرنا شروع کر دی اور اس طرح مسلم لیگ کے مقتدر افراد نے کانگرس کے جلسوں میں باہمی افہام و تفہیم کے جذبے کے پیشِ نظر جانا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ دو سال تک برابر جاری رہا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس بیک وقت بمبئی میں منعقد ہوئے۔ اس کے بعد دونوں جماعتوں نے متفقہ طور پر انگریز کے سامنے اپنا مطالبہ دہرایا کہ باشندگانِ ہندوستان کو خود مختار حکومت دی جائے اس مشترکہ مطالبے کے پیشِ نظر دونوں جماعتوں میں اتحاد کا یہ عالم ہوگیا۔ کہ دونوں جماعتوں کی مجالس عاملہ کے اجلاس الٰہ آباد کے مقام پر پنڈت موتی لال نہرو کے گھر میں منعقد ہونے لگے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو بمبئی میں دونوں جماعتوں سے یکجا ہونے والے اجلاس میں کانگرس کے صدر ایس۔ پی سنہا، مدن موہن لال گاندھی۔ مالویہ سروجنی نائیڈو۔ سریندر ناتھ بینرجی نے شرکت کی جب کہ مسٹر مظہر الحق نے خطبہ صدارت پڑھا۔ اس خطبہ کے دوران مسٹر مظہر الحق نے خدا کی حاکمیت مختلف فرقوں کی باہم رواداری اور جداگانہ انتخاب پر زور دیا۔ اگرچہ اس اجلاس میں پولیس نے خود (جو اس وقت حکومت کی ٹاؤٹ تھی) ہنگامہ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ چنداں کامیاب نہ ہوئی۔ دوسرے روز تاج محل ہوٹل میں ایک اور اجلاس بلایا گیا۔ جس میں مسٹر محمد علی جناح نے ایک قرارداد پیش کی۔ جس میں ایک کمیٹی نامزد کی گئی جو آئینی اصلاحات

Marfat.com

کے لیے ایسی تجاویز مرتب کرنے کی ذمہ دار قرار دی گئی جو کانگرس کے موقف کے قریب تر تھیں۔ اس قرارداد کی تائید مولوی فضل الحق، مولانا ابوالکلام، نواب غلام محمد مدارسی نے کی اور مسلم لیگ نے اس کو مجموعی طور پر منظور کر لیا۔ اسی نوعیت کی ایک قرارداد اسی روز کانگرس کی طرف سے بھی منظور کی گئی۔ ان دونوں قراردادوں کا مقصد دراصل یہ تھا کہ انگریز جو ایک عرصہ سے ملک میں جمہوریت کی اقدار کی افزائش کا اعلان کرتا چلا آرہا ہے۔ اس پر عمل بھی کر کے دکھائے جنگ عظیم اول کے دوران بھی انگریز نے یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا کہ اس کی جنگ محض جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے ہے اس کے حق میں ہندوستان جیسے ملک میں ایک ایسی مثال بن گیا کہ اسے لینے کے دینے پڑ گئے۔ جنگ کے دوران ہندوستان والوں نے انگریز کی اگرچہ غیر مشروط مدد کی تھی۔ لیکن اس غیر مشروط مدد کے پس منظر میں مشروط احوال ضرور تھے۔

معاہدہ: مسلم لیگ اور کانگرس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا۔ کہ دونوں جماعتوں کا کسی خاص مقام پر ایک مشترکہ اجلاس ہو۔ اور اس میں ضروری امور پر اتفاقِ رائے کو معاہدے کی صورت دے دی جائے۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادوں کے تحت بننے والی کمیٹیوں کا ایک مشترکہ اجلاس نومبر ۱۹۱۶ء کو بمقام لکھنؤ منعقد ہونا چاہیے۔ جس کی صدارت سریندر ناتھ بینرجی کریں۔ مسلم لیگ کی طرف سے سربراہی مسٹر محمد علی جناح اور راجہ صاحب محمود آباد کر رہے تھے۔ درپیش حالات کا بغور مطالعہ کیا گیا اور مختلف معاملات کی گہرائی میں جانے کے بعد فریقین نے مثبت نوعیت کے نتائج برآمد کیے۔ چنانچہ خاصی تفصیلی بحث کے بعد دونوں جماعتوں نے بہت سے اہم نکات پر اتفاق رائے کیا اور اس اتفاق رائے کو فریقین نے آئینی طور پر تسلیم کر کے ایک معاہدے کا نام دے دیا۔ جس کا نام "میثاقِ لکھنؤ" رکھا گیا۔ اس معاہدے کے تحت مندرجہ ذیل امور کو جزو معاہدہ بنایا گیا۔

۱۔ مسلمانوں کو صوبائی کونسلوں میں جداگانہ انتخاب کے ذریعے مختلف صوبوں میں اس تناسب سے نمائندگی حاصل ہوگی۔

۲۔ پنجاب میں ۵۰ فیصد، بنگال میں ۴۰ فیصد، یوپی میں ۳۰ فیصد، بہار میں ۲۵ فیصد مدارس میں ۱۵ فیصد، سی پی میں ۱۵ فیصد، بمبئی میں ⅓ فیصد متناسب نمائندگی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ایک شرط یہ بھی عاید کی گئی کہ مسلمانوں کو اپنے مخصوص حلقوں کے علاوہ کسی اور حلقے سے انتخاب لڑنے کا حق نہیں ہوگا۔

Marfat.com

۳ ۔ مرکزی کونسل میں مسلمانوں کو ⅓ نمائندگی حاصل ہوگی۔

۴ ۔ کسی ایسے پرائیویٹ بل پر غور نہیں کیا جائے گا جسے اس خاص قوم کے رکن جس سے مسودہ قانون متعلق ہوگا۔ ¾ کی اکثریت سے مسترد کردیں۔

تبصرہ وتنقید :۔ اس معاہدے کے تحت جو سب سے اہم بات تسلیم کی گئی۔ وہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے آئینی نقطہ نظر سے اور جمہوری اندازِ فکر سے مسلمانوں کو باقاعدہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔ ہندوستان میں منافرت کی دیوار زیادہ بلند ہونے سے رک گئی اور امنِ عامہ کو کسی حد تک تقویت حاصل ہوئی۔ انگریزوں کے پروگرام میں کچھ خلل رونما ہوا اور اب انہیں نئی تدابیر سوچنے کے لئے آپس میں سر جوڑنا پڑے۔

لکھنؤ پیکٹ پر سید حسن ریاض تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو چیز مشترکہ ہندوستان کی تاریخ میں لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے وہ یہی مشترکہ اسکیم تھی۔ بیشک لکھنؤ پیکٹ مسٹر جناح کی معاملہ فہمی، الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت اور بدگمان فریقوں کے درمیان افہام وتفہیم کی قابلیت کا ایسا شاہکار ہے۔ کہ جو ایک ہی دفعہ ظہور میں آسکا۔ لیکن چودھری خلیق الزمان صاحب نے اس کو سیاست میں مسلمانوں کی ناتجربہ کاری پر محمول کیا ہے کہ انہوں نے اس وقت تعداد آبادی کی بنا پر نیابت کا فیصلہ نہ کیا۔ اور وہ بنگال میں ۴۰ فیصد، اور پنجاب میں ۵۰ فیصد نیابت پر رضامند ہوگئے، اور ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ انہوں نے پاسنگ کے طور پر اضافی نشستیں حاصل کرلیں۔

اگر بنظرِ غائر اس معاہدے کا مطالعہ کیا جائے۔ تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس کی توثیق میں قدرے عجلت سے کام لیا۔ کیونکہ انہوں نے جلد از جلد اتحاد بحال کرنے کی کوشش تو کی۔ لیکن اس کے دُور رس نتائج پر چنداں توجہ نہ کی مسلمانوں کے لیڈروں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ بالخصوص وہ لیڈر صاحبان جن کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ کہ ہندوؤں میں بعض عناصر ایسے بھی ہیں۔ جو کبھی کسی صورت میں اعتدال پسندی سے کام نہیں لے سکتے۔ ان کی فطرت میں انتشار پسندی پائی جاتی ہے اور وہ کسی صورت بھی ہندو مسلم اتحاد کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ دور رس نگاہوں والے افراد کی اس اجلاس میں عدم موجودگی بعد میں عدم تعاون کا موجب بنی علی برادران یعنی مولانا شوکت علی و مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور مولانا حسرت موہانی جیسے عظیم مسلم لیگی رہنما اس وقت جیل میں تھے۔ جب کہ اس معاہدے

Marfat.com

کی توثیق کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر محمد علی جناح کے خلوص میں کوئی فرق نہیں تھا۔ تا ہم کچھ عجلت ہوئی اس وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس معاہدے کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلنے لگیں اور علی برادران نے تو کھل کر اس کی مخالفت کرنا شروع کر دی ان کے خیال میں مسلم لیگ نشستوں کے حصول میں تعداد کے لحاظ سے بہت کم نشستوں کے لیے آمادہ ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس کو اس سے کہیں زیادہ مل سکتی تھیں۔ دوسری طرف ہندو مہاسبھا کا زور تھا ہندو مہاسبھا تو کسی صورت بھی اس اتحاد کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ہندو مہاسبھا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگرس کے درمیان طے پانے والا یہ معاہدہ ہندوستان کے تمام ہندوؤں کے لئے قابل قبول نہیں۔ تاہم اس تمام مخالفت کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کی وجہ سے امن عامہ بہت حد تک درست رہا۔ اور ہندو مسلمانوں کے اور مسلمان ہندوؤں کے مختلف سیاسی جلسوں میں بلا جھجک آتے جاتے رہے اور ۱۹۲۱ء تک یہ فضا قائم رہی۔

Marfat.com

رولٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء
اور
حادثہ جلیانوالہ باغ

سوال:۔ رولٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء کے نفاذ کا اصل مقصد کیا تھا اور یہ کس حد تک کامیاب رہا، اس ایکٹ کے ردِ عمل کے طور پر ہندوستان میں سیاست نے کیا رخ اختیار کیا، اور کون سے اہم واقعات رونما ہوئے تفصیل سے بیان کیجیے۔

جواب:۔ انگریز کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ ہندوستان میں اپنے پاؤں مضبوط جمانے کے لیے یہاں کے عوام پر ایسی پابندیاں نافذ رکھی جائیں جن کے تحت یہ لوگ نہ تو سر اٹھا سکیں اور نہ ہی حکومت کی بازیابی کی خواہش ان میں پیدا ہو۔ لیکن وہ اس قسم کی سوچ میں مبتلا ہو کر سوائے دیوانگی کے مظاہرے کے اور کچھ نہ کر سکا۔ جس سے اس کو نہایت تلخ تجربات ہوئے اور اس کا یہ خیال کہ ہندوستان کے باشندوں کو شدید نوعیت کے قوانین کے ذریعے دبا لیا جائے گا خام ثابت ہوا۔ بلکہ اس کو بدترین نوعیت کے جوابی حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔

جنگ عظیم اول کے دوران جہاں اس بے وفا اور بد طینت فرنگی نسل نے ہندوستانی عوام کے خون کو بے دریغ بہا کر دنیا کے مختلف حصوں میں ضائع کرایا۔ جہاں اس نے مسلمان کے مقابلے میں مسلمان کو نبرد آزما کرایا اور جہاں اس نے اپنے حکم سے متعدد ناجائز امور کی تکمیل کرائی وہاں زبانی طور پر اس امر کی یقین دہانی بھی کرائی کہ وہ ہندوستانی عوام سے خوش ہو کر انہیں نعمت آزادی بشکل جمہوری طرزِ حکومت بخشے گا لیکن اس کے قول و فعل میں زمین و آسمان کا تضاد پایا جاتا تھا۔ جمہوری اقدار کی تردیج کی لالچ محض اس لیئے دی جا رہی تھی کہ دنیا کی نظروں میں کچھ ستائش حاصل کر سکے۔ اور خود ہندوستانی عوام کی نگاہوں میں زیادہ ذلیل متصور نہ ہو۔

Marfat.com

رولٹ ایکٹ: حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۱۷ء میں سر سڈنی رولٹ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی جس کو حکم دیا گیا کہ وہ تحقیقات کر کے مندرجہ ذیل امور کی وجوہ بیان کرے۔

۱ ۔ ملک میں کس قدر سازشیں ہو رہی ہیں اور ان میں کون کون ملوث ہے۔

۲ ۔ ان سازشوں کی نوعیت کیا ہے۔

۳ ۔ سازشوں میں ملوث افراد کو کس طرح گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

۴ ۔ ان سازشوں کے استیصال کے لیے کیا تدابیر کی جاسکتی ہیں۔

۵ ۔ سازشوں میں ملوث افراد کو کیا سزائیں دی جاسکتی ہیں۔

(آزادی خواہ اور انقلاب پسند لوگ انگریز کے نزدیک سازشی تھے)

حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت کے خلاف کسی قسم کی ایجی ٹیشن یا تحریک کو دبانے کے لیے پہلے ہی سے بہت سے قوانین موجود اور نافذالعمل تھے مثلاً بنگال ریگولیشن ایکٹ نمبر ۳ ۱۸۱۸ء مدارس ریگولیشن ایکٹ نمبر ۲ ۱۸۲۷ء بمبئی ریگولیشن ایکٹ نمبر ۲۵ ۱۹۰۷ء، سٹیٹ پریزنرز (PRISNORS) ایکٹ ۱۸۵۰ء اور ایڈیشن ڈیفنس ایکٹ ۱۹۱۵ء جو پورے ہندوستان میں نافذالعمل تھا لیکن ان تمام کے ہوتے ہوئے بھی حکومت کی کوئی تسلی نہ ہوتی تھی اور اس کو ہندوستانیوں کی آزادی پسندی کے جذبے سے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا۔

دورانِ جنگ عظیم اول انگریز نے یہاں سے اربوں روپے جنگی فنڈ میں حاصل کیے۔ لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانی باشندے دنیا کے مختلف محاذوں پر حرام موت کے منہ میں دھکیل دیے پنجاب سے بالخصوص جبری بھرتی بھی کی گئی۔ جس کے صلے میں حکومت ہند نے ہندوستان کو (DOMINIONSTATUS) نوآبادیاتی درجہ دینے کا اشارہ بھی کیا۔ لیکن اس کے باوجود جب وقت آیا۔ تو انہیں مشکوک نگاہوں سے ہی دیکھا گیا۔ حیرت ہے کہ انگریز ہندوستانیوں سے اور کس نوعیت کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ جس سے وہ یہ جان سکتا کہ ہندوستانیوں میں خلوص کا جذبہ موجود ہے یا نہیں۔ بدقسمتی سے جو ایکٹ ان کے لیے تیار کیا گیا وہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی صورت میں ہمارے سامنے آیا اس کی کیا اہمیت تھی اس پر گزشتہ صفحات میں روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ تاہم یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انگریز چونکہ خود نیک نیت نہیں تھا اس لیے اسے ہندوستانیوں میں بھی اپنا عکس نظر آیا۔ اور کسی بھی وقت ابھرنے والی تحریکوں کو دبانے کے لیے اس نے ایک مسودہ قانون تیار کیا جس کے اہم ترین نکات مندرجہ ذیل تھے۔

۱ ۔ کسی بھی ہندوستانی کو بغیر وجہ بتلائے گرفتار کیا جاسکتا تھا۔

Marfat.com

۲ - استغاثہ ملزم پر سے الزام ثابت کرنے کا پابند نہیں تھا۔

۳ - الزام استغاثے کی طرف سے عائد کیا جاتا تھا اور اس کی سزا بھی بغیر ثبوت کے دی جاسکتی تھی۔

۴ - کسی کو بغیر جرم کا ارتکاب کئے صرف مخبری یا شہرت بد کے الزام میں گرفتار کر کے سزا دی جاسکتی تھی۔

۵ - اس طرح گرفتار ہونے والے ملزم کو کسی شہادت کے بغیر سزا دی جاسکتی تھی۔

۶ - اس طرح گرفتار ہونے والے ملزمان کے مقدمات کی سماعت بند کمرے میں ہوتی تھی۔

۷ - اس قانون کے تحت سزا پانے والے شخص کو اپیل کرنے کا حق نہیں تھا۔

اس قسم کی باتوں پر مشتمل کمیٹی کی رپورٹ فروری ۱۹۱۹ء میں دو مسودات قانون کی صورت میں اسمبلی میں پیش کر دی گئی اور یہ مسودات انڈین کریمنل لاء (ترمیمی بل نمبر ۱) ۱۹۱۹ء اور کریمنل (ایمرجنسی پاورز) بل نمبر ۲ ۱۹۱۹ء کہلائے۔ ظاہر ہے کہ دونوں بل اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت جابرانہ بل تھے حالانکہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد ان کی قطعی کوئی ضرورت نہ رہی تھی۔ ان بلوں کے اسمبلی میں پہنچتے ہی ملک بھر میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ سارے ہندوستان میں غم و غصہ، احتجاج و ملامت، برہمی و بیزاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اس بل کو ہرگز پاس نہ ہونے دیں کیونکہ اس سے ہندوستانیوں کے نہ صرف کردار پر شک گذرتا ہے بلکہ ان کی ماضی میں دی گئی تمام قربانیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح نے اس وقت ایک نہایت پر مغز اور مدلل تقریر کی جس میں انہوں نے فرمایا۔

"مجرمانہ سیاسی سازش کا مسئلہ رولٹ کمیٹی نے اس طرح اٹھایا ہے جیسے کچھ جرائم پیشہ قبائل ہم میں دفعتہ نمودار ہو گئے ہیں۔ اور اب ضروری ہے کہ ایک قانون بنا کر ان کا صفایا اور قلع قمع کیا جائے۔ لیکن قانون بنا نا مرض کا علاج نہیں نہیں یعنی حکومت کو اپنی پالیسی تبدیل کرنا چاہیے یہ مجرمانہ سازشیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اس کمیٹی نے ایسی سفارشات قبول کی ہیں جنہیں کوئی مہذب حکومت قبول نہیں کر سکتی اور ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی ------

----- اگر تم نے اسے قانون کی شکل دے دی تو سارے ملک میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک آگ لگ جائے گی۔"

مسٹر گاندھی نے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پڑھنے کے بعد اعلان کیا کہ اگر حکومت اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ وہ اس قسم کے ناقص اور ظلم و تشدد پر مبنی قانون کو رائج کرے تو کانگرس کی طرف سے اعلان کیا

Marfat.com

جاتا ہے کہ مجوزہ قانون کے ناقص اور ظلم وستیہ گرہ کی جائے گی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک عہد نامہ بھی تیار کیا جس کا مطلب کچھ یوں تھا: "میں فلاں فلاں ستیہ گرھی عہد کرتا ہوں کہ اگر یہ مسودات قانون اسمبلی میں منظور ہو گئے تو جب تک یہ واپس نہ لے لئے جائیں اس وقت تک ان تمام قوانین کی پابندی سے انکار کردوں گا جن کو بعد میں قائم ہونے والی ستیہ گری کمیٹی مناسب خیال کرے گی چنانچہ ۲۴ فروری ۱۹۱۹ء کو احمد آباد کے مقام پر ایک جلسہ عام منعقد ہوا اور اس میں اس عہدنامے پر ہزاروں ہندوؤں نے دستخط ثبت کیے۔

اس وقت ہندوستان میں مسٹر گاندھی اور مسٹر محمد علی جناح سب سے زیادہ سربرآوردہ لیڈر تھے لیکن ان دونوں لیڈروں کے انتباہ کا حکومت پر قطعی طور پر کوئی اثر نہ ہوا اور عوام کی طرف سے دھمکیوں کے باوجود اور لیڈروں کے احتجاج کے باوجود ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو یہ مسودات قانون باقاعدہ ایکٹ بن گئے اور انڈین کریمنل لاء (امینڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۱۹ء اور دی کریمنل (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ ۱۹۱۹ء کہلائے ۲۳ غیر سرکاری ارکان میں سے ۲۲ ارکان نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیا اور صرف ایک غیر سرکاری رکن سر سنگرن نائر نے جو وائسرائے کی انتظامی کونسل کا رکن تھا۔ بحالت مجبوری اس کی حمایت میں ووٹ دیا۔

اس ایکٹ کا پاس ہونا تھا کہ ہندوستان بھر میں غم وغصہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا چاروں طرف انگریز کے خلاف نفرت اور اس کی بدفطرتی کے خلاف نعرے بلند ہوئے۔ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور دیگر سرکردہ افراد نے حکومت پر لعن طعن شروع کی اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ہندوستان بھر میں ایک تحریک کا آغاز ہوا۔ جسے ستیہ گرہی تحریک کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کے تحت ملک بھر میں ہڑتالوں کا دور شروع ہوا۔ حکومت کے ساتھ عدم تعاون کے جذبات عام ہوئے ادھر مسٹر محمد علی جناح نے جب اپنی آواز میں اتنا زور بھی نہ پایا جس سے وہ حکومت کو ایک راست قدم بنانے کے لیے مثبت نتائج برآمد کر سکتے۔ تو انہوں نے وائسرائے کی انتظامی کونسل سے استعفیٰ دے دیا اور چیمسفورڈ وائسرائے ہند کے نام ایک نہایت بے باکانہ خط لکھا۔ جس کا متن حسب ذیل ہے۔

مالابار ہل

بمبئی ۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء یور ایکسی لینسی

رولٹ ایکٹ کی منظوری اور اس پر آپ کی مہر تصدیق نے عوام کو برطانوی انصاف سے برگشتہ کر دیا ہے۔ انصاف اور معدلت کے بنیادی اصولوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا ہے اور قوم کے

Marfat.com

کے دستوری و آئینی حقوق کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا میں آپ کے اس فیصلے اور آپ کی حکومت کے اس روش کے خلاف احتجاج اور اظہار برہمی کے طور پر امپریل کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ ان حالات میں کوئی خوددار آدمی حکومت سے تعاون نہیں کر سکتا۔ ایسی حکومت جو ایوان آئین ساز میں قوم کے منتخب شدہ نمایندوں کی آواز کو ٹھکرا دیتی ہو۔"

آپ کا مخلص

ایم اے جناح

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس قانون کے بارے میں اپنی سوانح حیات "میری کہانی" میں ان خیالات کا اظہار کیا۔

"یہ قانون نافذ تو ہو گیا لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے اس کی میعاد کے تین برس میں ایک مرتبہ بھی اس سے کام نہیں لیا گیا۔ حالانکہ تین سال کا زمانہ امن وسکون سے نہ گذرا تھا۔ بلکہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سب سے زیادہ شورش کا زمانہ تھا۔ غرض حکومت نے عام مخالفت کے باوجود ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جس سے اس نے کبھی کوئی کام نہ لیا اور خواہ مخواہ چھیڑ کر شورش پیدا کی۔ اگر یہ خیال ہو تو بے جا نہیں کہ شاید قانون کا مقصد ہی ہنگامہ پیدا کرنا تھا۔

ہڑتالیں اور مظاہرے:- رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء بروز اتوار ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز کیا جائے گا۔ لیکن بعد میں یہ تاریخ بدل کر ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو دی گئی۔ جب سے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں زوردار ہڑتالیں شروع ہوئیں۔ جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام ہوا۔ لاہور میں دونو اتواروں کو زبردست ہڑتال کی گئی۔ پُرامن جلوس نکالے گئے۔ ۹ اپریل ۱۹۱۹ء ہندوؤں کا تہوار "رام نومی" تھا۔ اس تہوار کو ہندوؤں نے مذہبی رنگ سے کم اور سیاسی رنگ میں زیادہ منایا۔ اس تہوار میں مسلمان بھی شریک ہوئے اور شری رامچندر جی کی "جے" "گاندھی جی کی جے" اور ہندو مسلم اتحاد کی "جے" کے نعرے لگاتے ہوئے انگریز کے خلاف مظاہرہ کیا۔ انگریز ان مظاہروں کو اپنی بے عزتی تصور کر رہا تھا۔ اس کو سب سے زیادہ تکلیف اس امر کی تھی کہ ہندو اور مسلمان یکجا کیوں ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے انگریز کی اس دکھی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے رام نومی کے تہوار کے روز ایک ہی برتن میں دونوں مذاہب کے لوگوں نے حلوہ اور پوڑیاں کھائیں۔

بمبئی میں یوم ستیہ گرہ منا کر ۹ اپریل کو مہاتما گاندھی دہلی اور پنجاب کے لئے روانہ ہو گئے

Marfat.com

لیکن گورنر پنجاب کے حکم پر پلول ضلع گوڑگاؤں کے اسٹیشن پر انہیں روک دیا گیا اور انہیں پنجاب میں داخل نہ ہونے کا حکم سنایا گیا۔ مسٹر گاندھی نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ پولیس انہیں زبردستی حراست میں لے کر بمبئی لے گئی۔ اس واقعے سے انگریز کے خلاف اور بھی لوگوں کے جذبات مشتعل ہوئے اور ستیہ گرہ تحریک اور بھی زور پکڑ گئی۔

حادثہ جلیانوالہ باغ:۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر شہر میں ستیہ گرہ کا اعلان کیا گیا۔ اسی روز شہر میں ایک عظیم جلسہ عام ہونا قرار پایا۔ یہ اعلان سن کر ڈپٹی کمشنر امرتسر مسٹر مائلز ارونگ نے شہر کے دو سرکردہ سیاسی رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو بات چیت کے بہانے اپنے بنگلے میں بلایا۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ بنگلے کے عقبی دروازے پر انہیں گرفتار کر کے لے جانے والی ایک گاڑی کھڑی ہے جس میں مسلح پولیس گارد بھی ہے۔ یہ گاڑی اسی وقت ان دونوں کو امرتسر سے لے کر دھرم سالہ کے لیے روانہ ہو گئی لیکن فی الوقت کسی کو پتہ نہ چلا کہ دونوں رہنما کہاں گئے ہیں۔ جب کچھ وقت انتظار کرنے کے بعد یہ دونوں واپس اپنے گھروں کو نہ گئے تو ان کی گرفتاری اور نامعلوم مقام پر روانگی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح امرتسر میں پھیل گئی۔ لوگوں کے گروہ کے گروہ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی طرف احتجاج کرتے ہوئے روانہ ہوئے اور انہوں نے اپنی گرفتاریاں پیش کیں ان جلوسوں کو دیکھ کر شہر کی پولیس حرکت میں آئی۔ ریلوے کے پل پر جو شہر اور سول لائنز کے درمیان حد فاصل تھا۔ لوگوں کے گروہ جمع ہوئے یہاں پولیس کا ایک دستہ بھی آ پہنچا۔ ابھی لوگ جمع ہو رہے تھے کہ ایک خیر خواہ سرکار پولیس والے نے مجمع پر گولی چلا دی۔ اس پر لوگوں میں زبردست اشتعال پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب پولیس کے ساتھ مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور پورے جوش سے ان پر پتھراؤ کرنے لگے حالات زیادہ بگڑ گئے اور عوام اور پولیس کا باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا کوئی لیڈر رہا نہ رہنما۔ سب کو اپنی اپنی جان بچانے کی پڑ گئی۔ کچھ غنڈوں نے زیادہ جوش کا مظاہرہ کیا اور انہوں نے انگریزوں کو بھی ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ دو انگریزی بنک لوٹ لئے گئے دو انگریزوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ ایک سماجی کارکن انگریز عورت مس شرووڈ جو سائیکل پر وہاں سے گذر رہی تھی ایک ہندو غنڈے نے ڈنڈے مار مار کر بے ہوش کر دیا جس سے وہ گر پڑی۔ جسے بعد میں اس گلی کے مسلمان افراد نے اٹھا کر ابتدائی طبی امداد پہنچائی اور پھر اسے ہسپتال لے گئے مس شرووڈ چند دنوں کے بعد صحتیاب ہو کر واپس انگلستان چلی گئی۔

چونکہ حالات زیادہ بگڑ گئے اور ڈپٹی کمشنر کے کنٹرول میں نہ رہے تھے اس لئے اس نے

Marfat.com

۱۲ اپریل ۱۹۱۹ء کو جالندھر سے فوج طلب کر لی۔ اس فوج کا کمانڈر بریگیڈیر ڈائر (جو بعد میں جنرل ڈائر بن گیا) تھا۔ اسی روز لاہور کا کمشنر بھی حالات کا جائزہ لینے کے لیے امرتسر پہنچ گیا اور شہر کو فوج کے قبضے میں دیکھ کر کوتوال سے اصل حالات دریافت کرنے لگا۔ کوتوال شہر نے بے حد مبالغہ سے کام لے کر اپنی رپورٹ پیش کی کمشنر لاہور اس وقت پنجاب کے گورنر مسٹر اڈوائر مع چیف سکریٹری مسٹر ٹامسن سے بات کر کے ہی امرتسر گئے تھے اور ان سے یہ اختیار لے گئے تھے کہ فوج امن و امان بحال کرنے کے لیے جو بھی کاروائی مناسب سمجھیں کریں۔ چنانچہ مسٹر ڈائر کو امرتسر کا باقاعدہ چارج مل گیا۔ اب مسٹر ڈائر ہی اصل حکمران تھا۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو بیساکھی کے تہوار کے موقع پر امرتسر میں ایک جلسہ ہونا تھا لیکن بریگیڈیر ڈائر نے اس کے انعقاد پر پابندی لگا دی۔ اس کے باوجود بہت سے دیہاتی حالات کی نزاکت سے بے نیاز ہو کر امرتسر پہنچنا شروع ہو گئے۔ یہ جلسہ امرتسر کے مشہور علاقے جلیانوالہ باغ میں منعقد ہونا تھا۔ جلیانوالہ باغ کی جغرافیائی پوزیشن کچھ ایسی ہے، یہ ایک میدان ہے جس کے تینوں طرف اونچے اونچے مکان ہیں اور ایک طرف سے کچھ کھلا ہے۔ وہ بھی ایک تنگ سے راستے کی صورت میں لوگ بھاری تعداد میں اس میدان میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مسٹر ڈائر نے جب یہ سنا کہ بہت سے لوگ ایک جلسہ عام منعقد کرنے کی غرض سے اس باغ میں مجتمع ہو گئے ہیں وہ ڈیڑھ سو گورے اور ایک سو ہندوستانی سپاہی لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ وہ اس قدر مشتعل حالات میں وہاں پہنچا کہ اس نے نہایت بھری ہوئی آواز میں کہا "دو منٹ کے اندر مجمع منتشر ہو جائے" حالانکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ دو منٹ میں اس تنگ جگہ سے نکلنا نہ صرف دشوار تھا۔ بلکہ ناممکن تھا۔ کیونکہ تینوں طرف سے بلند عمارتوں سے گھرا ہوا وہ علاقہ ایک طرف سے فوج کے سپاہیوں کی وجہ سے مسدود تھا۔ علاوہ ازیں وہ مجمع بالکل پر امن تھا اور ان میں کوئی ایک فرد بھی مسلح نہ تھا اور نہ ہی ان کا کوئی اشتعال انگیزی کا پروگرام تھا۔ تاہم قبل ازیں کہ وہ باہر نکلنے کے لئے کوئی قدم اٹھائے مسٹر ڈائر نے مشین گن سے فائر کھلوا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس براہ راست نقیدِ مجمع پر سیدھی گولیوں کی اندھا دھند بوچھاڑ سے کیا حشر برپا ہوا ہو گا۔ فائرنگ اس وقت تک جاری رہی جب تک مشین گن سے آخری گولیاں بھی نکل گئیں۔ ایک اندازے کے مطابق سترہ سو گولیاں چلائی گئیں جس سے فی الفور چار سو سے زائد بے گناہ افراد ہلاک اور تیرہ سو سے زائد بے گناہ افراد زخمی ہو گئے۔ بریگیڈیر ڈائر کی اس بربریت نے چنگیز اور ہلاکو کے ستم کی یاد تازہ کر دی۔ مشین گن سے فائر کے بعد شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تاکہ لاشوں کو جلد از جلد

Marfat.com

ٹھکانے لگایا جا سکے اور زخمیوں کی امداد کو آنے والے شہریوں کو فوری استعمال نہ آئے اس نے زخمی افراد کو ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانا تو درکنار انہیں بعد ازاں کسی رشتہ دار کے ہاں بھی جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے جاں بلب زخمی صبح ہونے تک ہلاکت کے گڑھے میں جا گرے۔ یہ واقعہ انگریز کے زوال کی سب سے پہلی کڑی تھا۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کے دلوں میں کبھی بھی انگریز کے ساتھ خلوص و محبت کا جذبہ بحال نہ رہ سکا۔ اس واقعہ نے نہ صرف پورے امرتسر کو سکوتِ مرگ میں ڈال دیا۔ بلکہ پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی اس عظیم بربریت کی اطلاع پہنچی تو انگریز کے خلاف ملک گیر تحریک کا آغاز ہوا۔

لاہور میں زبردست ہنگامے شروع ہو گئے اور بریگیڈیر ڈائر کے خلاف مقدمہ چلانے اور واقعات کی عدالتی کھلی تحقیقات کرانے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ بمبئی، کلکتہ، احمد آباد، دہلی اور ندیا میں انگریز کی اس کالی کرتوت کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے۔ جگہ جگہ گولیاں چلائی گئیں۔ گوجرانوالہ پنجاب کے ریلوے اسٹیشن کو مظاہرین نے نذر آتش کر دیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر پورے پنجاب میں زبردست ہنگامے ہو گئے جو پولیس کے کنٹرول سے باہر تھے۔

مارشل لاء ۱۹۱۹ء

انگریز نے بجائے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے اور زیادہ مشتعل کیا۔ پورے پنجاب میں مارشل لاء کا نفاذ کر دیا گیا اور جگہ جگہ کڑی سزاؤں کی فہرست سنائی گئی۔ انگریز نے ۹ / اپریل والے واقعات کو تو اپنی ذلت تصوّر کیا لیکن ۱۳ / اپریل کو ہونے والی بربریت کا ذرا بھر بھی عرقِ ندامت نہ آنے دیا۔ اس قدر شدید ظلم کرنے کے باوجود اس کو یہ خیال کھائے جا رہا تھا کہ ۹ اپریل کو پانچ انگریز کیوں مارے گئے اور ایک عورت کی بے عزتی کیوں ہوئی۔ اس کو یہ خیال نہ رہا کہ اس کے استبداد کی گولیوں کی بوچھاڑ سے چار سو کے قریب بے گناہ افراد ہلاک ہو گئے اور ستره سو کے لگ بھگ زخمی ہو گئے۔ اپنی حکومت کے نشہ میں اس نے بریگیڈیر ڈائر کو بعد ازاں جنرل ڈائر بنا دیا۔ مارشل لاء کے احکام پوسٹروں کی صورت میں لوگوں کے گھروں کے باہر لگا دیئے اور لوگوں کو ان پوسٹروں کی حفاظت کے لیے لازماً ڈیوٹی پر مقرر کیا گیا۔ جس کسی کے گھر سے کوئی پوسٹر پھٹ جاتا اس کو سخت سزا دی جاتی۔ چودہ چودہ برس کے بچوں کو معمولی معمولی خطاؤں کی یاداشت میں ٹکٹکی پر باندھ کر کوڑے لگائے گئے۔ عورتوں اور مردوں کو اس گلی میں سے پیٹ کے بل گذرنے کا حکم دیا گیا۔ جہاں مس شرووڈ زخمی ہوئی تھی۔ بعد ازاں اس واقعہ کی عدالتی تحقیقات کرائی گئی۔ جس میں ثابت ہوا کہ پولیس نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ مکروہ کردار ادا کیا تھا۔ کوتوال امرتسر نے خواہ مخواہ جنرل ڈائر کو غلط اور اشتعال انگیز ڈائریاں پہنچا کر برانگیختہ کر دیا تھا۔ انگریزوں کو مشتعل کرنے کے لیے پولیس والے راتوں کو خود

Marfat.com

پوسٹر چھپوانے تھے اور دن کو مختلف جگہوں سے برآمد کر کے لاتے تھے جن میں انگریز کے خلاف اشتعال انگیز باتیں تحریر ہوتی تھیں۔ خصوصی عدالتوں میں متعدد بے گناہ افراد پر مقدمے چلائے گئے۔ ان میں سے ایک اندازے کے مطابق ۵۱ افراد کو سزائے موت، ۴۶ کو عمر قید، ۲۷ کو دس دس سال قید بامشقت ۷۹ کو سات سال قید بامشقت اور دس کو پانچ سال کی قید سنائی گئی۔ بقول عاشق حسین بٹالوی (اقبال کے آخری دو سال ص ۱۰۹) مارشل لاء کے تحت مختلف اہم مقامات پر ۷۴ افراد کو سزائے موت اور ۱۶ افراد کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ کیونکہ مارشل لاء میں اس سے کم سزا ہی نہیں تھی۔ تاہم بعد میں یہ سزائیں عام معافی کے تحت ختم کر دی گئیں۔

مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ۱۹۱۹ء

سوال:۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء جسے دوسرے لفظوں میں انگریز نے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا نام دیا کن حالات کے تحت تیار کی گئیں۔ اور ان کا نفاذ کس طرح ہوا، کیا یہ آئینی اصلاحات ہندوستان کے عوام کے لیے مفید بھی تھیں یا نہیں؟ پورے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر بحث کیجیے؟

پس منظر ۔۔۔۔۔۔۔

پہلی جنگ عظیم جو ستمبر ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی برطانیہ کے لیے ابتدا میں ایک اچھی خاصی مصیبت بن کر آئی۔ اگرچہ اکیلا برطانیہ ہی اس آگ میں نہیں جل رہا تھا لیکن جس قسم کے مسائل کا اس کو سامنا تھا۔ وہ یقیناً تشویشناک نوعیت کے تھے ہندوستان میں سیاسی تحریکیں موثر انداز میں سرگرم عمل تھیں۔ اور ہر ایک سیاسی پارٹی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں تھی ہندو تو ہر نوعیت کی خوشامد کے لیے تیار رہتے۔ انڈین نیشنل کانگرس کے ذریعے وہ انگریز کو مالی و جانی امداد بھی دینے کو تیار تھا چنانچہ اس نے واقعی ہندوستان کے مختلف علاقوں بالخصوص پنجاب سے مسلمان سپاہی انگریزی فوج میں ملازم کرا کے جنگ کا ایندھن بنائے۔ انگریز کو اس بات پر بہت خوشی تھی علاوہ ازیں جنگ کے دوران اس نے بار بار پروپیگنڈا کیا کہ برطانیہ ہمیشہ جمہوری اقدار کی قدر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر ملک میں یہ قدریں زیادہ سے زیادہ پروان چڑھیں۔ چنانچہ اکثر اوقات اس نے یہ بات بھی

Marfat.com

اپنے پروپیگنڈے کا جزو بنا ئی کہ جنگ کے فوراً بعد ہندوستان کو بہت سی آئینی اصلاحات سے نوازا جائے گا اور یہ نوازش اس لئے نہیں تھی کہ وہ ہندوستان کے عوام سے ان کی طرف سے مخلصانہ دی جانے والی امداد کے صلے میں تھی بلکہ اس کا پس منظر وہ سیاسی دباؤ تھا جو اس پر عوام کی جانب سے پڑ رہا تھا۔ اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جنگ کے دوران اگرچہ انگریز کی زیادہ تر توجہ جنگ کے واقعات اور نتائج کی طرف لگی رہی۔ تاہم اسے اس امر کا احساس ضرور رہا کہ ہندوستان میں سیاسی تغیر رونما ہو کر ہی رہے گا اور اندرونی طور پر اس کی کوشش یہ بھی رہی کہ اس سیاسی بیداری کو کسی نہ کسی طریقے سے ناکام بنا دیا جائے چنانچہ اس کے آئندہ طرز عمل نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ اس نے دو چہرے سجا کر ہندوستان کو اپنی صورت دکھائی۔ ایک تو رولٹ ایکٹ سنہ ۱۹۱۹ء کی صورت میں بھیانک شکل کے ساتھ اور دوسری گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے مسکراتے ہوئے منہ کے ساتھ۔ ایک ہی سال میں جاری ہونے والے دونوں قوانین ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھے۔

جنگ کے دوران کیے جانے والے پروپیگنڈا نے اہل ہندوستان کی ذہنی اور اخلاقی طور پر بہت ہمت بندھائی اور ہندوستان کا ہر فرد اب توقع کرنے لگا۔ کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی اسے آزادی کی سانس نصیب ہوگی اور اسے انگریز کے ساتھ کیے گئے پرخلوص سلوک کی جزا ضرور مل جائے گی ادھر انگریز کی محض زبانی جمہوریت نوازی اور جمہوری اقدار کی پرستش تمام ہندوستان کے کانوں کو بجز ایک مسحور کن نغمہ سنانے کے اور کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ تاہم باشندگانِ ہند انگریز کی طرف سے جاری ہونے والے کسی اہم اعلان کے ضرور منتظر تھے۔

۱۹۱۶ء میں جب "میثاق لکھنو" کے تحت ہندو مسلم اتحاد قائم ہو گیا۔ ہندوستان کی ان دونوں بڑی قوموں نے ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے اپنی اپنی جماعتوں کو سرگرم عمل شروع کر دیا تو انگریز کو سخت تشویش ہوئی۔ اس کا وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا جس سے اس نے ان دونوں کو آپس میں لڑائے رکھنے اور حکومت جاری رکھنے کا ارادہ بنا رکھا تھا۔ اس پیکٹ کے بعد انگریز کے پاس کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا۔ کہ وہ اب واقعی ایسے حالات کا جائزہ لے جس کے تحت ہندوستان کے عوام کو خوش کیا جا سکے اور ان کے شعورِ سلطنت رانی کو پامال کیا جائے۔

جہاں تک انگریز کی اپنی بدنیتی کا تعلق تھا وہ اس حقیقت سے عیاں ہوتی ہے کہ وہ انہی دنوں جب کہ باشندگان ہند پورے خلوص و اعتماد کے ساتھ انگریزوں کی مدد کے لیے جانی و مالی امداد دے رہے تھے اور اربوں روپے اس جنگ میں انہوں نے قربان کر دیے اور ہزاروں جانیں ضائع کروا ڈالیں

Marfat.com

یہاں تک کہ انگریزی فوج میں جبری بھرتی پر بھی انہوں نے کوئی اعتراض واحتجاج نہ کیا۔ اس کے باوجود برطانیہ میں بیٹھ کر انگریز یہ سوچ رہا تھا کہ ہندوستانی عوام کو کس طرح دبائے رکھا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ ملازمتوں اور نئے ٹیکسوں کے سلسلے میں حکومت پہلے ہی ایک کمیشن مقرر کر چکی تھی۔ جس نے ۱۹۱۶ء میں رپورٹ پیش کی کہ ہندوستانی افراد حکومت کے انتظامی معاملات میں کسی صورت بھی سودمند ثابت نہیں ہوسکتے۔ بلکہ وہ سرکاری عہدوں کے بالکل نااہل ہیں اور ان تمام عہدیداروں پر صرف انگریز افسر ہی کام کرسکتے ہیں۔ علاوہ میسیپوٹیمیا (حالیہ عراق اور اردن) میں ترکوں نے انگریزوں کو زبردست نقصان پہنچایا اور شکست دی۔ حالانکہ اس علاقے میں انگریز کی ستم ظریفی کا یہ عالم تھا۔ کہ مسلمان ہندوستانیوں کو اپنے ہم مذہب ترک بھائیوں کے خلاف لڑا دیا اس شکست کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے ایک کمیشن مقرر کیا جس میں اپنی رپورٹ میں ہندوستانیوں کو مورد الزام ٹھہرایا۔ اس کے علاوہ حکومت نے ہندوستان کے عوام پر بہت سی اخلاقی پابندیاں عاید کردیں۔ جس سے عوام میں آسودگی کی بجائے بددلی کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ مسٹر محمد علی جناح نے واضح طور پر حکومت کو مطلع کیا کہ اگر وہ اپنے ہتھکنڈوں سے باز نہ آئی تو عوام میں عدم تعاون کے عناصر نہ صرف کارفرما ہوجائیں گے بلکہ مخالفانہ تحریکیں شروع ہوجائیں گی۔ اس پر طرہ یہ کہ حکمران ٹولہ پابندیوں کو سخت تر کرنے کے لئے اور ہندوستانیوں کے حقوق کو پامال کرنے کے لیے رولٹ ایکٹ جیسے مکروہ قانون بنانے کی فکر میں لگ رہا تھا۔ جس کی خبر سن کر مسٹر محمد علی جناح نے وائسرائے کی انتظامی کونسل سے استعفیٰ دے دیا اور لارڈ ولنگڈن کو انہوں نے واضح الفاظ میں لکھ بھیجا کہ اگر حکومت کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ بالکل ایسا ہی رہا تو کم از کم بمبئی کی طرف سے انہیں الوداعی پارٹی نہیں ملے گی۔

ان تمام حالات نے انگریز کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کے عوام کو آئینی حقوق بخشنے کے لیے لازماً کوئی مثبت نوعیت کے اقدام اٹھائے۔ منٹو مارلے اصلاحات کے نفاذ سے ہندوستانیوں کے آئینی حقوق کی واگذاری نہیں ہوئی تھی۔ ان میں لاتعداد خامیاں تھیں۔ اس لیے عوام ان اصلاحات کو بنظر تحسین نہیں دیکھتے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ان اصلاحات نے ہندوستان کی مجالس قانون ساز بلکہ وائسرائے کی انتظامی کونسل کے دروازے بھی چند منتخب ہندوستانیوں کے لیے کھولے تھے انگریز کو اگرچہ ترکوں کے خلاف ہندوستانیوں سے بڑی زک اٹھانا پڑی تھی لیکن جب یہی فوجیں جرمنی کے خلاف لڑیں تو انہیں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل ہوئیں جس کے انعام کے سلسلے میں انگریز نے

Marfat.com

ہندوستانیوں بہت سی مراعات دینے کا اعلان بھی کر دیا۔

ہندوستان میں ایک ہوم رول لیگ قائم ہو چکی تھی اور اس نے اہل ہند کو آزادی دلانے کے لیے بڑی تن دہی سے کام شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانوی دار العوام میں وزیر امور ہند مسٹر مانٹیگو نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ "ہوم رول لیگ کے بانیوں کو سیاسی پروپیگنڈے کے فن میں کامل مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے ملک میں اشتہاروں اور پمفلٹوں کا طوفان برپا کر دیا ہے وہ اس بلند آہنگی سے بولتے ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، انہوں نے حکومت برطانیہ کو مجبور کر دیا ہے کہ ہندوستان کے متعلق زیادہ ترقی پسندانہ حکمت عملی کا اعلان کرے۔"

اس کے بعد ۱۲۔ اگست ۱۹۱۷ء کو انہوں نے سرکاری طور پر اعلان کیا کہ ہندوستانیوں کو ملکی نظم ونسق کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک کا موقع دیا جائے گا، اور تدریجاً خود مختار اداروں کو اس مقصد کے لیے نشو ونما دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ہندوستان عظیم برطانیہ کے جزو لا ینفک کی حیثیت سے ترقی کی راہیں طے کرے گا اور ایک ذمہ دار حکومت RESPONSIBLE GOVERNMENT) بن جائے گا۔

ہندوستان میں سیاسی بحران و اضطراب۔ برطانوی افسران کے جائزے اور حالات کے پیش نظر حکومت برطانیہ ایک کمیشن مقرر کرنے پر مجبور ہوئی۔ جس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ اندازہ لگائے کہ ہندوستان میں اس وقت زیادہ سے زیادہ محتاط انداز میں کیا کیا آئینی اصلاحات نافذ کی جا سکتی ہیں اور کون کون سے ایسے حقوق ہیں جن کا ہندوستانیوں کو دیا جانا از بس ضروری ہو گیا ہے۔ اس کمیشن نے ۸ جولائی ۱۹۱۸ء کو اپنی رپورٹ مکمل کر کے حکومت برطانیہ کو پیش کر دی اس رپورٹ کو مانٹیگو نے ہی تیار کیا، اور اس کے نام سے یہ رپورٹ مشہور بھی ہوئی۔

ادھر ہندوستان میں یہ بات محسوس کی جا رہی تھی کہ انگریز جب کہ تمام احوال سے اچھی طرح باخبر ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان کی دونوں سیاسی جماعتوں کے کیا متفقہ مطالبات ہیں تو اس کا اس طرح کے کمیشن مقرر کرنا سوائے وقت ضائع کرنے اور ہندوستانی عوام کو وعدوں سے بہلانے کے اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا، چنانچہ مہاتما گاندھی نے فیصلہ کیا کہ انگریز کے طرز عمل اور سیاسی طور پر خنک مزاجی کے خلاف عملاً احتجاج کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز کیا۔

اس طرز کی تحریک ہندوستان میں بالکل نئے انداز میں رواں ہوئی۔ اس کے تحت تمام بد بختی

Marfat.com

مال کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ انگریز کی تجارت کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ ایک شدید نوعیت کا قدم تھا۔ تن ڈھانپنے کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ ہندوستان کی کھڈیوں پر تیار کیا جانے والا کھدر ہی پہنا جائے اس کے بعد حکومت سے عدم تعاون کیا جائے۔ اور انگریز کو عملی طور پر احساس دلایا جائے کہ ہندوستان کے عوام اب زیادہ دیر تک لائے لیے کو برداشت نہ کر سکیں گے۔

ان جذبات کو زیادہ آگ رولیٹ ایکٹ نے دی جس کے تحت ہندوستانیوں کو فی الواقعہ مجرم قرار دیا جانا چاہا اور انہیں بلا کسی پرسش و موقع صفائی کے مستوجب سزا گردانا جانا جائز قرار دیا گیا یہ ایکٹ تو انگریز کی بدنیتی کی سب سے بڑی دلیل بن کر سامنے آیا تھا اس سے جو نتائج برآمد ہونے تھے وہ عیاں تھے۔

بالآخر جب انگریز کو اس امر کی تسلی ہو گئی کہ ہندوستان میں ہندو مسلم گٹھ جوڑ مکمل ہو گیا ہے باہمی تنازعات کو اب ہوا دینا آسان کام نہیں رہا۔ لوگوں کے سیاسی جذبات مشتعل ہو چکے ہیں۔ ان کے کیئے ہوئے وعدوں سے انحراف ناممکن ہو گیا ہے۔ دنیا کی نظروں میں برطانوی پروپیگنڈا واضح طور پر عیاں ہے جس میں جمہوری اقدار کے تحفظ و افزائش کا پرچار کیا گیا تھا تو مجبوراً ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ایک شاہی اعلان کے ذریعے مانٹیگو کی رپورٹ میں کی جانے والی سفارشات کو تسلیم کر لیا گیا اور ان سفارشات کو اصلاحات کی شکل دے کر باقاعدہ ایک قانون کی صورت میں تحفۂ برطانیہ کے طور پر ہندوستان کو کرسمس بھیجی گئی۔ ان سفارشات کو جب قانون کی شکل میں ڈھالا گیا تو اس کا نام "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء" رکھا گیا۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے جاری ہونے والی یہ ایک اہم ترین دستاویز تھی اور ہندوستان کے لیے آئینی اصلاحات کے سلسلے کی یہ چوتھی کڑی تھی سب سے پہلی کڑی ۱۸۶۱ء میں انڈین کونسلز ایکٹ کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ بعد ازاں ۱۹۰۹ء میں جمہوری اقدار کی حوصلہ افزائی کے لیے انگریز نے ہندوستانیوں پر مجبوراً مہربانی کی اور سیلف گورنمنٹ کے اداروں کو ترقی دے کر ذمہ دار حکومت (RESPONSIBLE - GOVERNMENT) کا درجہ دیا۔

ایکٹ کا دیباچہ:- گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں پہلے ہی سے مندرجہ ذیل امور کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا تاکہ ہندوستانیوں کو یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ شاید انگریز نے اپنا بستر بوریا گول کرنا شروع کر دیا ہے۔

۱۔ برٹش انڈیا حکومتِ عظیم برطانیہ کا ایک اٹوٹ انگ رہے گا۔

۲۔ ہندوستان میں "ذمہ دار حکومت" کا قیام پارلیمنٹ کی ایک اعلانیہ حکمت عملی ہے۔

Marfat.com

۳ ۔ ہندوستان میں "ذمہ دار حکومت" بتدریج قائم ہو گی ۔

۴ ۔ ذمہ دار حکومت کے قیام کے سلسلے میں مندرجہ ذیل دو باتوں کو بالخصوص مدنظر رکھا جائیگا۔

(و) نظم و نسق کی ہر شاخ میں ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ شرکت ۔

(ب) خود مختار حکومت کے اداروں کی تدریجی ترقی ۔

ایکٹ کی دفعات کے اہم نکات :۔

۱ ۔ حکومت برطانیہ کی مرکزی کابینہ میں وزیر برائے امور ہند کو ہندوستان کے خزانے سے تنخواہ ملتی تھی لیکن اس ایکٹ کی رو سے اس کو شاہی خزانے سے ہی تنخواہ حاصل کرنے کا مجاز قرار دیا گیا۔

۲ ۔ حکومت برطانیہ کے مرکزی وزیر برائے امور ہند کے بہت سے اختیارات کو لندن میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر کے سپرد کر دیا گیا جو اس ایکٹ کی رو سے بالکل نئے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ قبل ازیں یہ عہدہ وجود میں نہیں آیا تھا ۔

۳ ۔ لندن میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر کی تنخواہ برٹش انڈیا کے خزانے سے دی جانے لگی ۔

۴ ۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی کو دو ایوانوں میں بانٹ دیا گیا ۔

(و) مرکزی مجلس قانون ساز ۔

(ب) ریاستی کونسل ۔

۵ ۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں ۱۴۵ ارکان تھے جن میں ۱۰۳ منتخبہ اور ۴۲ نامزد ارکان تھے ۔

۶ ۔ ریاستی کونسل کے ۶۰ (ساٹھ) ارکان تھے جن میں سے ۳۳ منتخبہ اور ۲۷ نامزد ارکان تھے جنہیں وائسرائے خود نامزد کرتا تھا ۔

۷ ۔ مرکزی مجلس قانون ساز کی میعاد تین سال تھی ۔

۸ ۔ ریاستی کونسل کی عمر پانچ سال قرار دی گئی ۔ البتہ وائسرائے کو اس کی میعاد میں توسیع کرنے کا اختیار حاصل تھا ۔

۹ ۔ اسمبلی کے پہلے سپیکر کو نامزد کیا گیا ۔ لیکن بعد میں ارکان اسمبلی میں سے اس کا انتخاب ہونا قرار پایا۔

۱۰ ۔ شروع شروع میں کمیشن کی سفارشات کے تحت مرکزی اسمبلی کے لیے بالواسطہ طریق انتخاب

Marfat.com

کی حکمت عملی کو اختیار کیا گیا لیکن آخر کار دونوں اداروں کے لیے براہ راست انتخاب کے طریقے کو اپنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۱۔ ہر دو ایوانوں کے لیے رائے دہندگان کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کو لازم قرار دیا گیا
(ا) مرکزی مجلس قانون ساز کے لیے ۱۵ روپے سے ۲۰ روپے تک سالانہ یا ۵۰ روپے سے ۱۵۰ روپے تک زرعی لگان کی ادائیگی۔
(ب) ریاستی کونسل کے لیے ۷۵۰ روپے سے لے کر ۵۰۰ روپے تک مالیہ کی ادائیگی یا دس ہزار روپے سے لے کر بیس ہزار روپے کی آمدنی پر ٹیکس کی ادائیگی یا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سیاسی معاملات میں دلچسپی رکھنے والے افراد۔

۱۲۔ وائسرائے کو مرکزی مقننہ کے دو ایوانوں کے اجلاس طلب کرنے کا اختیار تھا۔ اس کو ان اجلاس کو اپنی مرضی سے ملتوی کرنے کا بھی اختیار تھا وہ ان دونوں اجلاس کو بذات خود خطاب بھی کر سکتا تھا۔

۱۳۔ مرکزی مقننہ کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ برٹش انڈیا کے متعلق کسی قسم کا کوئی قانون بنا سکتی تھی۔

۱۴۔ مرکزی مقننہ کو رائج الوقت قوانین کو منسوخ کرنے یا ان میں ترمیم کرنے کا اختیار مل گیا۔ البتہ برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے پاس ہو کر ہندوستان میں نافذ ہوتے والے قوانین کے خلاف یہ مقننہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔

۱۵۔ اسمبلی کے ارکان کو آزادی تقریر کی اجازت مل گئی۔ انہیں حکومت پر سوالات کرنے کی اجازت بھی مل گئی البتہ بجٹ کے معاملات میں بحث کرنے پر پابندی برقرار رکھی گئی اور وائسرائے کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ مرکزی مقننہ کے بجٹ سے متعلق تجاویز کو رد کر دیں۔

۱۶۔ اس ایکٹ کے تحت صوبائی اور مرکزی امور کی واضح حد بندی کر دی گئی۔

۱۷۔ فوج۔ مواصلات۔ کرنسی۔ تجارت۔ محاصل۔ درآمد و برآمد اور ریاستوں کے تعلقات کے محکموں کے امور کا انتظام براہ راست مرکز کے سپرد رہنے دیا گیا اور تعلیم۔ حفظان صحت زراعت اور پولیس وغیرہ کے مقامی محکمے اور دیگر خود مختار ادارے صوبائی حکومت کو تفویض کر دیئے گئے۔

۱۸۔ مرکز میں ہر محکمہ کے لیے ایک ایک رکن وائسرائے کی انتظامی کونسل میں شامل کیا گیا اس

Marfat.com

طرح وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی تعداد سات ہو گئی۔

۱۹ ۔ ۱۹۱۹ء کے تحت بننے والی کونسلوں میں مزید توسیع کردی گئی اور ان میں منتخب ارکان کو اکثریت دے دی گئی۔

(یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ ایک ہمدرد نوعیت کی حکومت کا آغاز ہوا تھا لیکن حقیقت میں یہ حکومت جواب دہ حکومت نہ تھی اور وائسرائے کے اختیارات کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ وہ مرکزی مقننہ یا کسی اور با اختیار ادارے کی متفقہ طور پر پاس کی گئی قرار دادوں یا قانون کو ایک "نہ" کہہ کر ٹھکرا سکتا تھا اور اس کے ایک دفعہ انکار سے عوام کی تمام خواہشات کا ہمیشہ کے لیے گلا دبایا جا سکتا تھا۔)

۲۰ ۔ اس ایکٹ کے تحت طے پایا کہ ہر دس سال کے بعد انگلستان سے ایک کمیشن ہندوستان آئے گا جو اس بات کا جائزہ لے گا کہ ہندوستان میں آئینی اصلاحات کس حد تک کامیابی سے بروئے عمل ہیں اور ان میں مزید کیا کچھ اور اصلاحی یا ارتقائی اقدام اٹھائے جا سکتے ہیں اس کمیشن کا نام "STATUTORY COMMISSION" ہوگا۔

۲۱ ۔ مندرجہ ذیل امور سے متعلق مسوّدہ قانون کے سلسلے میں وائسرائے ہند سے پیشگی اجازت لینا لازم قرار دی گئی۔

۱ ۔ عوامی قرضہ یا عوامی مالیات

۲ ۔ مذہب یا مذہبی رسومات

۳ ۔ رواجات جن کا تعلق ہندوستان میں مقیم برطانوی باشندوں سے ہو

۴ ۔ ملک کی بری بحری اور ہوائی فوج سے متعلق قانون۔

۵ ۔ برٹش انڈیا کی حکومت کے غیر ممالک اور دیسی ریاستوں سے تعلقات

۲۲ ۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب اور مخصوص انتخابی حلقے قائم رہے۔ اس کے علاوہ مرکزی اسمبلی میں خاص مفادات کا تحفظ کیا گیا۔

۲۳ ۔ نو نشستیں یورپین لوگوں کے لیے مخصوص کردی گئیں۔

۲۴ ۔ چار نشستیں چیمبرز آف کامرس کے لیے مختص ہوئیں۔

(ان میں نشستوں پر حکومت کے "ٹوڈی" افراد نہایت آسانی سے منتخب ہو سکتے تھے)

Marfat.com

۲۶ ان اصلاحات کی رو سے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان قانون سازی کے اختیارات کو تقسیم کر دیا گیا۔ صوبائی امور دو حصوں میں تقسیم ہوئے اس طرح دو عملی یعنی "DYARCHY" کو صوبوں میں نافذ کر دیا گیا۔ ان دونوں اقسام کے منتقل امور کے محفوظ شعبے یعنی۔ (RESERVED SUBJECTS) اور منتقل شعبے (TRNSFERED SUBJECTS) کے نام سے یاد کیا گیا، محفوظ شعبے دیسی وزیروں کی نگرانی میں نہیں دیئے جاتے تھے۔ کیونکہ ان شعبوں کے لیے دیسی افراد کو نااہل قرار دیا گیا تھا۔ ان محفوظ شعبوں میں محکمہ انصاف پولیس آب پاشی۔ مالیہ۔ آبی ذرائع اور جنگلات وغیرہ شامل تھے یہ شعبے براہ راست انگریز گورنر اور اس کی انتظامی کونسل کے سپرد ہوتے تھے۔

منتقل شعبوں میں حفظان صحت، لوکل گورنمنٹ تعمیرات عامہ۔ تعلیم، امداد باہمی اور مقامی صنعت کے شعبے شامل تھے۔ اس طرح دیسی وزیروں اور فرنگی حاکموں کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی۔

تنقید و تبصرہ:۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اگرچہ ہندوستان میں آئینی حکومت کی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ عوام کی ان توقعات کے مطابق نہیں تھا جو وہ ایک عرصہ سے دل میں لیے بیٹھے تھے، اس ایکٹ کی رو سے نافذ ہونے والی اصلاحات سے اگرچہ بہت سے ہندوستانیوں کو حکومت میں کچھ حصہ لینے کی اجازت مل گئی لیکن تحکم کا عصا انگریز کے ہاتھ میں ہی رہا اور مرکزی قانون ساز اسمبلی ہونے کے باوجود ان کی مقننہ وائسرئے کی خوشنودی اور قبولیت کی محتاج تھی۔ کوئی قانون اس وقت تک قانون نہیں کہلا سکتا تھا۔ جب تک وائسرائے کی منظوری حاصل نہ کر لیتا ہو چاہے وہ وقت کی کتنی ہی اہم آواز کیوں نہ ہو اور اسے چاہے کتنی ہی واضح اور غالب اکثریت نے پاس کیا ہو۔ اس کے علاوہ ان اصلاحات کو مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر چنداں ستائش کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔

۱ ۔ صوبائی وظائف کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے سے انتظامی کارکردگی میں غیر صحت مندانہ اثرات رونما ہوئے، امور محفوظ اور امور منتقلہ جیسی ترکیبوں نے عوام میں عمومیت و تخصیص کے تفرقات کو قائم رکھا۔ اسی دو عملی کے تحت امور محفوظہ انتظامی کونسلروں کے پاس تھے جو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ تھے اور امور منتقلہ ہندوستانی وزیروں کے پاس تھے۔ جو صوبائی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ تھے۔

Marfat.com

۲ ۔ دیسی صوبائی وزراء وزارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد چکی کے دو پتھروں کے درمیان آجاتے تھے۔ چونکہ وزراء صرف منتخب افراد کے لیے جاتے تھے اس لئے وہ بیک وقت دو جگہ جواب دہ ہوتے تھے۔ عوام کے سامنے جنہوں نے ان پر اعتماد کر کے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر انہیں منتخب کیا ہوتا تھا، اور دوسرے گورنر جس نے نہایت مہربانی کر کے انہیں وزارت کا قلمدان بخشا ہوتا تھا، بدقسمتی سے ان وزراء کی آواز گورنر کے سامنے اس وقت دب جاتی تھی جب ان کے انگریز نژاد سیکرٹری صاحبان براہ راست انگریز گورنر سے ملاقات کر کے فائل اور دستاویز پہنچنے سے پہلے حالات سے باخبر کر کے گورنر کی رائے کو اپنے ارادے کے مطابق ہموار کر لیتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ سیکرٹری حضرات اپنی مرضی سے گورنر سے احکام صادر کروا لیتے تھے اور دیسی وزراء بالکل بے بس ہو کر رہ جاتے تھے۔ انتخاب میں حصہ لیتے وقت انہیں خود کو قوم پرست اور محب الوطن ظاہر کرنا ہوتا تھا لیکن وزارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد انہیں گورنر کی خوشامد کرنا ہوتی تھی۔

۳ ۔ صوبوں کے گورنروں کو اس قدر وسیع اختیارات حاصل تھے جن کے تحت وہ کوئی بھی آرڈی نینس جاری کر سکتے تھے اور اس آرڈی نینس کو بعد ازاں ارکان اسمبلی کو منظور کرنا ہی پڑتا تھا۔ اس لحاظ سے اصل مقنن تو گورنر تھے اور ذمہ دار حکومت کے دیسی ارکان گورنر کی خوشنودی کے سامنے بالکل بے بس تھے۔

۴ ۔ وزراء اور کونسلروں کے درمیان مل کر کام کرنے کا جذبہ مفقود تھا کیونکہ ان لوگوں کی ذمہ داریاں مشترک نوعیت کی نہ تھیں۔ وہ علیحدہ علیحدہ شعبوں کے انچارج ہوتے تھے اس لیے وہ یکجہتی جو ایک جمہوری حکومت کی کامیابی کی دلیل ہے اس میں نہیں تھی۔

۵ ۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات اگرچہ ہندوستان کے لئے کلی اور متوقع آزادی کا پیغام لے کر نہیں آئی تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہندوستان کے باشندوں کو اس امر کا احساس ہو گیا کہ ان کی آواز قصر حکومت تک پہنچ سکتی ہے۔ اس ایکٹ کا سب سے زیادہ احساس ہندوؤں کو ہوا کیونکہ ایک عرصہ دراز سے وہ حکومت کے امور میں اختیار دخل کے متمنی تھے جو کئی صدیوں سے انکے نصیب میں کم تھی لیکن اس ایکٹ نے انہیں اس مزے سے سرشار ہونے کا موقع ضرور دے دیا مسلمان تو پہلے حاکم رہ چکے تھے اس لیے انکے لیے اتنی معمولی سی آزادی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔

Marfat.com

تحریکِ خلافت

سوال :- ہندوستان میں تحریکِ خلافت کا آغاز کیونکر ہوا؟ کیا ہندوستان براہ راست اس تحریک سے متاثر ہوا۔ اس تحریک کے ارتقاء اور نتائج کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ نیز یہ بات تفصیل سے بتایئے کہ اس تحریک کی ناکامی کی وجوہات کیا تھیں اور اس کی ناکامی میں ہندو اور انگریز کا کہاں تک عمل دخل تھا؟

جواب پسِ منظر تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ انگریز نے مسلمانوں کے ساتھ جب بھی وعدے کیے ہیں انہیں وقت پر نہ صرف ایفاء کرنا تو درکنار بالکل معاندانہ رویہ اختیار کیا ہے انگریز کا مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ وہ وعدے تو بڑے زور شور سے کر لیتا رہا ہے لیکن وقت پڑنے پر پہلے تو خاموش تماشائی کی طرح یہ دیکھتا رہا ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ اس کی خاموشی مخالف فریق کو شہ بن کر مدد پہنچاتی رہی ہے اور جب مسلمان کے مخالف فریق کا کارگر حالات کی وجہ سے پلّہ بھاری ہو جاتا رہا ہے تو یہ خاموش اور مکار تماشائی جس کی زبان پر کچھ اور دل میں کچھ ہوتا ہے۔ مخالف فریق کا معاون و مددگار بن کر مسلمانوں کی تباہی میں سرگرم حصّہ لیتا رہا ہے اسی قسم کی ایک چال انہوں نے ترکی میں بھی کھیلی۔ ترکی ایک مسلمان خلیفہ کے زیر اطاعت عملاً ایک مسلم ملک تھا لیکن انگریز کی ریشہ دوانیوں اور مخالفین کی سازشوں نے اس کی خلافت کو نہ صرف پارہ پارہ کر دیا بلکہ ہمیشہ کے لیے اس کو ختم کر دیا۔ انگریز نے پہلے تو خاموشی سے مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویے کا مظاہرہ کیا۔ پھر سازشوں میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ انگریز دشمنانِ اسلام کی مدد کے لیے وسائل مہیا کیے اور پھر کھل کر سامنے آ گیا۔ صرف یہی نہیں کہ ماضی میں انگریز کا کردار اس نوعیت کا رہا ہے بلکہ اس قسم کی طبیعت قومی سطح پر اس کی فطرتِ ثانیہ ہے اور اس نے اس عظیم سانحہ کے بعد بھی بہت سے واقع پر مسلم دشمنی کا خطرناک مظاہرہ کیا ہے اور اسلام کے نام سے بننے والی یا ترقی پذیر حکومتوں کے بخیے کرنا اس کے خفیہ منشور

Marfat.com

میں شامل رہا ہے۔

مسئلہ خلافت انگریز کی اس قسم کی چالبازیوں اور مکاریوں کا ثمرہ تھا۔ جو اس نے ایک عظیم مسلم ملک ترکی میں پھیلائیں۔ ترکی ایک پُرامن ملک تھا اور اس کے پڑوسی ملک اٹلی سے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ یہاں تک کہ ۲ دسمبر ۱۹۱۰ء کو اٹلی کے وزیر خارجہ نے اٹلی کی پارلیمنٹ میں ایک بیان دیا جس میں اس نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ ہمیں اپنے پڑوسی ملک ترکی سے کوئی مخاصمت نہیں ہے اور ہم ترکی کی سالمیت کے پوری طرح حامی ہیں۔ اس اعلان سے مغربی دنیا میں کچھ بے چینی سی پیدا ہوئی کیونکہ مغربی دنیا کے کچھ ممالک اس بات کے لیے اٹلی کو اُکسا رہے تھے کہ وہ طرابلس پر ترکی کے قبضے کو ختم کرے۔ اٹلی کے وا حکام مغرب کے ان ممالک کے اُکسانے میں آ گئے اور چند ہی مہینوں کے بعد اعلان کر دیا۔ کہ اٹلی طرابلس پر قبضہ کرے گا۔ کیونکہ فرانس نے ٹیونس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اٹلی کے اس اعلان کو برطانیہ نے خفیہ طور پر بہت سراہا۔ جب برطانیہ سے وضاحت طلب کی گئی تو اس نے بالکل چپ سادھ لی۔ اس طرح اس اہم مسئلے پر اس نے خاموشی اختیار کر کے اٹلی کی عملاً حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کر کے ترکوں کو براہ مصر طرابلس الغرب میں اپنی افواج بھیجنے سے روک دیا۔ حالانکہ برطانیہ کو کسی صورت یہ حق نہیں پہنچتا تھا۔

۱۹۱۲ء کے شروع میں مغربی ممالک کے عیسائیوں کی جانب سے مسلم کشی کے لیے ایک اور چال چلی گئی۔ یونان کے عیسائی وزیر اعظم موسیو وینی زیلوس (MSV ENIZELOS) نے انگریزوں سے شہ پاکر ترکوں کے خلاف یونان۔ بلغاریہ اور سردیا کا اتحاد قائم کر لیا بعد ازاں اس میں مانٹی نیگرو کو بھی شامل کر لیا۔ ان سب عیسائی ریاستوں نے مل کر ترکی کے عیسائیوں کے تحفظ کے پیش نظر جنگ کا الٹی میٹم دے دیا۔ ترکی کو اصل سازش کا علم ہو گیا تو اس نے یونان کے ساتھ معاہدہ صلح کر لیا اور ترکی نے زیادہ خون خرابے سے بچنے کے لیے اور ملک کو نابود ہونے سے بچانے کے لیے یہی مناسب گردانا کہ طرابلس سے اپنی فوجیں واپس بلا لی جائیں۔ چنانچہ مغرب کا یہ فتنہ بھی وقتی طور پر دب گیا۔ لیکن سازشی باز آنے والے نہیں تھے اور بہت جلد بلقان میں ترکی کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی۔ چونکہ ترکی فوج میں عیسائی سپاہیوں اور دیگر عہدیداروں کی تعداد کافی تھی۔ انہوں نے اس جنگ میں جان بوجھ کر پُشت دکھائی جس سے ترکی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ صرف یہی نہیں ترکی کو زک پہنچانے کے لیے مختلف اطراف سے حملے کیے گئے اور عملاً نقصان بھی پہنچایا گیا۔ اس تمام فتنے میں سب سے اہم ہاتھ انگریز

Marfat.com

کا تھا۔ ترکی مسلمان انگریز کے اس رویے سے سخت مایوس ہوئے کیونکہ زبانی لحاظ سے انگریز ترکی کو اپنی دوستی جتاتا تھا۔ لیکن ترک اس کی بدنیتی کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔

۱۹۱۹ء میں پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ جرمنی اور برطانیہ کے درمیان شروع ہوئی اور برطانیہ اس بات کی توقع رکھتا تھا کہ ترکی کو اپنے ساتھ ملا کر وسطی یورپ میں جرمنی کو زبردست نقصان پہنچانے میں کارگر حملے کر سکے گا۔ لیکن اس کو یہ یاد نہ رہا کہ ترکی کے ساتھ اس کا کیا سلوک رہا ہے۔ وہ بھول گیا کہ اس نے ترکی سے دو کروڑ زردں کی قیمت تو وصول کرلی ہے لیکن ایک بھی کروڑ زر دینے سے انکار کر دیا گیا ہے وہ یہ فراموش کر گیا کہ ترک فوج کو مصر کے راستے طرابلس جانے سے روک دیا گیا تھا۔ اسے یہ یاد نہ رہا کہ ترکی کو یہ حقیقت نہیں بھولی کہ طرابلس پر اٹلی کے حملے کا تحسین آمیز سکوت کے ساتھ تماشا کیا گیا۔ ان تمام کارروائیوں میں انگریز نے فرانس کو بھی ہم خیال بنایا ہوا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ معاملے میں جرمنی نے ترکی کی حمایت کی تھی اور ایڈریانوپل کی فتح پر قیصر جرمنی نے ترکی کے ساتھ سلطان محمد خامس کو تہنیتی پیغام بھی ارسال کیا بلقان کی جنگ میں ترکی فوجوں کی تنظیم نو کے سلسلے میں جرمنی نے ترکوں کی مدد کی تھی اور اپنے ایک جرنیل جنرل "مخان درغولتز" کو ترکی بھی بھیجا۔ چنانچہ ترکی نے انگریز کی مدد سے معذرت کا اظہار کیا اور اپنی حمایت جرمنی کے ساتھ وابستہ کر دی۔ ترکی کے اس اعلان کا فوری طور پر انگریزوں میں ردِعمل پایا گیا اور انہوں نے اپنی قدیم بدفطرتی کی چال کو پھر چلایا جس کے تحت بھائی سے لڑانے کے لیے دانہ پھینک دیا وہ یہ کہ مصر کو برطانوی حکومت کی نگرانی میں خود مختار حکومت بنا دیا گیا اور فوری طور پر جزیرہ قبرص کا اپنی سلطنت کے ساتھ الحاق کرلیا۔ اس کے علاوہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی چالوں کی بنا پر ترکوں کو مقدونیہ ایپرس، البانیہ۔ کریٹ۔ قبرص۔ بلغاریہ۔ بوسینہ اور کئی دوسرے اہم علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور اب یہ دونوں قومیں خود ترکی کے خلاف نبرد آزما ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایک عظیم مسلمان ملک کو عیسائی ممالک محض اس لیے نقصان پہنچانے کے درپے تھے۔ کہ وہ مسلمان ہے۔ اس چیز کا احساس ہندوستان کے مسلمانوں میں شدت کے ساتھ پیدا ہوا۔

ترکی نے جب انگریزوں کے خلاف جرمنی کی حمایت کا اعلان کیا تو ہندوستان کی مسلم آبادی کی رگ اخوت بھی پھڑکی اور وہ ان حالات سے آگاہ ہوئی جو انگریز نے ترکی کو درپیش کر دیئے تھے اب انہیں یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اگر ترکی کو اس جنگ میں شکست ہو گئی تو مسلمان ساری دنیا میں ذلیل ہو جائیں گے اور عیسائی طاقتیں اس کا نام ونشان مٹانے کی

Marfat.com

کوشش میں لگ جائیں گی۔ علاوہ ازیں فوری طور پر جن چیزوں کے زیاں کا خطرہ تھا وہ یہ تھیں۔

(ا) مقامات مقدسہ (ii) جزیرۃ العرب

(iii) خلافت اسلامیہ

ہندوستانی مسلمانوں کے اضطراب کو انگریز نے بھی محسوس کیا لیکن ساتھ ہی اس کی منافقت کی مشینری ایک بار پھر حرکت میں آئی تاکہ جنگ کے وقت انہیں ہندوستان کی طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس منافقانہ فطرت کے تحت ہندوستان کے مسلمانوں کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج نے اعلان کیا۔

" ہمارا جنگ کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم ترکی کو اس کے تحت زرخیز زمین اور ایشیائے کوچک کے علاقوں سے محروم کر دیں۔ خاص طور پر ان علاقوں سے جہاں پر ترکی النسل لوگ کثرت سے آباد ہیں۔ ہمارا مقصد صرف جرمنی سے جنگ ہے جرمنی پر ہماری فتح ہونے پر بات ختم ہو جائے گی۔

اس اعلان کے باوجود مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ عراق۔ حجاز۔ شام۔ فلسطین اور تمام اماکن مقدسہ (جو جزائر العرب کہلاتے ہیں) کو مسلمانوں کے خلیفہ کے تحت ہی رہنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے جب جنگ میں اتحادیوں کا پلہ بھاری ہوا تو جرمنی نے ہنگامی صلح کر لی۔ اس ہنگامی صلح میں جرمنی کے ساتھ جو کچھ ہونا تھا وہ تو علیحدہ بات تھی۔ ترکی کے لیے مندرجہ ذیل شرائط طے کی گئیں۔

۱ - ترکی حکومت اپنی تمام فوج کو برطرف کر دے گی۔

۲ - ترکی کے جنگی جہاز فاتحین کے قبضے میں رہیں گے۔

۳ - ملک کی ریلوں کی آمدنی اتحادیوں کے لئے وقف ہو گی۔

۴ - ایشیائے کوچک اور عرب کی سرحدوں کا فیصلہ فاتحین کریں گے۔

۵ - اندرون ملک کا انتظام حکومت ترکیہ کرے گی۔

ترکی کی یہ کیفیت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے از حد پریشان کن تھی کیونکہ دوران جنگ انگریز نے ہندوستان کے مسلمانوں سے جو وعدے کئے وہ جنگ ختم ہونے کے بعد بالکل پورے نہ کئے۔ انہی وعدوں کے پیش نظر ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزی فوج میں جوق درجوق شرکت کی تھی اور سخت مصیبتیں اٹھائی تھیں لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد انگریز ترکی سے کئے جانے والے وعدوں سے پھر گیا۔ یہ بات ان کے لیے سخت تشویشناک تھی۔

Marfat.com

اب ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے مندرجہ ذیل سوالات تھے۔

۱۔ کیا پان اسلام ازم کے پروپیگنڈے کو عام کیا جائے۔

۲۔ کیا اسلام کی مرکزیت خلافت کے علاوہ کہیں اور بھی ہو سکتی ہے۔

۳۔ کیا انگریز کے خلاف اس کے مکروہ عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے، طاقت جمع کی جائے

۴۔ کیا ملکی سیاست کو تحفظ خلافت کے لیے استعمال کیا جائے۔

۵۔ کیا انگریز کی بدکرداریوں کو واضح کرنے کے لیے ایک جماعت بنائی جائے۔

۶۔ کیا انگریز کے خلاف کھلی بغاوت کی جائے۔

انگریز نے اپنے ظالمانہ احکام کی ترویج کے لیے نہ صرف یہاں کے عوام کے منہ بند کر رکھے تھے بلکہ اکا دکا جو اخبارات بھی نکلتے تھے ان کا گلا بھی دبا دیا گیا ہوا تھا کسی اخبار کو جنگ کے پیش نظر کوئی ایسا موضوع لکھنے کی اجازت نہ تھی۔ جس کا تعلق جنگ میں برطانوی کردار پر تنقید سے تھا۔ لیکن مسلمانان ہند ترکی کی یہ حالت دیکھ کر محض اس جذبے سے نہ رہ سکتے تھے۔ جو قرآن پاک کے اس ارشاد کے تحت پیدا ہوتا ہے کہ۔

کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ — "تمام مومن بھائی بھائی ہیں"

اس جذبے کو فروغ دینے کے لیے سب سے پہلے تین عظیم فرزندان توحید نے بڑی جسارت سے میدان عمل میں جست لگائی۔ ان کے نام مولانا محمد علی جوہر، ان کے سگے بھائی مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی تھے۔ مسلمانوں کے خلاف برطانوی رویے کے خلاف ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بہت سے اکابرین نے جگہ بجگہ احتجاجی جلسے کیے، ان میں مدراس، لکھنؤ اور دہلی کے جلسے بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ مدارس میں سیٹھ یعقوب حسن کی صدارت میں ۱۷ جنوری ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ۲۶ جنوری ۱۹۱۹ء کو دہلی میں آنریبل مسٹر فضل الحق کی صدارت میں ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو خصوصی اجلاس ہوئے اس کے علاوہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس لکھنؤ کے تحت سر ابراہیم ہارون جعفر کی صدارت میں ایک خاص جلسہ ہوا جس میں انگریز کے رویے اور اس کے امور کردار کو دلخراش الفاظ میں کوسا گیا۔

ان تمام جلسوں کے ماحصل کے طور پر فیصلہ کیا گیا کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کا نام "خلافت کمیٹی" ہو۔ چنانچہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا صدر سیٹھ چھوٹانی کو بنایا گیا، اور سیکرٹری حاجی صدیق کھتری منتخب ہوئے (بعد ازاں حاجی صدیق کی جگہ مولانا شوکت علی کو اس کمیٹی کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔

Marfat.com

خلافت کانفرنس:۔ خلافت کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس ۲۴ر نومبر ۱۹۱۹ء کو مسٹر فضل الحق کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا، اس اجلاس میں ہندوؤں نے بھی شرکت کی۔ اس باہمی ہمدردی کی وجہ سے دراصل رولٹ ایکٹ کے خلاف مشترکہ مظاہرے تھے۔ ہندوؤں کی ستیہ گرہوں میں مسلمانوں کی شرکت اور مہاتما گاندھی سے ہم آہنگی اور جلیانوالہ باغ میں دونوں قوموں کے افراد کی ہلاکت بھی اس اتحاد کا موجب تھی۔ بہرحال خلافت کانفرنس کے اس اجلاس میں جن ہندوؤں نے شرکت کی ان میں مسٹر گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل قرار دادیں پاس کی گئیں۔

۱۔ خلافت کے مسئلے میں ہندوستان کے غیر مسلموں کی مسلمانوں کو مکمل تائید حاصل ہے۔

۲۔ مشہد مقدس اور دوسرے مقدس مقامات پر انگریزی تسلط اور رسوخ کے خلاف احتجاج کیا جاتا ہے۔

۳۔ ہنگامۂ صلحنامے کے موقع پر جنگ کے خاتمے پر ہونے والے جشن صلح میں مسلمان شریک نہیں ہوں گے۔

۴۔ صلح کانفرنس کے فیصلوں کا مسلم منشاء کے خلاف ہونے کی صورت میں برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔

خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ہوا۔ جس میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگرس کے علاوہ جمعیۃ العلماء ہند نے بھی شرکت کی۔

اصل میں جمعیۃ العلماء کا یہ سب سے پہلا جلسہ تھا۔ انہی دنوں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا تھا اور اس خوشی میں بہت سے سیاسی قیدی رہا کیے گئے اس سلسلہ میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی دونوں بیتول جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے اور اس کانفرنس میں شرکت کی کانفرنس کے اس دوسرے اجلاس میں مندرجہ ذیل امور طے پائے۔

۱۔ سلطان ترکیہ کو خلیفہ تسلیم کیا جائے اور ان سے عقیدت کا اظہار کیا جائے۔

۲۔ ۱۷ جنوری ۱۹۲۰ء تک مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب سے متعلق تمام مطالبات پیش کرنے کے لیے ایک وفد انگلستان روانہ کیا جائے اور مولانا محمد علی جوہر اس کے رہنما ہوں

Marfat.com

۳ ۔ خلافت فنڈ جمع کیا جائے اور اس میں کم از کم دس لاکھ روپیہ جمع کیا جائے۔

دوسری کانفرنس کے انعقاد کے بعد مسئلہ خلافت ملک گیر شکل اختیار کر گیا اور اس میں مسلمانوں کو جو ہمدردی تھی وہ تو مسلم اخوت کی وجہ سے تھی ہی لیکن کمال یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام نے اس مسئلہ کو ذاتی وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اس لئے انگریز کے خلاف زبردست پروپگنڈے کا آغاز ہوا۔ جس وفد کو ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ء کو روانہ ہونا تھا۔ وہ اگرچہ کچھ تاخیر سے گیا لیکن اس کی روانگی سے قبل ایک اور وفد نے والسرائے ہند مسٹر چیمسفورڈ سے ملاقات کی اور اسے خلافت تحریک کے بارے میں تمام زاویوں سے روشنی ڈالتے ہوئے حالات کو واضح کرنے کی کوشش کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر حکومت برطانیہ نے اپنے وعدے پورے نہ کئے تو اس کو ایسا سخت اخلاقی دھکا لگے گا، کہ بڑے سے بڑے زرخیز علاقے اور عظیم ترین سیاسی نفعے اس کی تلافی نہ کر سکیں گے، اور پھر سابق والسرائے ہند نے جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے ترکی کے بارے میں جو اعلان کیا تھا جس میں ترکی کے مفادات کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی وہ سب کا سب محض ایک فریب ثابت ہوگا، اور برطانوی شاہی وقار کی تمام قلعی کھل جائے گی اور بدعہدی کا بھانڈہ چوراہے میں پھوٹے گا۔ لیکن یہ والسرائے ان اصلاحات کو ہی باشندگان ہند کے لیے اعلیٰ ترین تحفہ سمجھ کر لے آیا تھا، ان کو برطانوی تاج کا ایک عظیم ترین تاج قرار دے کر خود خوش ہو رہا تھا۔ اور ہندوستانیوں کو ممنون دیکھنے کی خواہش کر رہا تھا مایوس کن رویہ روا رکھا۔ حالانکہ اس وفد میں پورے ہندوستان کے اعلیٰ ترین اور برگزیدہ لیڈروں نے شرکت کی تھی۔ ان میں سے چند ایک کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱ ۔ مولانا محمد علی جوہر
۲ ۔ مسٹر گاندھی
۳ ۔ مولانا ابوالکلام آزاد
۴ ۔ مولانا حسرت موہانی
۵ ۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔
۶ ۔ حکیم اجمل خان
۷ ۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو
۸ ۔ راجہ صاحب محمود آباد
۹ ۔ مولانا عبدالماجد بدایونی
۱۰ ۔ آغا محمد اشرف قزلباش۔

خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس فروری ۱۹۲۰ء کو بمقام بمبئی انعقاد پذیر ہوا، اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

۱ ۔ انگلستان جانے والے خلافت وفد کی نامزدگی اور اس پر پورا پورا اظہار اور اعتقاد

Marfat.com

۲ ۔ مسلمانوں کے مطالبات کا اعادہ کیا گیا جو خلافت کمیٹی کی طرف سے پیش کئے گئے تھے ۔

۳ ۔ حکومت برطانیہ کو مندرجہ ذیل بیان کے ذریعے اچھا خاصا متنبہ کیا گیا ۔

" اس مطالبے میں اگر کوئی کمی کی گئی تو اس سے نہ صرف مسلمانوں کے گہرے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچے گا بلکہ ان اعلانات اور دعودں پر صریحاً بے حرمتی اور خلاف ورزی ہوگی جو اتحادی قوموں نے جنگ کے وقت مسلمان افواج کی تائید حاصل کرنے کے لیے کیا تھا ۔ یہ مطالبہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ پوری ہندو آبادی اس میں پرزور حمایت کے ساتھ برابر کی شریک ہے ، اگر فیصلہ غلط نوعیت کا کیا گیا تو اس کے نتائج خطرناک ہونگے "۔

لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ کی طوطا چشمی :۔ چنانچہ یہ وفد مارچ ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتہ میں انگلستان کے لیے روانہ ہوا ۔ مولانا محمد علی جوہر جو اس وفد کے رہنما تھے ۔ اسکے علاوہ سید حسین جو الہ آباد سے نکلنے والے اخبار "انڈیپنڈینٹ" (INDEPENDENT) کے ایڈیٹر تھے مولانا سید سلیمان ندوی حسن محمد حیات ، مولوی ابوالقاسم شیخ مشیر حسین قدوائی ۔ محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمان صدیقی بھی شریک تھے ۔ مؤخرالذکر چار دل حضرات پہلے سے ہی انگلستان میں موجود تھے اس لیئے وہ مولانا جوہر کے انگلستان پہنچنے پر وفد کے ہمراہ تھے ۔ اس وقت کے برطانوی وزیر ہند اور برطانوی وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات کا نقشہ سید حسن ریاض نے جن الفاظ میں پیش کیا ہے ان سے واضح ہوجاتا ہے کہ انگریز کو ہندوستانی عوام کے جذبات کا کس قدر احترام اور خیال تھا فرماتے ہیں ۔

" وزیر ہند کی طرف سے مسٹر فشر " نے (مارچ ۱۹۲۰ء) وفد سے ملاقات کی ۔ اس کے بعد وفد وزیر اعظم لائیڈ جارج سے ملا ۔ مولانا محمد علی نے بڑی متانت اور بے باکی سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے لیکن جب نفرت و عداوت سے دل کج ہوگیا ہو اور نخوت کی چربی آنکھوں پر چھائی ہوئی ہو تو حق انصاف اور معقولیت سب کے لیئے دل اور چہرے کی آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں ۔

Marfat.com

لائیڈ جارج نے بے حیائی سے کہا!

"ترکوں کے ساتھ ان سے مختلف اصولوں پر معاملہ نہیں کیا جا سکتا جو مسیحی ملکوں کے ساتھ برتے گئے ہیں، ترکیہ کو ترکی سرزمین پر دنیوی اختیار برتنے کی اجازت ہوگی مگر وہ علاقے اس کے قبضے میں نہیں چھوڑے جائیں گے جو ترکی نہیں ہیں"۔

وزیر اعظم برطانیہ کا یہ جواب حکومت برطانیہ کی فریب دہی اور مکاری کی سب سے بڑی دلیل تھا، اس نے بڑے وقت میں تو ہندوستان کے مسلمانوں سے زر۔ زمین اور خون لے لیا اور اس کے بدلے میں کئے گئے وعدوں سے الفاسے قطعی طور پر انکار کر دیا اور زبردست طوطا چشمی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے اس نوعیت کے جواب سے برطانیہ کی نہ صرف ہیبت ہی ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں سے نکل گئی بلکہ اس کا ظاہری وقار بھی ان کے سامنے ایا ہیچ ہو کر رہ گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہوں میں انگریز کی کوئی وقعت ہی نہ رہی۔

وزیر اعظم کے اس کورے جواب پر خلافت کمیٹی نے پورے ہندوستان میں ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو یوم ماتم منانے کا اعلان کیا، اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس دن روزہ رکھیں۔ عام ہڑتال کریں، اور دعائیں کریں۔ ادھر اسی روز مولانا شوکت علی نے خلافت کمیٹی کے تحت ہونے والے جلسوں میں پاس کئے جانے والا ریزولیوشن تیار کیا جس میں کہا گیا کہ اگر برطانوی حکومت مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم نہیں کرتی تو تاج برطانیہ سے اپنا رشتہ وفاداری منقطع کر لیا جائے اس کے ساتھ ہی مسٹر گاندھی نے اسی روز اعلان کیا کہ اگر برطانوی حکومت مسلمانوں کو ناپسندیدہ شرائط پر صلح کے لیے مجبور کرے گی تو پورے ملک میں عدم تعاون کی تحریک شروع کی جائے گی۔

وزیر اعظم برطانیہ کے جواب سے مایوس ہو کر "خلافت وفد" انگلستان کے دوسرے اکابرین سے بھی ملا، اور اپنا نکتہ نظر ان پر واضح کیا۔ اس کے علاوہ یہ وفد پیرس بھی گیا اور فرانسیسی حکمرانوں کو مسلمانوں کی حالت زار پر رلانے کی کوشش میں مصروف ہوا لیکن یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے، ان پر اثر ہونا تھا نہ ہوا۔

معاہدہ سیورے:۔ وفد کے ارکان ابھی اپنا دورہ مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ اتحادیوں کے نمائندے پیرس کے ایک شہر "سان ریمون" میں جمع ہوئے

Marfat.com

اور ترکی کے لیے ایک معاہدہ تیار کیا گیا۔ اس معاہدے کا نام "معاہدہ سیورے" تجویز ہوا، جس میں نہایت متعصبانہ اور منتقمانہ انداز اختیار کیا گیا۔ اور ترکی کو بالکل بے بس اور لاچار بنا دیا گیا۔ چونکہ اس معاہدے کی تیاری میں برطانیہ کا ساتھ دوسرے ممالک بھی دے رہے تھے اس لیے ترکی کو بحالت مجبوری کافی تامّل کے بعد دستخط کرنے ہی پڑے اس معاہدے پر ۱۰؍ اگست ۱۹۲۰ء کو فریقین کے دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل تھیں۔

۱۔ ترکی سلطان اتحادیوں کے ساتھ قسطنطنیہ میں حکومت کریگا۔

۲۔ اتحادی ملکوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ ایسی آبناؤں پر قبضہ کرلیں جو اس وقت حکومت ترکیہ کی تحویل میں ہیں۔

۳۔ اتحادی ملکوں کو ایشیائی ترکیہ کے کسی بھی حصّہ پر قابض ہو جانے کا حق ہوگا۔

۴۔ آرمینیہ کی ایک نئی حکومت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مدد سے قائم کی جائے گی جس میں حالیہ ترکیہ کے قبضہ سے مندرجہ ذیل صوبوں کو لے کر علیحدہ کر دیا جائے گا اور انہیں یکجا کر کے نئی ریاست بنائی جائے گی۔

مشرقی اناطولیہ، ارض روم۔ ران۔ تبلس۔ ترابزون اور ارزبخان۔

۵۔ ترکی عرب سے متعلق اپنے تمام دعوؤں سے دست بردار ہوگا۔

۶۔ مختلف علاقوں کی حکم برداری جو دراصل ترکی کے زیر تسلط تھے بانٹ دی گئی جو حسب ذیل تھی۔

(i) شام فرانس کے پاس

(ii) عراق اور اردن، میسپوٹیمیا برطانیہ کے پاس۔

(iii) عدلیہ اٹلی کے پاس

(iv) سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کے پاس۔

اس معاہدے سے نہ صرف ہندوستانیوں کے اضطراب میں اضافہ ہوا بلکہ پوری دنیا میں اتحادیوں کی نیند رہانٹ پر زبردست نفرت کا مظاہرہ ہونے لگا حتےٰ کہ خود ترکی کی حکومت اور عوام نے اس معاہدے کی شرائط پر احتجاج کیا، کیونکہ اس سے اسلامی روایات کی تذلیل مقصود تھی۔ اس معاہدے نے ترکی کی حکومت کو تو ضرور زچ کیا لیکن عوام کی آنکھیں کھول دیں لوگ سمجھ گئے کہ خلیفۃ المسلمین اب اتحادیوں کے ہاتھوں اس قدر بے بس ولاچار ہوگیا ہے۔ کہ

Marfat.com

وہ اپنے ہی ملک وملت کی روایت واقدار کے تحفظ کی سکت کھو بیٹھا ہے اس کے بعد ترکی میں ایک نئے جذبے نے جنم لیا۔ اور وہ تھا عوامی جذبہ۔

اس معاہدے کے تحت جب یونان فوجیں سمرنا میں داخل ہوئیں تو وہاں کے مقامی یونانیوں نے جو ایک عرصہ دراز تک ترکی حکومت کے ماتحت رہے تھے۔ نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ان یونانیوں نے مل کر مسلمان ترکوں کا قتل عام کیا۔ عمارتوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا اور دوسری جائیدادوں کی غارت گری شروع کر دی۔ یہ افراتفری بڑھتی بڑھتی اندرون ملک تک پہنچی تو ترکی ایک سخت عذاب میں مبتلا ہو گیا۔

یہ سب شرارت انگریز کی تھی اور وہ یہی چاہتا تھا کہ ترکی کے اندرونی معاملات میں اس قدر شدید گڑبڑ پیدا کی جائے جس سے یہاں کے لوگ کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی کے مطالبے کو بھول جائیں اور انہیں اندرونی امن و امان کے قیام کی فکر دامنگیر ہو جائے لیکن جوانمرد خدا کے بندے ایسے مواقع پر از خود پیدا ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص جس کا نام یورک علی ایفی بتایا جاتا ہے۔ اور جو دوران جنگ ایک ڈاکو کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی قوم کی مدد کے لیے آگے بڑھا اس ظلم کو نیچا دکھانے کے لیے اس نے پچاس آدمیوں کا ایک ٹولہ ہمراہ لے کر دریائے مندریس کو عبور کیا اور یونانی فوج پر حملہ آور ہوا حملہ اس قدرت سے کیا کہ پوری کی پوری یونانی فوج کا صفایا کر دیا اس سے ترکی عوام کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے قومی سطح پر اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کر دیا۔

مجلس ملی کبیر کی تشکیل:- مصطفےٰ کمال پاشا جو ترکی فوج میں پہلے کرنل اور بعد ازاں ترکی کی تیسری فوج کا انسپکٹر جنرل بنایا گیا تھا۔ اس تحریک میں پوری جرأت مندی سے کود پڑا، اسے نوکری کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس نے سیاسی میدان میں کودتے ہی اعلان کیا کہ ہمارے وطن کی سالمیت اور قومی وقار و استقلال سخت خطرے میں ہے مرکزی حکومت اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل نہیں ہے اس لئے اس وقت ہمیں اپنے آپ کچھ کرنا ہوگا

اس اعلان پر وزارت جنگ نے اس کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا لیکن کیا معلوم تھا کہ یہی کرنل وانسپکٹر جنرل ملک کا سب سے اعلیٰ رہنما بنے گا۔ چنانچہ ترکی کے عوام کی حمایت کو حاصل کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ حکومت چلانے کے لیے ایک فعال نوعیت کا ادارہ ہونا چاہیے جو عوام کی مرضی کے مطابق بنایا جائے اور جس میں واحد حکمران کے ذہن کی

Marfat.com

بجائے عوام کے اذہان مل کر فیصلہ کریں۔ چنانچہ اس نے ملک میں ایک مجلس (قانون ساز اسمبلی) تشکیل دی جس کا نام "مجلس ملی کبیر" رکھا گیا۔ اس مجلس کا سربراہ مصطفےٰ کمال پاشا ہی کو منتخب کیا گیا اور یہ بھی طے پایا کہ سلطان کے علاوہ ہی سربراہ حکومت ہوں گے۔ فیصلہ کیا گیا کہ ارکان حکومت کا انتخاب اسمبلی خود کرے اور اسمبلی ہی قانون بنانے اور انہیں نافذ کرنے کے لیے احکام جاری کرے۔ اس طرح مصطفےٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں ایک 'عارضی انقلابی کونسل' وجود میں آگئی اس مجلس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ سلطنت اور خلافت کے مسئلے کا تصفیہ اس وقت تک ملتوی کر دیا جائے جب تک کہ ملک بیرونی حملہ آوروں کے قبضے سے آزاد نہیں ہو جاتا۔

مجلس ملی کبیر کی تشکیل کے فوراً بعد اس میں ایک بنیادی تنظیم کا عارضی آئین ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء کو منظور کیا گیا جس میں مندرجہ ذیل امور پر اتفاق رائے کیا گیا۔

۱ ۔ حاکمیت عوام کی ہے۔
۲ ۔ قانون وضع کرنے کے اختیارات صرف مجلس ملی کبیر کو ہیں جو ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہوگی۔
۳ ۔ نئی حکومت مجلس ملی کبیر کی حکومت کہلائے گی۔
۴ ۔ صدر کا انتخاب اسمبلی کرے گی اور صدر کو اختیار ہوگا کہ وہ مجلس کی طرف سے دستخط کرے
۵ ۔ مجلس ملی کبیر دو سال کے لیے ہوگی۔ اس میں اشد ضرورت کے تحت ایک سال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔
۶ ۔ معاہدات کرنے، جنگ یا صلح کا اعلان کرنے ملکی قوانین میں ترمیم کرنے یا انہیں منسوخ کرنے اور مقدس قانون کی تعمیل کرانے کا اختیار صرف مجلس کو ہوگا۔

خلافت کمیٹی:۔ معاہدہ سیورے نے ہندوستان میں بھی ہلچل مچا دی، یہاں پر مختلف تنظیموں نے مختلف مقامات پر جلسے کئے اور اس معاہدے پر کڑی تنقید کی۔ ۱۸ مئی ۱۹۲۰ء کو بمبئی میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا جس میں مسٹر گاندھی نے فیصلہ کیا کہ تحریک عدم تعاون کو شروع کر ہی دیا جائے۔ بنارس میں آل انڈیا کانفرنس کمیٹی نے بھی یہی فیصلہ کیا۔ ہندو آل پارٹیز کانفرنس نے ۲ جون ۱۹۲۰ء کو باضابطہ طور پر عدم تعاون کی تجویز کو منظور کیا اور اس سلسلے میں ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ذمے تحریک عدم تعاون کا لائحہ عمل تیار کرنا لگایا گیا۔

Marfat.com

اس کمیٹی میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور حاجی احمد صدیق کھتری شامل تھے۔ اس کمیٹی کے فیصلے کے بارے میں وائسرائے کو باقاعدہ مطلع کردیا گیا۔

تحریک عدم تعاون:- خلافت کمیٹی کی تشکیل کے بعد مسٹر گاندھی اور دوسرے نوے مسلمان لیڈروں نے وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ کو باقاعدہ مطلع کیا کہ اگر یکم اگست ۱۹۲۰ء تک برطانیہ کی حکومت نے معاہدہ سیورے کے مندرجات کو مسلمانوں کے حق میں نہ بدلا تو تحریک عدم تعاون کا آغاز کردیا جائے گا۔ حکومت برطانیہ اور وائسرائے پر اس نوٹس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ ادھر تحریک خلافت کے پروپیگنڈے کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے میں یہاں تک کہ گھروں کے اندر اس تحریک کے تحرکات پہنچ چکے تھے۔ اور مسلمانان ہند اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو گئے تھے علی برادران اپنی معمر والدہ کے ہمراہ ملک کے گوشے گوشے میں اس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے سرگرداں رہے۔ مہاتما گاندھی اپنی سطح پہ ہندوؤں کو گرما رہے تھے۔

آخر کار یکم اگست بھی آن پہنچا لیکن انگریز کے سر پر جوں تک نہ رینگی، یکم اگست ۱۹۲۰ء کو کمیٹی کے فیصلے کے مطابق تحریک عدم تعاون کا آغاز کیا گیا۔ خلافت کمیٹی کی اپیل پر اس دن پورے ہندوستان میں ہڑتال کی گئی۔ مسٹر گاندھی کو متفقہ طور پر تحریک عدم تعاون کا لیڈر منتخب کر لیا گیا۔

ہجرت:- تحریک عدم تعاون کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے ایک اور طریقہ بھی انگریز سے نجات حاصل کرنے کا نکالا وہ تھا ہجرت کا طریقہ۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان کو چھوڑنا شروع کیا تو انگریز نے فوج کو حکم دے دیا کہ تمام سرحدوں کی ناکہ بندی کردی جائے لیکن سندھ میں بالخصوص تحریک ہجرت کا زور رہا۔ یہاں تک کہ کچی گڑھی میں ہجرت کرنے والوں اور انگریزی فوج کے درمیان زبردست تصادم ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق ۸ ہزار مسلمان سرحد پار کرکے افغانستان چلے گئے۔ لیکن کسی خارجی دباؤ کے تحت افغانستان نے بھی مہاجرین کے لیے اپنی سرحدوں کے دروازے بند کر دیئے جس سے مسلمانوں کی تحریک کو زبردست دھکا لگا۔ اور مسلمانوں کو سخت جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس طرح تحریک ہجرت ختم ہوگئی۔

Marfat.com

علی برادران کی گرفتاری:۔ ۸ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولانا محمد علی جوہر صدر تھے۔ اس وقت تک ہندوستان میں تحریک عدم تعاون زور پکڑ چکی تھی۔ اس تحریک کو مزید زوردار بنانے کے لئے مولانا محمد علی جوہر نے ایک شعلہ انگیز تقریر کی اور اس کے ساتھ ہی پانچ سو علماء کا فتویٰ کانفرنس میں پڑھا جس میں اسلام دشمن انگریز کی حمایت کرنے کو قطعی حرام قرار دے دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے بھی ایک قرارداد پیش کی جس میں مندرجہ ذیل باتیں کہی گئیں۔

۱۔ حکومت ان تمام مطالبات کو منظور کرے جن کو خلافت کمیٹی اور خلافت وفد پیش کر چکے ہیں

۲۔ آج سے انگریز کے ماتحت فوج میں نوکر ہونا یا رنگروٹوں کی بھرتی میں مدد دینا مسلمانوں کے لیے قطعاً حرام ہے۔

۳۔ اگر حکومت برطانیہ نے حکومت انگورہ (انقرہ) سے جنگ کی تو مسلمانان ہند سول نافرمانی کریں گے۔

۴۔ اگر حکومت برطانیہ ہمارے مطالبات پہ جلد غور نہیں کرے گی تو آئندہ ہونے والے کانگرس کے اجلاس میں جو احمد آباد میں منعقد ہو رہا ہے ہندوستانی جمہوریت کا علم بلند کر دیا جائے گا۔

یہ تقریر حکومت کے لیے سخت توہین کے مترادف تھی چنانچہ وائسرائے نے مولانا محمد علی کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ مولانا ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو آسام سے مدارس سیاسی دورے پر جا رہے تھے کہ "والٹیر" کے اسٹیشن پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی کو بمبئی سے گرفتار کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں تحریک خلافت کے دوسرے اکابرین مثلاً ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد مدنی، جگت گرو شری شنکر اچاریہ آف سردار پیٹھ اور پیر غلام مجدد کو یکے بعد دیگرے گرفتار کر لیا گیا یہ صورت حال دیکھ کر کانگرس نے حمایت کے انداز میں زیادہ تقویت دی۔ اور ۵ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو بمبئے سے مندرجہ ذیل بیان جاری کیا

"یہ قومی وقار اور قومی مفاد کے خلاف ہے کہ کوئی ہندوستانی کسی حیثیت سے ایسی حکومت کی ملازمت میں رہے جس نے فوجی سپاہیوں کو اور پولیس کو قوم کی جائز تمناؤں کے پامال کرنے کے لیے اس طرح استعمال کیا ہو جس طرح رولٹ ایکٹ کے ایجی ٹیشن کے دوران کیا گیا۔ اور جس نے مصریوں، ترکوں، عربوں اور دوسری اقوام کی قومی سپرٹ کے کچلنے کے لیے سپاہیوں سے کام لیا۔"

Marfat.com

علی برادران کے ساتھ باقی سیاسی لیڈروں پر کراچی میں مقدمہ چلایا گیا جس میں بالآخر سب کو دو دو سال کی سزائے قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔

پرنس آف ویلز کا دورہ ہند:۔ ہندوستان میں اصلاحی کونسلوں کے افتتاح کے لئے ولی عہد شہزادے (پرنس آف ویلیز) نے اگست ۱۹۱۰ء کو آنا تھا۔ لیکن ہندوستان میں سیاسی صورت حال مخالفانہ نوعیت اختیار کر گئی تھی۔ چنانچہ پرنس تو نہ آیا اور اس مقصد کے لیے ڈیوک آف کیناٹ (DUKE OF CANNUAGHT) کو بھیج دیا چنانچہ وہ ۱۷ ار نومبر ۱۹۲۱ء کو ہندوستان کے سرکاری دورے پر بمبئی پہنچے۔ ان کا سرزمین ہندوستان پر قدم رکھنا ہی تھا کہ پورا ملک بلوؤں اور ہنگاموں کے شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔ خلافت کمیٹی اور کانگرس پہلے ہی ان کے پروگرام کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر چکی تھی۔ ادھر خلافت کمیٹی اور کانگرس نے سماجی کاموں کے لیے اور قومی خدمت کے لیے لاتعداد رضا کار بھرتی کر لیے ہوئے تھے۔ انگریز کو ان رضا کاروں کی روز افزوں بھرتی پر سخت تشویش تھی۔ بالخصوص اس وقت جب کہ برطانیہ کا عزیز ترین مہمان پرنس آف ویلیز ہندوستان میں آیا ہوا ہو۔ پرنس آف ویلیز بھی اس قسم کی بھرتی کو کہاں پسند کرتا تھا۔

اس زمانے میں انگریز حکومت کے ایک ہندو پٹھو نے جس کا نام سر تیج بہادر سپرو تھا حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ ضابطۂ فوجداری اور تعزیرات ہند کی مختلف دفعات کو بروئے عمل لا کر اعلان کر لے کہ یہ تمام باوردی رضا کار خلافِ قانون حیثیت رکھتے ہیں۔ اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے۔ چنانچہ رضا کاروں کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ اور ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں کو گرفتار کر کے جیلوں میں انہیں بند کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تاہم جب پرنس آف ویلیز کلکتہ پہنچے تو پورے شہر میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ یہاں تک کہ ۲۵/ دسمبر ۱۹۲۱ء کو انگریزوں کو کسی دکان سے گوشت تک نصیب نہ ہوا۔ جس سے وہ بہت زیادہ برہم ہوئے لیکن بائیکاٹ رہا۔

مولانا حسرت موہانی اور جیل:۔ مولانا حسرت موہانی کو تحریک خلافت کے سلسلے میں قید و بند کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ بڑودا کے مقام پر جیل میں سزائے قید بامشقت گذار رہے تھے۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ ان کی اسیری کا موجب کوئی اخلاقی جرم نہیں ہے ایک سیاسی مطالبے کی نامنظوری ہے جس کی سزا اخلاقی مجرموں کی نوعیت کی نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ جیل ہی میں انہوں نے اعلان کیا۔

Marfat.com

۱۔ کوئی مشقت نہیں کریں گے۔

۲۔ جیل کا کھانا نہیں کھائیں گے۔

۳۔ اخبار روزانہ پڑھیں گے۔

۴۔ غزل کہیں گے اسے باہر بھیجیں گے اور وہ شائع ہوگی۔

جیل کے حکام نے پہلے تو سختی سے اس ارادے کو دبانے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے مولانا کو عزم میں مکمل طور پر راسخ پایا۔ تو ان کے مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا۔ انہیں باقاعدہ طور پر مشقت سے مبرا قرار دے دیا گیا۔ جیل میں کھانا تیار کرنے کے لیے دو خصوصی افراد دیئے گئے۔ اخبار مہیا کی گئی۔ اور غزلیں جیل سے باہر بھیجنے کی پابندی کو ختم کر دیا گیا۔

معاہدہ صلح لوزاں: تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت تک ترکی حکومت گومگو اور شکست کے عالم میں بالکل یاسیت کے چکر میں پڑی رہی۔ لیکن جب اسے عصمت انونو اور مصطفےٰ کمال پاشا جیسے لیڈر مل گئے۔ تو انہوں نے اسی مدتِ قلیل میں یونان پر حملہ کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ چنانچہ ۲۶ اگست ۱۹۲۱ء کو ترکوں نے یونانیوں کو شکست فاش دی اس پر برطانیہ کو تشویش ہوئی اور وہ سمجھ گیا کہ اب یورپ کا مرد بیمار پھر صحت مند ہو گیا ہے چنانچہ ایک سال ایک ماہ تین دن کی مدت کے بعد برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج نے لومڑ مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے ۲۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو مدانیہ میں ترکوں کے ساتھ معاہدہ التوائے جنگ کر لیا۔ جنگ ملتوی تو ہو گئی لیکن ختم نہ ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی وقتاً فوقتاً جھڑپیں لیتے دیتے آخر کار ترکوں نے یونانیوں کو اس قدر دھکیلا کہ سمندر تک پیچھے دھکیل دیا۔ اب برطانیہ کے پاس اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے پردرہ یونانیوں کو مزید تباہی سے محفوظ رکھے۔ اس دوران انگریز کا مقصد دراصل یہ تھا کہ یونانی کبھی کسی نہ کسی جھڑپ میں ترکوں سے کچھ نہ کچھ ہتھیاتے رہیں گے اور یہ بھی انگریز کی ایک منافقانہ چال تھی کہ التوائے جنگ کے دوران باقاعدہ جنگ تو نہ ہو لیکن بے قاعدہ جنگ شاید یونانیوں کو کوئی فائدہ پہنچ ہی جایا کرے۔ لیکن ترک اب وہ ترک نہ تھا۔ جسے خلیفہ کے زیر سایہ انگریز نے دیکھا تھا۔ اب کے اس نے تو یونانیوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور اب انگریز کی طرف وہ متوجہ ہوتے والا تھا۔ بالآخر چاروناچار لوزاں کے مقام پر صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ جہاں ایک معاہدہ طے پایا جس کا نام معاہدہ صلح لوزاں رکھا گیا۔ اس معاہدے پر ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل تھیں۔

Marfat.com

۱ - عراق اور ان کے علاقے ترکی سے لے کر بعد میں برطانیہ کی حکم برداری میں دے دیئے جائیں گے۔

۲ - شام کو ترکی سے آزاد کرا کے بعد میں فرانس کی حکم برداری میں دے دیا جائے گا۔

۳ - عرب خود مختار رہے گا۔

۴ - یورپ میں ترکی کے تمام مقبوضات بجز مشرقی تھریس کے سب اس سے لے لئے جائیں گے۔

۵ - جزائر ڈاڈی کینز، روڈز اور کیسٹیلوریز واٹلی کو دے دیئے جائیں گے۔

۶ - بحیرۂ ایجین کے دوسرے جزائر یونان کو دے دیئے جائیں گے۔

۷ - لیبیا، مصر، اور سوڈان کی قیادت سے ترکی دست بردار ہو گا۔

۸ - قبرص برطانیہ کو ملے گا۔

۹ - ترکی میں جو اقلیتیں ہیں۔ ان کی حفاظت کی جائے گی۔

۱۰ - ترکی میں غیر ممالک کی عدالتوں کو توڑ دیا جائے گا۔

۱۱ - ترکی سے کوئی تاوانِ جنگ نہیں لیا جائے گا۔

۱۲ - ترکی کی بری یا بحری فوج پر کسی قسم کی کوئی پابندی یا قید عائد نہیں ہوگی۔

۱۳ - درہ دانیال، بحیرہ مارمورہ اور باسفورس تمام اقوام کے لئے کھلے رہیں گے۔ اور ان کا انتظام لیگ آف نیشنز کے سٹریٹس کمیشن کے سپرد ہو گا۔

۱۴ - اناطولیہ کے ساحل غیر مسلح کئے جائیں گے۔ لیکن ان پر اقتدار ترکی کا ہو گا۔

۱۵ - یونان اور ترکی کے درمیان تبادلہ آبادی ہو گا وہ عیسائی لوگ جو یونان جانا چاہیں مسلمانوں سے تبادلے کی سکیم میں ترکی سے جا سکتے ہیں۔

ترکی میں خلافت کا خاتمہ: اس معاہدے نے اگرچہ ترکی کے حالات کسی حد تک سنبھلنے کے قابل بنا دیئے۔ لیکن اس سے سب سے بڑا نتیجہ جو نکلا وہ تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ، لیکن یہ معاہدہ اس معاہدہ سے بہتر تھا۔ جو معاہدہ سیورے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس سے ترکوں کا بہت سا علاقہ بچ گیا اور ترکوں کی اپنی قومی آزادی قائم رہی اور ایک خود مختار حکومت قائم ہو گئی ادھر ہندوستان میں مسلمانوں کا خیال تھا کہ ترکی میں خلافت کا تحفظ کیا جائے، اور خلیفہ کو برسر اقتدار رہنے دیا

Marfat.com

جائے۔ وہ بات ختم ہوگئی، اس سے خود ترک لوگوں کو تحریک خلافت سے کوئی دلچسپی نہ رہی ۲ مارچ ۱۹۲۹ء کو ترک کی جمہوری پارٹی کے ایک اجلاس میں قرارداد منظور کی گئی کہ ترکی میں خلافت کو سرے سے ختم کیا جاتا ہے۔ عثمانی خاندان کے تمام افراد کو جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۳ مارچ کو اس فیصلے پر عملدرآمد بھی ہوگیا۔ اور ۳ اور ۴ مارچ ۱۹۲۹ء کی درمیانی رات کو عبدالمجید آفندی اپنے ایک بیٹے، ایک بیٹی اور دو بیویوں کے ہمراہ ترکی سے نکل گئے۔

تحریک خلافت کا خاتمہ:- تحریک خلافت ۱۹۲۳ء تک اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ لیکن ہر کمالے را زوالے، ہندوؤں نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ کہ خلافت کی تحریک میں ہم کئی سالوں سے صرف مسلمانوں کے حقوق کے لیے لڑتے جا رہے ہیں۔ اور انڈین نیشنل کانگرس کا اپنا مقصد تو حل ہی نہیں ہو رہا اور ہندوؤں کی کوششوں کا زیادہ وقت تو مسلمان ہی کھا گئے ہیں، اس لئے اب ان سے کنارہ ہی کر لینا چاہیئے۔ اس کنارہ کشی کے لیے انہیں کسی جواز کی ضرورت تھی، چنانچہ جواز بھی پیدا کر لیا گیا اور ضلع فرخ آباد کے ایک گاؤں چورا چوری میں کانگرس کے ایک جلوس میں سے چند ہندوؤں نے نکل وہاں کے تھانہ پولیس کو آگ لگا دی اور وہاں کے ایک سب انسپکڑ اور ۲۱ سپاہیوں کو تھانے کے اندر ہی جلا کر ڈھیر کر دیا، مسٹر گاندھی نے فی الفور بردولی کے مقام پر کانگرس ورکنگ کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا۔ جس میں اس واقعہ کو جس میں ان کا اپنا ہاتھ بھی تھا۔ بہانہ بنا کر تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت سے کانگرس کی واپسی کا اعلان کر دیا۔ اور ان دونوں تحریکوں کے سلسلے میں کانگرس کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی اس فیصلے پر محمد علی جوہر لالہ لاجپت رائے اور موتی لعل نہرو جیسے لیڈروں نے گاندھی جی سے کہا، کہ یہ فیصلہ اس وقت کیا جا رہا ہے، جب یہ تحریک کامیابی کے ساحل کے بالکل قریب آ پہنچی ہے۔ لیکن مسٹر گاندھی نے پہلے ہی سے فیصلہ کر رکھا تھا۔ کہ وہ اس میں مزید شرکت کرنا پسند کرتے ہی نہیں اس سے انہوں نے اپنے فیصلے کو اٹل قرار دیا، اس سے اس تحریک کی کمر ٹوٹ گئی۔

ادھر ترکی میں خلافت کے تصور کو ہی ختم کر دیا گیا، اور آزاد جمہوریہ ترکی وجود میں آگیا۔ جس مقصد کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں نے اس قدر عظیم قربانیاں دیں، جیل میں گئے مال و متاع لٹایا حکومت سے دشمنی مول کی اور اپنا مستقبل غیر یقینی بنوایا۔ اور غیر ملکوں میں

Marfat.com

جاکر اس کا پروپگنڈہ کیا، وہ سب آزادی ترکیہ کے بعد بے سود ہو کر رہ گیا۔ معاہدہ صلح لوزان عمل پیرا ہوا۔ اور دوسری قوموں کا دخل ختم ہوا۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکوں نے خلافت کا نشان بھی مٹا دیا اور اعلان کیا کہ ترکیہ اب مزید خلافت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا، یہ خبر اہل ہند بالخصوص مسلمانان ہند کے لیے نہ صرف ناقابل یقین تھی، بلکہ سخت دلسوز و دلدوز قسم کی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی مولانا محمد علی جوہر نے مصطفےٰ کمال پاشاہ کو ایک تار روانہ کیا۔ کہ خلافت برقرار رکھی جائے لیکن اسے حکومت نے یہ کہہ کر رد کر دیا۔ کہ جب تک حکومتِ ترکیہ اس وفد کی آمد کی اجازت نہ دے گی۔ اس وقت تک اس وفد کو روانہ نہیں کیا جا سکتا، اور وہ اجازت کبھی بھی نہ ملی۔

اس کے بعد تحریکِ خلافت نے خلافت کمیٹی کی وساطت سے سعودی عرب کی طرف رخ کیا۔ اس لیے کہ وہاں ہر ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو کسی فرد واحد کی نہ ہو، بلکہ مسلمانان عالم کی ہو۔ لیکن اس محاذ پر خلافت کی تحریک کو چنداں کامیابی نصیب نہ ہوئی، ۱۱ جون ۱۹۲۶ء کو سعودی عرب پر ابن مسعود نے بادشاہت کا اعلان کر دیا، اس پر محمد علی جوہر نے حج کے موقع پر عالمی سطح کے نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ لیکن اس موقف پر خود مخالف کمیٹی میں انتشار پیدا ہو گیا تو اس ضمن کے حامی ہوئے کہ اگر کوئی شخص بادشاہت کا اعلان کر ہی دیتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں لینا چاہیئے کہ وہ مقاماتِ مقدسہ کا واحد مالک بن گیا ہے اور وہ تمام مسلمانوں کا راستہ روک لے گا دوسرے گروہ کا خیال تھا۔ کہ مقاماتِ مقدسہ والی زمین پر کسی شخص کو بادشاہ کہلانے کا حق نہیں ہے چنانچہ جب تک یہ مقدس علاقے ترکوں کے تسلط میں رہے ہیں، اس وقت ترک حکمران خود ان علاقوں کا "خادم الحرمین" کہلاتے رہے ہیں۔ تاکہ اس قسم کے فروعی اختلاف کی وجہ سے بدقسمتی سے مولانا کو چنداں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اور خود مجلسِ خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ چپقلش بھی کسی خارجی عنصر کی ڈپلومیسی کا نتیجہ ہی تھی، جس نے پورے مشرقِ وسطیٰ میں مسلمانوں کو پارہ پارہ کرنے میں اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لا کر ہمت کی تھی تاہم مولانا محمد علی جوہر مسلمانان ہند کے مفادات کے حصول کے جذبے سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔ اور یہاں کے مسلمانوں کی افادیت کے لیے زندگی وقف کر دی، اس کے بعد تحریک خلافت عملاً ختم ہو کر رہ گئی۔

Marfat.com

تحریکِ خلافت کے نتائج واثرات:

تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

۱۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی نے نہ صرف مسلمانانِ ہند کو عالمی سطح پر شرمندہ کیا۔ جب کہ ہندوؤں کے ہاتھوں خود مالی، اقتصادی اور ذہنی طور پر شکار بنوایا۔

۲۔ تحریکِ عدم تعاون میں مسلمانوں نے ہر میدان میں نقصان ہی اٹھایا۔ لیکن انہیں کسی بھی طرف سے فائدہ حاصل نہ ہوا۔ ان کے بچوں کی تعلیم کا ستیاناس ہوا۔ کلاسوں کے بائیکاٹ کی وجہ سے بچوں کے تعلیمی سال برباد ہوئے، بازاروں میں ہڑتالیں کرانے سے مالی و تجارتی نقصانات ہوئے، اور اس کی تلافی جلد ممکن نہ تھی۔

۳۔ انگریز کو خوشی کا موقع مِل گیا، کہ اس کی پالیسی اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بالکل کامیاب رہی۔ اور اب مسلمانوں کو اسلام نوازی پر شکست ہوئی ہے، انگریز کے لیے سب سے زیادہ تفاخر کی بات یہ تھی کہ ایک بھائی کو دوسرے ایسے بھائی سے شکست ہوئی ہے جس کی خاطر پہلا بھائی جان تک قربان کر گیا ہے۔

۴۔ علماء کے فتوؤں پر سرکاری ملازموں نے مختلف عہدوں سے استعفیٰ دے دیا، جس سے وہ اقتصادی و معاشی بحران میں بُری طرح مبتلا ہو گئے۔

۵۔ ہجرت کے دوران ہزاروں مسلمانوں بے گناہ مارے گئے، سینکڑوں کے گھر برباد ہوتے اور بے اندازہ رقوم ضائع ہوئیں۔

۶۔ گاندھی کی سازش پر ہندو مسلم اتحاد کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ اور ہندوؤں نے کانگرس ہی کے ذریعے ایسے اقدام اٹھانے شروع کر دیئے، جس سے فرقہ وارانہ منافرت پھیلنا شروع ہو گئی۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ گاندھی نے ہندوؤں کو احساس دلا دیا۔ کہ وہ خواہ مخواہ کئی سالوں سے مسلمانوں کے مقصد کے لیے اپنی توانائی ضائع کر رہے ہیں کیونکہ اگر کسی صورت میں تحریکِ خلافت کامیاب ہو بھی جائے تو اس سے ہندوؤں کو کوئی قطعی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ چنانچہ گاندھی نے اس اتحاد کو توڑنا ہی اپنے لئے مفید گردانا، ہندو ذہنیت کبھی مسلم افادیت کو برداشت نہیں کر سکتی۔

۷۔ مولانا محمد علی جوہر جو نہایت خلوص دل سے تحریک کی خدمت کر رہے تھے، بہت سے عاقبت نااندیش لوگوں کی تنقید کا نشانہ بن گئے۔ اگرچہ ان کے متبعین کے کردار نے ان مشکوک

Marfat.com

مزاج افراد کی غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔

۸ ۔ پورے عالم اسلام کو اس بات کا کم از کم احساس تو ہو گیا۔ کہ ہندوستان کے مسلمان اگرچہ انگریز کے جنگل میں پھنسے ہوئے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں اخوت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے، اور ان کی ہمدردیاں فعال نوعیت کی ہیں۔

۹ ۔ انگریز کو اس حقیقت کا پتہ چل گیا، کہ مسلم قوم اگرچہ اپنے بھائی کی خاطر اس قدر جانفشانی سے لڑ سکتی ہے، تو وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کیوں نہ لڑے گی۔

۱۰ ۔ انگریز پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی، کہ مسلمان جب برسرپیکار ہوتا ہے۔ تو وہ ہر طرح کی سنگلاخ زمین سے گذرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مولانا محمد علی جوہر کی قابلیت، اہلیت اور بے باکی نے تو ہندوستان کے وائسرائے تک کو سخت متاثر کیا۔ انگلستان، اور فرانس میں اس بات کا بالوضاحت پتہ چل گیا، کہ مسلمان زبان، زر، زور بازو کے علاوہ زور کلام کے ذریعے بھی میدان جیت لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

Marfat.com

سائمن کمیشن ۱۹۲۷ء

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں ایک شق یہ بھی تھی کہ حکومت مانٹیگو چیمسفورڈ آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے اور اس کے ردعمل کو جاننے کے لیے ایک مخصوص مدت کے بعد ایک کمیشن مقرر کرے گی۔ جو مناسب ترامیم کی سفارش کر سکے گا۔ حکومت کے خیال کے مطابق مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات باشندگانِ ہند پر ایک احسانِ عظیم تھا۔ لیکن اس کے برعکس ہندوستان کے عوام ان اصلاحات سے قطعی طور پر مطمئن نہ تھے۔ بلکہ ان اصلاحات کو انہوں نے اپنی توقعات کے برعکس ہی بنایا۔ تاہم کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ کا ہونا غنیمت تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت عوام کا دل جیتنے میں ناکام رہی تھی تاہم ہندوستان کے وائسرائے نے برطانوی حکومت کی ہدایت پر مذکورہ مقصد کے لیے ایک کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۲۷ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اردن تھے۔ انہوں نے ۸۔ نومبر ۱۹۲۷ء کو سر جان سائمن کی قیادت میں یہ کمیشن مقرر کیا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ ملک کے دستوری مسائل کا جائزہ لینے کے بعد ایک مفصل رپورٹ پیش کرے جن میں وہ نئی اصلاحات اگر کوئی مناسب نوعیت کی ہوں کا تفصیلی ذکر کرے سر جان سائمن کو حکومت نے مدد کے لیے ہندوستان کے عوام کے مسائل و جذبات و احساسات اور خیالات کی ترجمانی کرنے کے لیے جتنے بھی ارکان مقرر کیئے گئے۔ وہ سب کے سب انگریز تھے۔ ان میں سے ایک بھی ہندوستان کا باشندہ نہیں تھا اور نہ ہی ان میں کوئی ایسا انگریز تھا۔ جس کی ہمدردیاں ہندوستان کے عوام کے ساتھ وابستہ ہوں حالانکہ جس وقت اس کمیشن کے تقرر کی خبر ہندوستان کے اکابرین ملت کو ملی۔ تو انہوں نے باقاعدہ اعلانیہ انداز میں انگریزوں کو احساس دلایا۔ کہ ہندوستان کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے اور ہندوستانی جذبات کی ترجمانی کے لئے ہندوستان کے باشندوں کو بھی اس کمشن کا رکن بنایا جائے تاکہ اگر کمیشن نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہی ہے تو ان ارکان کو باشندگان ہند کے مزاج کا پتہ تو چل سکے۔ بالخصوص مسٹر محمد علی جناح نے عوامی جذبات کی ترجمانی کی ذمہ داری

Marfat.com

خود سنبھالنے کا اعلان کیا انہوں نے عوامی سطح پر مختلف حلقوں میں مختلف افراد سے رابطہ قائم کیا۔ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے ملاقی ہوئے اور ان سب کی متفقہ رائے کے تحت ایک بیان جاری کیا۔ جس میں حکومت کو مطلع کیا گیا کہ کمیشن میں ہندوستانی نمائندوں کو شامل نہ کرنا حکومت برطانیہ کی ایک بنیادی غلطی ہے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ تجاویز کہ مرکزی صوبائی مجالس مقننہ کو کمیشن کے سامنے سفارشات پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی اور پھر کمیشن مشترکہ پارلیمانی پارٹی سے "گفت وشنید" کرے گا۔" حقیقت میں ان تقاضوں کو ہرگز پورا نہیں کرتیں جن سے اس وقت ہندوستان کے عوام متعلق ہیں۔ اور بنیادی طور پر کمیشن کے سامنے ہندوستانیوں کو ضروری مواد پیش کرنے اور شہادتیں دینے کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے اس کے علاوہ ہندوستانی عوام کو اس کمیشن میں صرف اس حد تک عمل ودخل ہوگا۔ کہ وہ اس کمیشن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ان تجاویز مثبت انداز میں اپنے سروں کو ہلا دیں اور کمیشن کی تمام ان تجاویز کو احسن اور قابل قبول دے دیں جو وہ برطانوی مفادات کے پیش نظر حکومت کو پیش کرے۔ حکومت برطانیہ کو اس کمیشن تقرر سے قبل واضح الفاظ میں آگاہ کیا گیا کہ اگر واقعی حکومت برطانیہ ہندوستان کے عوام کی محسن بن کر انہیں آئینی مراعات دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اور خلوص نیت سے ہوری زندگی بحال کرنے کی جانب گامزن ہے تو اس کمیشن کے ارکان میں ارکان کی کل تعداد کا کم از کم نصف ہندوستان کے عوام کے نمائندوں میں سے منتخب کیا جائے۔ ورنہ بصورت دیگر اس کمیشن کے سے استبدادیت فرنگی کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اور دنیا کی نظر میں ڈھول بھونکنے کے علاوہ کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ سب کچھ ہوتے کے باوجود حکومت برطانیہ نے کسی ایک کی سنی اور ۸۔ نومبر ۱۹۲۷ء کو اس کمیشن کا اعلان کر دیا۔ جس کا ڈھانچہ اس نے اپنی مرضی سے تیار کیا تھا ظاہر ہے کہ اس صورتحال میں اس بن بلائے اور ناپسندیدہ مہمان کی خاطر مدارت کس دل کی ہو سکتی ہیں۔

سائمن کمیشن اپنے تمام جہیز کے ساتھ ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو بمبئی پہنچا۔ اس کی آمد سے پیشتر تمام لیڈروں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ کہ ہر ممکنہ انداز میں اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لارڈ اردن نے اس کمیشن کی آمد سے ایک روز قبل مرکزی اسمبلی میں تمام ارکان سے اپیل کی تھی کہ آنے والے کمیشن کے ساتھ بھرپور تعاون کریں۔ لیکن اس کی اپیل کا غیر سرکاری ارکان پر بالخصوص کوئی اثر نہ ہوا۔ فروری ۱۹۲۸ء میں جب کہ اسمبلی کا بجٹ سیشن

Marfat.com

شروع ہونے والا تھا، اس میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قرارداد کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا راجہ غضنفر علی خان، نواب اسمٰعیل خان، لالہ لاجپت رائے اور مسٹر جناح جیسے اکابرین نے پہلے ہی اس سلسلے میں ملک میں ایک ایسی لہر دوڑا دی تھی جس سے عدم تعاون کے جذبات مجسم نظر آنے لگے تھے۔ پہلے پہل نواب اسمٰعیل خاں نے بائیکاٹ کرنے کے مسئلہ کو اس لیے پسند نہ کیا کیونکہ اس سے انہیں اندیشہ تھا کہ اس بائیکاٹ کے آخری نتائج کانگرس کی تقویت میں موثر ثابت ہوں گے۔ لیکن جب انہوں نے اتفاق رائے کا اظہار کر دیا۔ اس اندیشے کا سبب ماضی کے وہ ہندو مسلم تضادات تھے۔ جو گذشتہ کئی سالوں میں رونما ہوئے تھے۔ یہی تضادات بالآخر ہندو مسلم فسادات کا باعث بھی بنے تھے۔ بالخصوص شدھی کی تحریک، سنگھٹن کی تحریک، ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ، مسجدوں اور مسلم عبادت گاہوں کے قریب ہندوؤں کے باجوں کا استعمال، ہندی اردو کا مسئلہ، محرم، رام لیلا، عیدالاضحےٰ اور ہولی وغیرہ کے تہواروں پر ایک دوسرے کے معاندانہ رویے کا موجب تھے۔ اور انہی تضادات کی بنا پر دونوں قوموں میں یہ شعور پختہ ہو چکا تھا کہ مذہبی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے ہندو مسلم کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے تاہم اسی قسم کے خیالات و احساسات بالآخر تقسیم ملک کا بھی موجب بنے۔

بالآخر ۱۶۔ فروری ۱۹۲۸ء کو لالہ لاجپت رائے نے جو اسمبلی کے رکن تھے، سائمن کمیشن سے بائیکاٹ کی تحریک پیش کردی۔ یہ تحریک ۶۲ کے مقابلے میں ۶۸ ووٹوں سے منظور کرلی گئی اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ مرکزی اسمبلی نے کمیشن کے ساتھ بیٹھنے کے لیے جن تین نمائندوں کو منتخب کر کے روانہ کرنا تھا۔ وہ اب نہ بھیجے جائیں اور انہیں حکومت اگر منتخب کر ہی لے تو وہ از خود کمشن کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیں۔ حسب پروگرام کونسل آف سٹیٹ نے تین نمائندوں کو کمیشن کا ساتھ دینے کے لیے منتخب کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگائی کہ یہ نمائندے کمیشن کی طرف ان معاملات میں رہنمائی کریں گے۔ جن کے بارے میں کمیشن خود ضرورت محسوس کرے ان نمائندوں کی کمیشن کی رپورٹ میں بطور سفارش کوئی آواز ٹھوس نوعیت نہیں رکھے گی۔

بدقسمتی سے انہی دنوں مسلم لیگ میں کچھ انتشار آمیز عناصر پائے جانے لگے تھے۔ تجاویز دہلی ہندو مسلم فسادات، کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین رابطوں اور زندگی کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے کردار کے موضوعات کے پیش نظر مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک حصہ "جناح لیگ" اور دوسرا حصہ "شفیع لیگ" کہلانے لگا تھا۔ سر محمد شفیع کے ساتھیوں میں سر فضل حسین

Marfat.com

علامہ اقبال مولانا حسرت موہانی اور سر ذوالفقار علی خان کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ تمام مسلم اکابرین مثلاً نواب اسمٰعیل خان وغیرہ نے مسٹر جناح کی حمایت کی اگرچہ یہ انتشار بالکل عارضی نوعیت کا تھا لیکن دشمن نے اس سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ دو سال کے اس اختلافی نظریات کے زمانے میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی نیت کا زیادہ واضح انداز میں پتہ چل گیا۔

اسی اختلافی نظریات کی بنا پر سر شفیع نے کمیشن کی حمایت کے ارادے کا اظہار بھی کر دیا۔ سر شفیع نے اس حمایت کے لیے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ یہ مخالفت ان امور کے لیے مول نہیں لینا چاہتے جن سے ہندوستان میں صرف ہندو کو تقریب ملے۔ ان کے خیال میں انڈین نیشنل کانگرس ایک ہندو تنظیم تھی۔ اس میں مسلمانوں کی شرکت محض خود فریبی تھی۔ اور وہ سمجھ گئے تھے کہ ہندو کا ہر قدم سیاست کے میدان میں بالخصوص مسلمان کے مفادات کے خلاف ہی اُٹھے گا۔ اور وہ کبھی اس تحریک میں اس وقت تک شامل نہیں ہو گا۔ جب تک اسے یہ واضح طور پر پتہ نہ چل جائے کہ اس میں بالو کھلے بندوں ہندو افادیت کا تحفظ ملتا ہے۔ یا اس سے کم از کم مسلم مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر وہ سمجھتے تھے کہ کانگرس کا مطالبہ بڑا سیدھا سادہ ہے۔ اور اسے ساری دنیا جانتی ہے کہ تمام ملک میں جمہوری اقدار کے مطابق اختیارات کو تفویض کیا جانا چاہیئے۔ اس مطالبے میں جمہوری انداز کا نکتہ وانشگاف الفاظ میں ہندو ذہنیت کی بدنیتی کی ترجمانی کرتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو براہِ راست ہندوؤں کے ماتحت کر دیا جائے۔ چنانچہ اس مطالبے کی موجودگی میں ہندوؤں کا سائمن کمیشن سے بائیکاٹ کا مقصد مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا نہیں ہو گا۔ بلکہ ان کے اپنے مطالبات کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے مترادف ہو گا۔ سر شفیع کے خیال میں مسلمانوں کا مقصد صرف انگریز سے حصول آزادی نہیں۔ بلکہ ان کے پیش نظر آزادی کی بھی ایک خصوصی نوعیت تھی۔ علامہ اقبال انہیں اس آزادی کے تصور سے باتوں باتوں میں آگاہ کر چکے تھے۔ چنانچہ اس صورت حال میں سائمن کمیشن کا صرف اس مقصد کے لیے ساتھ دینا کہ ہندوؤں نے اس کمیشن کو پسند نہیں کیا۔ زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو گا۔ تاہم ہندوستان بھر میں سائمن کمیشن کی مخالفت ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

ہندوستان بھر میں کمیشن کے خلاف ہنگامے:۔ بمبئی سے دہلی پہنچ کر اس کمیشن کے سربراہ سر جان سائمن نے

Marfat.com

اعلان کیا کہ وہ آئینی مسائل میں ہندوستان کے منتخب ارکان کی آرا کی قدر کرے گا اور ان میں سے چند ایک ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بھی بنائے گا۔ جو ہمہ وقت اس کے ساتھ رہے گی لیکن ہندوستان کے لوگ اس اعلان سے قطعی طور پر مطمئن نہ تھے "تاہم پروگرام کے مطابق کونسل آف سٹیٹ نے اپنی طرف سے تین ارکان اس مقصد کے لیے منتخب کر دیئے اور حکومت نے اسمبلی کے نمائندے بھی نامزد کر دیے۔ اور کمیشن نے اپنا دورہ ہندوستان شروع کر دیا۔ ہندوستان کے اس دورہ میں مختلف شہروں میں جگہ جگہ مخالفانہ مظاہرے ہوئے۔ پولیس اور عوام کے درمیان مسلح تصادم بھی ہوئے۔ لکھنؤ میں پولیس نے عوام پر شدید لاٹھی چارج کیا۔ اس لاٹھی چارج کی زد میں ہندوؤں کے لیڈر رنزادے یعنی پنڈت موتی لال نہرو کے بیٹے پنڈت جواہر لال نہرو کو پولیس کی لاٹھیوں سے ضربیں آئیں۔ اس کے علاوہ انڈین نیشنل کانگرس کے سرگرم رکن پنڈت گووند بلبھ پنت بھی عصائے عسکر کی زد سے محفوظ نہ رہے۔ دہلی، لکھنؤ اور دیگر ہندوستان شہروں کے علاوہ سب سے زیادہ شدید مظاہرہ اس کمیشن کے خلاف لاہور میں ہوا۔ لاہور میں ہونے والے اس مظاہرے کے کارنامے کی تصویر سید نور احمد نے اپنی کتاب "مارشل لاء سے مارشل لاء تک" میں ان الفاظ میں کھینچی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو یہ کمیشن ریل کے ذریعے لاہور پہنچا۔ ریلوے سٹیشن پر اس کے استقبال کے لئے اعلیٰ سرکاری افسر اور کئی غیر سرکاری نمائندے موجود تھے۔ پلیٹ فارم پر اور سٹیشن کے باہر پولیس کے سخت انتظامات تھے۔ دوپہر کے قریب مظاہرین کا ایک جلوس کالی جھنڈیاں اٹھائے اور سائمن گو بیک کے نعرے لگاتا ہوا موچی دروازے کے باہر سے چلا۔ جن راستوں پر اس دن جلوس نکالنے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں چھوڑ کر یہ جلوس دہلی دروازے کی طرف گیا۔ وہاں سے لنڈے بازار کا رخ کیا۔ جلوس کی قیادت کرنے والوں میں لالہ لاجپت رائے۔ مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالقادر قصوری اور کئی ہندو کانگریسی لیڈر شامل تھے۔ لالہ لاجپت رائے نیم کانگریسی اور نیم مہاسبھائی قسم کے بزرگ تھے اور اس لئے ہندوؤں میں بے پناہ اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ وہ باضابطہ کانگریسی اور کانگرس کے احکام کے پابند نہ تھے لیکن اس موقع پر بطور خاص انہوں نے اس جلوس کا (جو کانگرس کے زیر اہتمام نکالا گیا تھا) ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا۔ تقدیر انہیں کشاں کشاں موت کی طرف لے جا رہی تھی۔

لنڈے بازار کے اختتام کے قریب سڑک پر خار دار تاروں کا جنگلہ ریلوے سٹیشن کی

حد ود سے دو سو گز کے قریب لگا ہوا تھا۔ جلوس یہاں رُک گیا۔ اور کمیشن کے خلاف نعرے لگاتا رہا۔ خاردار تار کی فصیل کے باوجود تھوڑی دیر کے بعد اس جلوس اور پولیس کے درمیان تصادم ہوگیا۔ ایک پولیس افسر مسٹر سکاٹ غصے میں بھرا ہُوا مظاہرین کی جانب لپکا اور اس نے اگلی قطاروں پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ ایک ڈنڈہ رائے زادہ ہنس راج کو لگا۔ ایک سے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو زخمی ہوئے۔ اور تین ضربیں لالہ لاجپت رائے پر پڑیں۔ جن میں ایک ضرب دل کے قریب تھی۔ فوری طور پر اس کا زیادہ اثر محسوس نہ ہوا۔ اسی شام ایک پبلک جلسے میں لالہ لاجپت رائے نے تقریر کی۔ لیکن وہ ایک روز کے بعد اس چوٹ کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہوگئے اور پھر بستر سے نہ اُٹھ سکے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو شیر پنجاب (وہ ہندوؤں میں اسی خطاب سے مشہور تھے) لاجپت رائے کا انتقال ہوگیا۔ یہ تصادم کس طرح ہوا؟ اس سے متعلق حسب معمول دو بیان تھے۔ جلوس والوں کی طرف سے خود لالہ لاجپت رائے نے اسی شام کو ایک اجتماعی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جلوس نے جنگلے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی تھی مظاہرین قطعاً پُرامن تھے، اور صرف نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں سے مشتعل ہو کر "سکاٹ" نے ان پر حملہ کر دیا۔

اگلی صبح کو جو سرکاری بیان شائع ہوا کہ خاردار تاروں کی جو رکاوٹ قائم کی گئی تھی وہ سڑک کی پوری چوڑائی کے مطابق نہ تھی۔ تھوڑی سی جگہ خالی رہ گئی تھی۔ مظاہرین نے اس جگہ گھیرا توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔

بعد میں پنجاب کی مجلسِ قانون ساز، مرکزی اسمبلی اور برطانوی پارلیمنٹ میں اس واقعے کے متعلق سوالات پوچھے گئے اور مزید تحقیقات کے مطالبے کئے گئے لیکن حکومت نے مزید تحقیقات سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اس کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں پنجاب میں چند دہشت پسند نوجوانوں کی خفیہ پارٹی نے اس واقعے کا بدلہ لینے کا تہیہ کیا لیکن تقدیر نے ستم ظریفی سے کام لیا جو حرکت سکاٹ نے کی تھی۔ اس کی پاداش میں ایک دوسرے بے گناہ انگریز افسر سانڈرس کی جان گئی۔

یہ واقعہ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیش آیا۔ مسٹر سانڈرس لاہور کا ایس پی تھا۔

اس مخالفت کے باوجود سائمن کمیشن نے اپنا کام جاری رکھا اور آخر کار ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو پورے ہندوستان کے دورے کے بعد واپس عازم برطانیہ ہوا۔ اور اس نے اپنی

Marfat.com

رپورٹ حکومت برطانیہ کو پیش کر دی۔ ان دونوں ہندوستانی امور کے متعلق برطانوی کابینہ میں مسٹر برگن ہیڈ بطور وزیر کام کر رہے تھے وہ دلی طور پر ہندوستانیوں سے چڑتے تھے۔ اور انہیں خاص طور پر بلکہ صرف انسانی سطح پر نفرت تھی۔ ظاہر ہے ایسا شخص ہندوستان کے لوگوں سے کس طرح ہم خیال ہو سکتا ہے اور کس طرح ان کی بہبود کے لئے کام کر سکتا ہے۔

بہرحال رسمی طور پر اس کمشن کی رپورٹ کو منظر عام پر لانا ہی تھا اس لئے مئی ۱۹۳۰ء میں کمیشن کی رپورٹ کو شائع کر دیا گیا۔ اس رپورٹ میں جن اہم امور پر تفصیل سے بحث کی گئی تھی وہ حسب ذیل تھے۔

۱ ۔ پورے ہندوستان کے لیے ایک آئینی لائحہ عمل ہونا چاہیئے۔ جس کے تحت مجموعی طور پر اس ملک کو آئینی زندگی دی جا سکے اور آئینی فریم ورک بھی تیار کیا جائے۔

۲ ۔ پورے ملک کو صوبائی سطح پر تقسیم کیا جاوے۔

۳ ۔ ہندوستان میں فیڈرل طرز حکومت قائم ہو۔

۴ ۔ صوبائی حکومتیں بنانے کے لئے متعلقہ گورنروں کو اختیار دے دیا جاوے تاکہ وہ ارکان اسمبلی میں سے ان افراد کو وزارت کا قلمدان سنبھالنے کے لیے منتخب کر سکیں۔ جن کو پارٹی اکثریت حاصل ہے۔

۵ ۔ گورنروں کو یہ بھی آزادی دے دی گئی کہ وہ صوبائی سطح پر وزیر کا انتخاب کرتے وقت کسی وزیراعظم یا وزیراعلیٰ کی ہدایات کی پابندی کریں۔

۶ ۔ بالغ رائے دہی کو زیادہ سے زیادہ حد تک کام میں لایا جائے۔

۷ ۔ سندھ اور اڑیسہ کو صوبائی سٹیٹس دینے کے لیے مزید غور و فکر کیا جائے اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے امور کو ماہرین ریاضیات کی ایک کمیٹی کے سامنے جائزہ لینے کے لیے پیش کیا جائے۔

۸ ۔ برما کو حکومت ہند سے فی الفور علیحدہ کر دیا جائے۔

۹ ۔ آئینی اصلاحات کے لیے سب سے پہلے شمال مغربی سرحدی صوبہ سے کام شروع کیا جائے۔ اس لیے اس صوبے کو لیجسلیٹو کونسل دینے کے علاوہ اسے مرکزی آئین ساز اسمبلی میں بھی استواریت دی جائے۔

۱۰ ۔ اسمبلی میں رکنیت کے لیے جو ارکان منتخب ہوں، وہ بلحاظ آبادی ہوں۔

Marfat.com

۱۱ ۔ ہر صوبے سے کونسل آف سٹیٹ میں نمائندگی کے لیے کم از کم تین ارکان ہوں ۔

۱۲ ۔ مرکز کو مضبوط رکھنے کے لیے صوبوں کی طرف سے پوری پوری مدد حاصل رہنی چاہیئے، اور کوئی قدم ایسا نہیں اٹھنا چاہیئے جس سے مرکزیت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو

۱۳ ۔ جہاں تک انتظامیہ کا تعلق ہے اس میں کمیشن نے صرف اس قدر التفات کیا کہ انتظامیہ میں ترتیب وار آہستہ آہستہ اصلاحات کی جانا چاہئیں تاہم کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہ کیا۔ انتظامیہ کی بہتری کے لیے لفظ "GRADUALNESS" پر زور دیا گیا۔

۱۴ ۔ اسی طرح صوبوں کو انتظامی اور آئینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آہستہ آہستہ ترقی کرنے کی تلقین کی گئی، کیونکہ اگر تمام صوبوں کو فی الفور تمام اختیارات خود مختاری تفویض کر دیئے گئے تو (کمیشن کے خیال کے مطابق) بہت ممکن ہے، یہ ملک ترقی معکوس کی طرف پلٹ جائے اور ملک کے حالات بہتر ہونے کی بجائے زیادہ خراب ہو جائیں ۔

۱۵ ۔ وسیع تر ہندوستان بنانے کے لیے ایک کونسل تشکیل دی جائے جس میں تمام حالات کا بغور جائزہ لیا جائے اور اس سے پیدا ہونے والے تاثرات کو پہلے سے ہی جانچ لیا جائے۔ وسیع تر ہندوستان سے مراد برٹش انڈیا اور ریاستوں کا اشتراک تھا یہ یہ کونسل ایک ایکٹ کا مسودہ تیار کرے جس میں وسیع تر ہندوستان کے قیام کے اُن مقاصد کا جائزہ تمہید کے طور پر لیا جائے جو وسیع تر ہندوستان کی تشکیل سے حاصل ہوں گے

جہاں تک اس کمیشن نے ہندوستان کے عام حالات کا جائزہ لیا، اس میں فرقہ وارانہ صورت حال کو بے حد مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا گیا اور رپورٹ میں یہ بات درج بھی کر دی گئی کہ بہت ممکن ہے کہ اگر کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد کی کوشش کی گئی تو فرقہ وارانہ گڑبڑ اس پر غلط اثر انداز ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظریات کو خود کمیشن نے مخالفانہ انداز میں اچھالنے کی کوشش کی۔ سر سائمن نے اپنی رپورٹ میں اس امر کا اعتراف کیا کہ جمہوریت کا مطالبہ کرنے والی سب سے زیادہ سرگرم جماعت انڈین نیشنل کانگرس دراصل ایک مذہبی جماعت ہے جس نے سیاست کا روپ دھارا ہوا ہے اور سادہ لوح مسلمانوں کو محض مطالبات کی ظاہری کشش سے لالچ دے رہا ہے اور کچھ مسلمان ہندو کے لالچ میں آچکے ہیں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رپورٹ مسلم مطالبات کے حق میں تھی لیکن مجموعی طور پر اس کو پورے ہندوستان

Marfat.com

میں ناپسند کیا گیا۔ جس کی بہت سی وجوہات حسب ذیل تھیں۔

۱۔ کمیشن میں بحیثیت رکن کوئی ہندوستانی نمائندہ شامل نہیں تھا۔

۲۔ کمیشن کو یہاں آنے سے پہلے تصویر کا ایک رُخ دکھا کر بھیجا گیا تھا اور دوسرے رُخ کی طرف توجہ نہ کرنے ہی کو مصلحت قرار دیا گیا۔

۳۔ کمیشن کے قیام کا مقصد اگرچہ آئینی اصلاحات کا جائزہ لے کر عوام کو جمہوریت سے نوازنا تھا لیکن اس کی رپورٹ میں "تاخیر" کے ساتھ بحالی جمہوریت کی تلقین کی گئی۔

۴۔ مخالف مظاہروں کے باوجود اس کمیشن نے نہایت ڈھیٹ پن سے اور سرکاری تحفظ کے تحت اپنا کام جاری رکھا جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی سفارشات میں حمایت عوام کی بجائے حمایت حکومتِ برطانیہ ہی کارفرما ہوگی۔

۵۔ نفسیاتی طور پر بھی کمیشن عوام سے ہمدردی نہ کر سکتا تھا کیونکہ ان کے خلاف پورے ملک میں زہر اگلا جا رہا تھا اور اس سلسلے میں بہت سی قیمتیں جانیں بھی ضائع ہو گئی تھیں۔

Marfat.com

نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء

سوال :- نہرو رپورٹ کیوں تیار کی گئی۔ اس کے مندرجات سے مسلمانوں کے مفادات کو کس حد تک فائدہ یا نقصان پہنچا اور اس کا رد عمل کیا ہوا، تفصیل سے بحث کیجیے؟

برکن ہیڈ کی طنز :- سائمن کمیشن نے ابھی اپنی سفارشات حکومت برطانیہ کو پیش بھی نہ کی تھیں کہ برطانوی وزیر امور ہند "مسٹر برکن ہیڈ" پہلے ہی سے برہم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں ہندوستانی اس قابل نہ تھے کہ انہیں جمہوری اقدار سے آشنا بھی کرایا جائے، اس کے برعکس ہندوستان والوں میں سیاسی شعور اس قدر بیدار ہو چکا تھا کہ وہ کسی قسم کی مزید مزاحمت کو برداشت کرنے کی بھی سکت نہ رکھتے تھے۔ اپنی چڑچڑی مزاج کی بنا پر مسٹر برکن ہیڈ نے پارلیمنٹ میں ہندوستانی عوام کے بارے میں بڑی اہانت سے بیان دیتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان کے لوگ اس حد تک ایک دوسرے سے بیزار ہیں اور ان میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسا دستور اساس بھی تیار نہیں کر سکتے جس پر وہ متفقہ طور پر راضی ہو جائیں"

انڈین نیشنل کانگرس نے اس ریمارک کو ایک چیلنج قرار دے دیا، اور اس طنز کا جواب دینے کے لیے ۱۲ر فروری ۱۹۲۸ء کو ایک "آل پارٹیز کانفرنس" بمقام دہلی بلائی۔ اس میں ہندوؤں مسلمانوں اور دوسری اقوام کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ ان کے درمیان یہ طے پایا کہ آئندہ دستور پر اس تصور کے ساتھ گفتگو کی جائے کہ ہندوستان میں کامل ذمہ دار حکومت قائم ہو گی دوسرا سوال اس میں یہ پیش کیا گیا کہ فرقہ وارانہ تناسب اور تعلقات کس طرح قائم ہو۔ بقول حسن

Marfat.com

ریاض، دو مہینے کے اندر آل پارٹیز کانفرنس کے ۲۵ اجلاس منعقد ہوئے لیکن کچھ فیصلہ نہ ہوا آخر کار ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں پھر ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ دریں اثنا ہندوؤں نے اس قدر کھل کر مسلمانوں کی مخالفت کی کہ ملک بھر میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ بہرحال ڈاکٹر انصاری۔ مولانا شوکت علی اور مسز بیسنٹ مسٹر گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو کے ذاتی دوست بھی تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی اسی کانفرنس میں ایک مشترکہ اعلامیہ کے تحت ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمے ہندوستان کا دستور مرتب کرنے کا کام لگایا گیا۔

مولانا شوکت علی نے مسٹر گاندھی کی اس تجویز کی تائید کی۔ چنانچہ مندرجہ ذیل عہدیداران کو نام نہاد آئین ساز اسمبلی" کے ارکان منتخب کر لیا گیا۔

نہرو رپورٹ کمیٹی :-

۱ ۔	پنڈت موتی لال نہرو	صدر
۲ ۔	محمد شعیب قریشی	رکن
۳ ۔	مسٹر ایس ۔ ایم ۔ اینے	"
۴ ۔	مسٹر ایم ۔ آر جیکار	"
۵ ۔	سبھاش چندر بوس	"
۶ ۔	سردار منگل سنگھ	"
۷ ۔	سر علی امام	"
۸ ۔	سر تیج بہادر	"
۹ ۔	این ۔ ایم جوشی	"
۱۰ ۔	جی ۔ آر پردھان	"

اس کمیٹی کے ارکان کی تفصیل پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے لیے دستوری امور میں حصہ لینے کا تناسب کیا رکھا تھا۔ بہرحال جب اس کمیٹی کا اجلاس ہوا بدقسمتی سے سر علی امام بھی اس میں شرکت نہ کر سکے۔ کیوں نہ کر سکے، اس کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ اس کمیٹی کی تشکیل پر ہی مسلمانوں کو اطمینان نہیں تھا۔ پھر یہ کہ اس کمیٹی کو ارکان میں اضافے کا اختیار دے دیا گیا لیکن وہ اضافہ

Marfat.com

ہندوؤں نے اپنے مفادات کی خاطر ہندوؤں سے ہی کیا اور مسلمانوں کو سوائے لیبل سلیپ کے اور کوئی وقعت نہ دی۔ جس سے مسلمانوں میں اس کے بارے میں بد دلی پائی جاتی تھی۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ خود سر علی امام کسی مصلحت کی بنا پر اس میں شریک نہ ہوئے۔ بہر حال اس دس رکنی کمیٹی میں ہندوستان کی کل آبادی کے ایک تہائی حصے کی نمائندگی صرف ایک مسلم رکن کر رہا تھا اور اس کا نام محمد شعیب قریشی تھا۔

نہرو رپورٹ کی سفارشات:۔ تین مہینوں کی محنت کے بعد اس کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں تمام ایسی باتیں درج کی گئیں جو مسلمانوں کے مفادات کے قطعی خلاف اور ہندوؤں کے عین مطابق تھیں۔ ان رپورٹ کی تکمیل واحد اور مسلمان لیڈر کے دستخط موجود تھے۔ یعنی محمد شعیب قریشی کے انہوں نے بلا خوف وخطر اور بلا لحاظ ومروت کمیٹی سے اختلافی نوٹ دیا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یہ رپورٹ دہلی تجاویز کے بالکل مخالف تھی اور مہاسبھائی نکتہ نظر سے تیار کی گئی تھی۔ اس رپورٹ کی سفارشات کی تلخیص اس طرح ہے۔

۱ ۔ ہندوستان میں وحدانی طرز کی ڈمنین سٹیٹ قائم کی جائے اور اختیارات کا ارتکاز مرکز میں ہو۔

۲ ۔ جداگانہ طریق انتخاب ختم کر دیا جائے۔ کمیٹی کی رائے میں انتخاب کا یہ طریقہ قومی ارتقاء کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔

۳ ۔ مسٹر جناح کی دلی تجاویز کے مطابق نشستوں کے تحفظ کا اصول رد کر دیا گیا ہے، اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ کل آبادی کا دس فیصد مسلم آبادی والے صوبوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے نشستوں کا تحفظ کیا جائے۔

۴ ۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی نشستیں دی جا سکتی ہیں۔

۵ ۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کو مکمل صوبوں کی حیثیت دی جائے۔

۶ ۔ جنوبی ہندوستان میں ایک نئے ہندو صوبے کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۷ ۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو تسلیم نہیں کیا جانا چاہیئے۔

۸ ۔ ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی قرار دی جائے۔

Marfat.com

۹ ۔ بلوچستان کو مکمل صوبہ تصور کیا جائے ۔

۱۰ ۔ مرکزی حکومت وزیراعظم کے علاوہ چھ وزیروں پر مشتمل ہو جن کا تقرر گورنر جنرل خود کرے
ان دس سفارشوں میں آٹھ سفارشیں صریحاً مسلمانوں کے خلاف تھیں اور جو موافق تھیں وہ بالکل برائے نام تھیں ۔

جو دہلی تجاویز ۱۹۲۷ء کے مرکزی اسمبلی کے جلسے کے دوران تیار کی گئی تھیں اور ان کا پس منظر کچھ یوں تھا کہ اسی سال میں ہندو مسلم منافرت زوروں پر تھی اور جو ہندو لیڈر خود کو پورے ہندوستان کا رہنما قرار دے رہے تھے ۔ ان کو اپنی ساکھ ٹوٹتی ہوئی نظر آنے لگی مسلمان کی آئیڈیالوجی میں نمایاں فرق آیا ۔ ہندوؤں کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اس لیے انہوں نے باقاعدہ حریفانہ انداز اختیار کرنے کی ٹھانی ۔

انہی دنوں مسٹر موتی لال نہرو نے مسٹر محمد علی جناح سے باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ ہندو مسلم فساد میں اصل رکاوٹ کا باعث جداگانہ انتخاب کا طریقہ ہے جس کو مسلمان اچھال رہے ہیں اگر مسلمان اس ضد سے باز آجائیں تو کانگرس باقی تمام مطالبات فی الفور حکومت برطانیہ سے منوا سکتی ہے ۔ یہ بات مسلمان لیڈر مسٹر جناح کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھی ۔ انہوں نے پنڈت موتی لال نہرو کو مثبت یا منفی جواب دینے سے گریز کیا اور تمام مسلم پارٹیوں کے اکابرین کا ایک اجلاس دہلی میں طلب کرلیا ۔ ان دنوں مسلمانوں میں بھی تو افتراق تھا ۔ مسلمان کئی حصوں میں بٹ گئے ہوئے تھے ۔

مثلاً ! ۱ ۔ کانگرسی مسلمان

۲ ۔ نیشنلسٹ مسلمان ۴ ۔ نہرو کمیٹی کے حامی مسلمان

۳ ۔ حکومت کے طرفدار مسلمان ۵ ۔ نہرو کمیٹی کے مخالف مسلمان

اگرچہ مسلمان بہت سے حصوں میں منقسم تھے لیکن اس معاملے میں وہ مسٹر جناح کی آواز کو لبیک کہنے کے لیے یکجا ہو گئے ۔ ان پارٹیوں کے اکابرین میں سے شمولیت کرنے والوں میں مولانا محمد علی ۔ راجہ صاحب محمود آباد ۔ سر علی امام ۔ مولانا محمد شفیع داؤدی ، سر محمد شفیع ڈاکٹر انصاری اور مفتی کفایت اللہ کے علاوہ ۲۵ افراد اور بھی تھے ۔ چند ایک نشستوں کے بعد ایک متفقہ فارمولا تیار کیا گیا ۔ جس کو " دہلی تجاویز " نام دیا گیا ۔ دہلی تجاویز کی اہم باتیں حسب ذیل تھیں ۔

۱ ۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیٰحدہ صوبے کی شکل دی جائے ۔

Marfat.com

۱ - صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو باقاعدہ صوبائی مراعات دی جائیں۔
۲ - وہاں آئینی اصلاحات کا بھی نفاذ کیا جائے۔
۳ - سندھ میں مسلمانوں کو اسی طرح کی اضافی نمائندگی کی مراعات حاصل ہوں گی جس طرح ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو حاصل ہوں گی، جو ایک ہندو اکثریتی صوبے میں مسلمانوں کو حاصل ہوں۔
۴ - اسی قسم کا آئینی دستور صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں بھی نافذ العمل ہوگا۔
۵ - پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو متناسب نمائندگی حاصل ہوگی۔

مسلمانوں کے مفاد کی بربادی :-

نہرو رپورٹ میں ان تجاویز کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا۔ جب اس رپورٹ کا علم مولانا شوکت علی اور مولانا سید فضل حسین حسرت موہانی کو ہوا تو انہوں نے واشگاف الفاظ میں کامل آزادی کی بجائے ڈومینس سٹیٹس (DOMINION STATUS) کا مطالبہ کر دیا اور کہا کہ فی الحال ضرورت اس بات کی ہے کہ دفاع اور خارجی معاملات کے محکمے مرکز کے پاس رہیں۔ نہرو رپورٹ کی وہ باتیں جو مسلمانوں کے خلاف پائی جاتی تھیں حسب ذیل تھیں۔

۱ - وفاقی نظام حکومت کی بجائے وحدانی نظام حکومت تجویز کیا گیا۔
۲ - سندھ کو بمبئی کا جزو ہی رہنے دیا جائے، تاکہ مسلم اکثریت بٹی رہے)
۳ - سرحد اور بلوچستان کو صوبائی درجہ دینے کی مخالفت کی گئی۔
۴ - مرکز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی کے بجائے ایک چوتھائی نمائندگی کی تجویز پیش کی گئی۔

موتی لال نہرو کی طفلی تسلی :- مسلمانوں نے جب اس پر احتجاج کیا تو انہیں یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی گئی کہ فی الحال ہمیں تو دبرکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب دینا ہے اس کو مؤثر جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب اسی پہ اتفاق کریں بعد میں ہم حالات کو مسلمانوں کے موافق بنالیں گے۔

پنڈت جی کی اس طفلی تسلی اور شعبدہ بازی کو کون نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ان دنوں مسلمانوں

Marfat.com

کے بیباک لیڈران مثلاً مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح انگلستان میں تھے۔ مولانا حسرت موہانی تو اپنا علاج کرا رہے تھے اور مسٹر جناح بیرسٹری میں مصروف تھے، اور ادھر ہندوؤں کی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف دو بلند ہمت مجاہد موجود تھے۔ یعنی مولانا شوکت علی اور مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی۔

مولانا حسرت موہانی نے رپورٹ کی ہر ہر دفعہ پر زبردست تنقید کی اور اس کے جواب میں خود بھی تجاویز پیش کیں۔ جو نہ صرف رپورٹ کی دفعات سے زیادہ ٹھوس تھیں بلکہ مسلم مفادات کے تحفظ کی ضامن بھی تھیں، پنڈت موتی لال نہرو جیسے مدبر شخص نے ان متبادل تجاویز کو اپنی توہین گردانا۔ اور اعتراضات کا جواب دینے کی بجائے مولانا کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور پوری فضا کو ان کے خلاف ایک تمسخر کے رنگ میں تبدیل کر کے ان کی ہر دلیل کو برباد کر دیا حقیقت میں مسٹر نہرو کو آئینی سطح پر شکست کا سامنا تھا جسے انہوں نے نفسیاتی رنگ میں ہی ختم کر دینا چاہا ان حالات میں بھلا کونسی تجویز منظور ہو سکتی تھی۔ آخر کار مولانا شوکت علی خان نے اپنا ہاتھ دراز کرتے ہوتے اور آستین چڑھاتے ہوئے باآواز بلند کہا کہ۔

> " میں بتاتا ہوں کہ مسلمانوں کا نمائندہ کون ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مسٹر شعیب نے پہلے ہی اس رپورٹ پر اپنا اختلافی نوٹ درج کیا ہے۔ اور اگر اس جلسے میں یہ رپورٹ منظور ہوئی تو مسلمانوں کو وہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔

مسلمانوں کی طرف سے ترامیم: مسلمانوں کی طرف سے اس شدید مخالفت کے باوجود کانفرنس میں نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اس رپورٹ کو آخری شکل دینے اور حتمی توثیق حاصل کرنے کے لیے اسے دسمبر میں ایک اور آل پارٹیز کانفرنس کلکتہ میں بلائی جائے۔ نہرو رپورٹ کے جزیات کی خبر جب انگلینڈ میں مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر کو ملی تو وہ ملی کرب سے تڑپ اٹھے چنانچہ دونوں نے بہر صورت ہندوستان پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر جناح نے یہاں پہنچ کر مسلم لیگ کا ایک اجلاس کلکتے میں طلب کیا۔ اگرچہ مسلمانوں میں اس وقت بہت سا اختلاف پایا جاتا تھا۔ لیکن اس موضوع پر تمام مسلمان اکٹھے ہو گئے اور آل پارٹیز نیشنل کنونشن کے تحت مسلم لیگ کی نیابت میں ایک کمیٹی مقرر ہو گئی۔ اس کمیٹی کے سامنے مسلم لیگ کی طرف سے نہرو رپورٹ میں بہت سی ترامیم پیش کی گئیں۔ ان میں سے اہم ترین

Marfat.com

مندرجہ ذیل تھیں۔

۱ ۔ مرکز میں مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی ہو گی۔

۲ ۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو دس سال کے لئے متناسب نمائندگی حاصل ہو۔

۳ ۔ غیر متذکرہ اختیارات مرکز کی بجائے صوبوں کو حاصل ہوں تا کہ وفاقی طرز حکومت کی بجائے وحدانی طرز حکومت کو کامیابی سے چلایا جا سکے۔

۴ ۔ کنونشن کے تیور سے پتہ چلتا تھا کہ مسلمانوں کی ان تجاویز کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو گی اس لیے انہوں نے بڑے واضح الفاظ میں اس کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے کہہ دیا۔

"نہرو کمیٹی نے اپنی سفارشات میں کوتاہ نظری کی پالیسی اختیار کی ہے جس کی وجہ سے مسلمان ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں منصفانہ شرکت سے محروم ہو جائیں گے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ کمیٹی کی رپورٹ سے نہ کوئی مدد ملتی ہے اور نہ وہ بار آور رہے میرا خیال ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے گا کہ ہماری ترقی کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصفیہ ہو اور تمام مختلف جماعتیں ملک میں دوستانہ ربط وضبط کے ساتھ رہیں ۔۔۔۔

۔۔۔۔ اکثریتیں جبرانہ ظلم کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اقلیتیں اس امر پہ خوفزدہ ہوتی ہیں کہ ان کے مفاد اور حقوق کو ضرر پہنچے گا

انجام کار:۔ وہی ہوا جس کو مسٹر محمد علی جناح کو اندیشہ تھا۔ انہوں نے اس اجلاس میں جس قدر ترمیمات پیش کیں انہیں مسترد کر دیا گیا۔ اور کانگرس کے ایک دریدہ دہن رکن جو نہرو رپورٹ تیار کرنے والی کمیٹی کا بھی رکن تھا۔ یہاں تک کہنے سے بھی نہ ہچکچایا کہ۔

"مسٹر جناح ایک ضدی بچے کی طرح ہیں جس کا دماغ کانگرس کے لاڈ پیار سے خراب ہو گیا ہے۔"

یہ فقرہ مسٹر جناح کے دل میں کانگرس کی نفرت کا طوفان برپا کرنے کے لیے کافی تھا کیونکہ اس سے واضح تھا کہ ہندو ان کی انفرادی اہمیت اور لیڈر ہونے کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ بعد ازاں مسٹر جناح تمام مسلمانوں کو یکجا کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے اور مسلمانوں نے متحد ہو کر اس رپورٹ کی مخالفت شروع کر دی۔ لیکن اس شدید مخالفت کے باوجود آل پارٹیز کانفرنس کلکتہ میں ہندو

Marfat.com

کانگرس نے یہ بڑک ماری کہ اگر اس رپورٹ میں ایک کالمے کی بھی ترمیم کی گئی تو اس کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ یہ دھونس بھی دی کہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک حکومت نے اس رپورٹ پر عمل نہ کیا تو سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے گی۔

ردِّ عمل :- نہرو رپورٹ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی و سماجی تعلقات کی خلیج اور زیادہ وسیع اور گہری ہو گئی۔ ہندوؤں کی مکاری مصدقہ انداز میں سامنے آئی۔ مسلمانوں کو اب سوچنا پڑا کہ ہندو کے خلاف باقاعدہ ایک پلیٹ فارم تیار کرنا چاہیئے۔ مولانا محمد علی جوہر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہندو نے یہ رپورٹ پیش کر کے مسلمانوں کو غلام بنانے اور ہندو تسلّط کو مضبوط کرنے کے لیے سب سے مؤثر ہتھکنڈہ استعمال کیا ہے۔ مسٹر محمد علی جناح نے بجائے مایوس ہونے کے خود کو زیادہ مستعد بنایا اور آزادی قوم اور آزادی وطن کی طرف سے زیادہ انہماک سے توجہ لینا شروع کر دی۔ نہرو رپورٹ انگریزوں کے ہاں کس حد تک مقبول ہوئی اور کس درجے تک موثر ثابت ہوئی اس کا اندازہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء سے لگایا جا سکے گا۔ یا ان گول میز کانفرنسوں سے لگایا جا سکے گا۔ جس کی ضرورت کو انگریز نے بھی محسوس کیا۔

Marfat.com

مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات ۱۹۲۹ء

سوال: مسٹر محمد علی جناح کو چودہ نکات پیش کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی وہ نکات کیا تھے اور ان سے سیاست ہندوستان میں کیا اثرات رونما ہوئے؟ تفصیلی جائزہ لیجیے؟

جواب:۔ نہرو رپورٹ مسلمانوں کے لیے ایک کھلے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ہندو پورے ہندوستان میں ہندو اکثریت کی بنا پر مبنی ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانان ہند کے لیے ایک پائیدار جوئے کی حیثیت رکھے جو مسلمان کی گردن سے کبھی اترنے نہ پائے۔ یہ رپورٹ مختلف الخیال مسلمانوں کے لیے ایک تازیانے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اس تازیانے نے واقعی مسلمانوں کو انتشار کے دشت سے نکال کر اتحاد کے پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا۔ سر شفیع اور سر فضل حسین کی مشترکہ کوششوں سے اس رپورٹ کی تردید کرنے کے لیے ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انعقاد کا بندوبست کیا گیا۔ یہ کانفرنس ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو منعقد ہوئی۔ لیکن اس مرتبہ اتحاد مسلمانانِ ہند میں تھوڑی سی کسر رہ گئی۔ یعنی جناح مسلم لیگ شامل نہ ہو سکی۔ آخر کار یہ کانفرنس دوبارہ مارچ ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی انعقاد پذیر ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ شفیع لیگ اور جناح لیگ کے دو مختلف وجود ختم کر دیے جائیں۔ اور ان کی جگہ ایک ہی لیگ یعنی مسلم لیگ کا قیام مستحکم کیا جائے۔ اس طرح دو سال کے نفاق کے بعد یہ دونوں لیگیں مل کر متحدہ مسلم لیگ کانفرنس کی صورت میں برسر عمل ہوئیں۔ نہرو رپورٹ کو ایک ہندو رپورٹ قرار دیا اور اس کی جگہ مسلمانوں کے مطالبات مندرجہ ذیل چودہ نکات کی صورت میں پیش کیے گئے۔ یہ نکات مسٹر محمد علی جناح نے تیار کیے اور تمام مسلمانان ہند نے اس کانفرنس میں انہیں سراہا۔ یہی نکات آگے چل کر "جناح کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہوئے۔ رسمی طور پر ان نکات کے سلسلے میں جو بیان جاری کیا گیا اس کا متن حسب ذیل تھا۔

Marfat.com

۱۹۲۸ء میں کل جماعتی کنونشن کے انعقاد کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ملک میں سیاسی اصلاحات کا ایک ایسا جامع منصوبہ تیار کیا جائے جس کو ہندوستان کی سرکردہ تنظیموں کی حمایت حاصل ہو، اور جس کی حیثیت ایک ہی قومی سمجھوتے کی ہو۔ انڈین نیشنل کانگرس نے آئینی طور پر اس قسم کے منصوبے کو نہرو رپورٹ کی شکل میں قبول کر لیا جس میں کہا گیا کہ اگر برطانوی حکومت ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء تک نہرو رپورٹ کی سفارشات کو تسلیم نہیں کرتی تو ملک میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا جائے گا، اور کانگرس نے عوام کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اگر اس میعاد تک مطالبات تسلیم نہیں ہوئے تو ٹیکسوں کی ادائیگی روک دی جائے گی اور عدم تعاون کو پروان چڑھایا جائے گا۔ یہ دھونس ہندو مہاسبھا کی طرف سے حکومت کے لیے ایک الٹی میٹم کی حیثیت رکھتی ہے۔

نہرو رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں ایک لفظ کی بھی تبدیلی کی گئی تو ہندو اس پوری رپورٹ کو ماننے سے انکار کر دیں گے اور یہ کہ کنونشن میں نیشنل لبرل فیڈریشن NATIONAL LIBRAL FEDERATION کے ڈیلیگیٹوں نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا اور الہ آباد کے جلسہ عام میں کوئی قطعی موقف اختیار کرنے سے انکار کر دیا، اور یہ کہ غیر برہمن اور پسماندہ اقوام اس رپورٹ کی واضح مخالفت کر چکی ہیں اور یہ کہ مسلم لیگ کے ڈیلیگیٹوں نے نہایت معقول اور اعتدال پر مبنی تجاویز پہلے ہی پیش کر دی ہیں اور ان ترامیم کو مناسب مقام نہیں ملا اور انہیں مانا نہیں گیا اس لیے مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو تسلیم کرنے سے قطعی طور پر قاصر ہے۔

• مسلم لیگ ایک عمیق غور و خوص کے بعد اور بعزم کلی و بخلوص تمام یہ اعلان کرتی ہے کہ حکومت ہندوستان کے آئندہ آئین کے سلسلے میں مسلمانان ہند کو کوئی ایسا منصوبہ تسلیم نہیں ہوگا جس میں مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کو پیش نظر نہ رکھا جائے گا اور جب تک مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے انہیں اس کا جزو نہ بنایا جائے گا۔

۱۔ آئندہ آئین وفاقی نوعیت کا ہو جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔

۲۔ تمام صوبائی حکومتوں کو یکساں بنیاد پر اور یکساں اصولوں پر داخلی خودمختاری دی جائے گی۔

Marfat.com

۳ ۔ ملک کی آئین ساز اسمبلیاں اور انتخابی اداروں کی تشکیل اس واضح اور حتمی اصول پر ہوگی ۔ کہ تمام صوبوں میں اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی حاصل ہوگی اور کسی اکثریت کو کم کرکے اقلیت نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی اس کو مساویانہ درجے تک لایا جائے گا ۔

۴ ۔ مرکزی مجلس آئین ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی کم از کم ایک تہائی ہوگی ۔

۵ ۔ مختلف فرقوں کی نمائندگی رائج طریقوں کے مطابق جداگانہ انتخاب کے ذریعے ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہی ہر فرقے کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنے اختیار سے جداگانہ انتخاب کی بجائے مخلوط انتخاب تسلیم کرے ۔

۶ ۔ صوبوں کی حد بندی سکیم پنجاب ۔ بنگال ۔ سندھ ۔ سرحد اور بلوچستان کی مسلم اکثریت پر اثر انداز نہ ہو ۔

۷ ۔ مذہبی آزادی کا پورا پورا اہتمام کیا جائے اور ہر عقیدے، عبادت، تبلیغ، تعلیم وغیرہ کی کامل آزادی ہو اور سب کو اس کا یقین دلایا جائے ۔

۸ ۔ کوئی مسودۂ قانون یا اس کا کوئی حصہ آئین ساز اسمبلی میں پاس نہیں ہوگا ۔ یا کسی اور منتخبہ ادارے کی وساطت سے پاس نہیں ہوگا جب کہ اس فرقے کے نمائندے کی تین چوتھائی تعداد یہ کہہ کر اسے رد نہ کر دے کہ اس قانون یا اس جزو قانون سے اس مخصوص فرقے کو نقصان پہنچتا ہے ۔

۹ ۔ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ کر دیا جائے ۔

۱۰ ۔ صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بھی ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے عین مطابق آئینی اصلاحات کا نفاذ کیا جانا چاہیئے ۔

۱۱ ۔ آئین میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کو بھی دوسرے ہندوستانیوں کی طرح سرکاری ملازمتوں اور خود مختار اداروں کی ملازمتوں میں ان کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق مناسب حصہ مل جائے ۔

۱۲ ۔ آئین میں مسلمان کی تہذیب و تمدن، زبان ۔ تعلیم ۔ مذہب اور اوقاف اور شخصی قانون وغیرہ کو مکمل تحفظ حاصل ہو ۔ اس کے علاوہ دوسرے اداروں سے دی جانے والی امدادوں سے ان کے لیے متناسب حصے کی ضمانت دی جائے ۔

Marfat.com

۱۳ - ملک میں کوئی صوبائی یا مرکزی وزارت ایسی قائم نہ کی جائے ۔جس میں کم از کم ایک تہائی مسلمان شریک نہ ہوں۔

۱۴ - مرکزی دستور سازی میں کوئی تبدیلی اس وقت تک نہ کی جائے جب تک وفاق کے رکن صوبوں کی منظوری حاصل نہ ہو۔

چودھویں نکتے کے ساتھ ایک متبادل تجویز یہ بھی رکھی گئی کہ موجودہ علامات میں ملک کی آئین ساز اسمبلی اور انتخابی اداروں کے لیئے جداگانہ انتخاب کا طریقہ لازمی قرار دیا جائے کیونکہ جداگانہ انتخاب کا یہ حق مسلمانوں کو ۱۹۰۹ء سے حاصل ہے اور حکومت نے بارہا وعدہ کیا ہے کہ ان کا یہ حق بحال رکھا جائے گا۔ اور اس وقت اسے تبدیل نہیں کیا جائے گا جب تک کہ خود مسلمان اس کو ترک کرنے کے ارادے کا صریحاً اظہار نہ کریں۔

چنانچہ مسلمان اس حق کو قطع طور پر چھوڑنے کے لیئے تیار نہیں ہیں، بالخصوص اس وقت تک جب سندھ علیحدہ صوبے کی حیثیت سے وجود میں نہیں آجاتا اور شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کا عملی نفاذ نہیں ہو جاتا علاوہ ازیں اس حق سے مسلمان اس وقت تک دست بردار ہونے کے متعلق سوچ نہیں سکتے جب تک کہ تمام صوبوں میں ان کی آبادی کے مطابق متناسب نشستیں محفوظ نہیں کر لی جائیں۔ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ اس کے باوجود صرف تناسب کے لحاظ سے اپنی نشستوں کا انتخاب لڑیں گے اس طرح وہ صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں گے ان کو متناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دینے کے سوال پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

مسٹر محمد علی جناح نے یہ نکات پیش کر کے ہندوستان کے ہندوؤں کو بتا دیا کہ آئینی امور کی مہارت مسلمانوں کو بھی حاصل ہے۔ ان نکات کا جب سرکاری حلقوں میں جائزہ لیا گیا تو انگریز نے تسلیم کیا کہ جہاں تک مطالبات کا تعلق ہے وہ ہندو مطالبات کے مقابلے میں زیادہ قرین قیاس ہیں۔ کیونکہ ان میں زیادہ تر وہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جن کا وہ پہلے بھی اعادہ کر چکے ہیں اور جن کی ضمانت کا تصور خود حکومت برطانیہ نے دیا ہے۔

Marfat.com

اقبال کا خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء

سوال ۱:۔ علامہ اقبال نے دسمبر ۱۹۳۰ء الہ آباد میں مسلمانان ہند کو مخاطب کرتے ہوئے ایک جامع خطبہ پیش کیا تھا۔ اس کے مندرجات کیا تھے اور اس کے کیا اثرات ہوئے تفصیل سے جائزہ لیجیے؟

جواب ۱:۔ مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات کے پیش ہو جانے کی وجہ سے مسلمانان ہند میں یہ احساس فعال طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ ان میں ایسے رہنما موجود ہیں جو ہندو شرارت اور تعصب کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکیں، اور ان کی شرانگیز سازشوں کو جرأت مندی سے بے نقاب کر سکیں۔ اب یہ بات بالکل مسلّم ہو گئی تھی، کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کبھی ہموار زندگی گزار نہیں سکتیں، انگریزوں نے بھی اس حقیقت کو بالواسطہ اور کسی حد تک بلاواسطہ تسلیم بھی کر لیا تھا۔ بلکہ بااختیار حلقوں میں یہ امر تو باعث موضوع بحث بن گیا تھا، کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں حکومت چلانے کے لیے کس حد تک اور کس انداز سے اقتدار سونپنا چاہیے، ان حلقوں کی اس بے چینی سے علامہ محمد اقبال بخوبی آگاہ تھے، انہوں نے جان لیا تھا۔ کہ اب وقت آ گیا ہے۔ کہ مسلمانوں کے قدموں کو ذرا بھر بھی نہ اکھڑنے دیا جائے، اور زیادہ سے زیادہ استقامت دی جائے، انہوں نے اس ملی جذبے کو استوار کرتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت کو اختیار کر ہی لی ہوئی تھی۔ اب وہ اس سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم پر اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوئے، انہوں نے واضح طور پر تمام ہندوستان والوں کو آگاہ کیا۔ کہ ہند میں آباد دو قومیں کسی بھی لحاظ سے ایک دوسرے سے اشتراک نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، سماجی، مذہبی نظریاتی اور معاشی نقطہ نظر سے دونوں قومیں ایک دوسرے کے مخالف خیالات کی حامل

Marfat.com

ہیں۔ اس لیے ان دونوں کا کسی ایک نکتہ نظر پر متفق ہونا نہ صرف محال ہے۔ بلکہ ناممکن ہے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ مسلمان جو اس قدر زیادہ تعداد میں ہندوستان کی آبادی کا جزو ہیں خود کو محض اقلیت تصور کر کے ہندو کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں، اس کے علاوہ انگریز بھی اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے کہ مسلمان متناسب نمائندگی کے حقدار ہیں، اور انہیں یہ حق مل جانا چاہیئے۔ علامہ اقبال نے ان نظریات کا پرچار اس پرجوش انداز میں کیا کہ ہندو سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے زیر اہتمام ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد کے مقام پر ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ جس کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی، اس جلسہ میں جو خطبہ صدارت انہوں نے پیش کیا وہ نہ صرف سیاسی لحاظ سے ایک اہم ترین واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے اک تاریخی نکتہ نظر سے آزاد مملکت کے مطالبے کے سلسلے میں سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس خطبے نے تمام باشندگانِ ہند پر واضح کر دیا ہے کہ مسلمانوں نے جس عزم کا اظہار کیا ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے ان کے پاس جو سب سے بڑی قوت ہے۔ وہ مذہبی یگانگت ہے اور اسی مذہبی یگانگت کی بنا پر وہ بکھرے ہوئے مسلمانوں کو بھی منتشر تصور نہیں کرتے اگر جسمانی طور پر وہ ایک دوسرے سے کافی فاصلوں پر ہیں، لیکن ذہنی اور فکری لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے بالکل مربوط ہیں۔

علامہ نے اعلان کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کی تمام قومیں بالخصوص ہندوستان پر حکمران قوم انگریز اور اکثریت کا دعویٰ کرنے والی مکار قوم ہندو اس حقیقت کو تسلیم کر لیں، کہ مسلمان سیاسی و ثقافتی لحاظ سے بالکل بیدار ہے۔ اور ہر وقت خود کو فعال ثابت کر سکتا ہے اس لیے حکمران ٹولے میں سے کسی بھی فرد کو یہ تصور نہ کرنا چاہیئے۔ کہ وہ اس قوم کو اپنے تسلّط کے زیر لا کر محکوم بنانے میں کامیاب ہو سکے گا، ہندوستان میں اگر ہندو اپنی علیحدہ سلطنت کا دعوے دار ہوا ہے۔ تو اس کے شانہ بشانہ مسلمان بھی ایک علیحدہ مملکت کی تشکیل کا مطالبہ کرتا ہے اور اس مملکت کی تشکیل کے لیے اس قوم کے پاس نہایت واضح دلائل موجود ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ اب ہندوستان کے باشندوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں سے ہر فرد کون کون سے فرقے اور قوم سے تعلق رکھتا ہے اور اس فرقے اور قوم کی ہمدردی کے اظہار کے لیے وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ اس احساس کی وجہ سے ملک میں امن

Marfat.com

وامان کا قائم رہنا نہایت دشوار ہوگیا ہے۔ اب امن وامان کے قیام کی طرف ایک ہی صورت ہے۔ کہ دونوں قوموں کو اس ملک میں علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔ اور دونوں کو علیحدہ مملکت بنا دیا جائے۔

اس خطبہ میں علامہ اقبال نے اس مملکت کا جغرافیائی تصور پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ ہندو اور مسلمانوں کے مسائل کو حتمی اور مستقل طور پر حل کرنے کے لیے لازم ہے کہ پنجاب کی انبالہ ڈویژن جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ پنجاب سے علیحدہ کر دی جائے اور باقی پنجاب، صوبہ سرحد، صوبہ بلوچستان اور سندھ کے صوبہ کو ملا کر ایک علیحدہ سلطنت بنا دی جائے۔ کیونکہ ان صوبوں کی مجموعی آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہے۔ اسی طرح بنگال میں مسلم اکثریت والے اضلاع کو ایک مسلم مملکت کی حیثیت دے کر بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔ جہاں صرف مسلمانوں کو حکمرانی کرنے کا اختیار حاصل ہو، اس کے علاوہ ہندوستان کے باقی تمام حصے ہیں جہاں ہندو اکثریت میں ہیں اپنی ایک علیحدہ مملکت قائم کر سکتے ہیں۔ جہاں وہ اپنی رسوم، رواج اور مذہبی اقدار کا آزادی کے ساتھ تحفظ بھی کر سکتے ہیں، اور ان کی ترویج بھی ہو سکتی ہے اور ہندوؤں کی ان کارروائیوں سے کسی مسلمان کی دل آزاری بھی نہ ہوگی۔ اور نہ ہی کوئی اختلافی امر باعث فساد ہوگا۔

علامہ نے فرمایا! کہ میں نے حالات کا نہایت تدبر سے جائزہ لیا ہے۔ اور میں اس حتمی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ برصغیر ہند کے شمالی اور مشرقی حصے میں ایک نئی سلطنت ابھرنے والی ہے جس کو دنیا کی کوئی قوت اب روک نہیں سکتی، اور یہ ملک کے دونوں حصوں میں ابھرنے والی مملکت ایک ہی متحدہ نظام سلطنت کے تحت چلے گی۔ اور یہ سلطنت ایک اسلامی مملکت کے روپ میں نمایاں ہوگی، اور دنیا بھر میں اپنے وقار اور اپنی یگانگت کے اعتبار سے اپنی مثال خود ہوگی۔ یہ سلطنت مسلمانوں کے نظریات کی حامل اور اسلامی روایات کی ترجمانی ہوگی۔ علامہ کے یہ تمام نظریات دراصل اسی سلطنت کے قیام کی پیش گوئی تھے۔ جو بعد ازاں پاکستان کے نام سے وجود میں آئی۔

اس خطبے کو پورے برصغیر کے مسلمانوں نے ازحد سراہا۔ دراصل یہ خطبہ مسلمانان ہند کے لیے اس کی منزل کی نشان دہی کے مترادف تھا۔ جس کے حصول کے لیے یہ حضرات جنگ آزادی سے لے کر اس وقت تک سرگرداں تھے، جہاں تک صوبوں کی حد بندی کا تعلق ہے مسلمانوں کا خیال تھا کہ ان صوبوں کو ایک ہی مملکت میں ضم کر کے صوبائی تقسیم کو اگر یکسر ختم کر دیا گیا تو چند آں مستحسن

Marfat.com

اقدام نہ ہوگا، کیونکہ ایک بہت بڑی سلطنت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے لازم ہے کہ انتظامی نکتہ نظر سے اس کو چھوٹے چھوٹے صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور مرکز کا اس پر پورا پورا کنٹرول ہو۔ اس لیے ایک بہت بڑی اسلامی سلطنت کے قیام کے ساتھ ساتھ اس کے استحکام اور استواریت کی ضرورت ہے۔ تاہم اس وقت یہ ایک ثانوی مسئلہ تھا۔

علامہ اقبال کے اس خطبہ نے پورے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک زبردست ولولہ اور ہندوؤں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ ہندوؤں کو اس حقیقت کا معترف ہونا پڑا۔ کہ کانگرس کے ہوتے ہوئے بھی وہ مسلمانوں کو اپنے دام فریب میں نہیں لا سکیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اب ایسے اقدامات کیے جائیں، جن سے مسلم لیگ کی قوت کو ضرب کاری لگے۔ اور مسلمانوں میں نفاق پیدا ہو، چنانچہ اس کے لیے انہوں نے فریب دہی، داغ گوئی اور بین الجماعتی فسادات کو زہریلے انداز میں استعمال کرنے کی کوششیں شروع کر دی۔ تاہم مسلمان فطرت ہندو سے بے خبر نہ تھے۔

Marfat.com

کمیونل ایوارڈ ۱۹۳۲ء

سوال :۔ ہندو کی سیاست ہمیشہ پہلودار رہی ہے۔ کبھی اس نے ذات پات کا سہارا لیا اور اور کبھی اس سے خوف زدہ ہوا۔ جہاں جیسے کام چلا مطلب براری کی۔ اسی قسم کی چال کے لیے اس نے انگریز کو "کمیونل ایوارڈ" دینے پر مجبور کیا۔" یہ کس حد تک درست ہے، اس قول کی روشنی میں کمیونل ایوارڈ ۱۹۲۳ء کا پس منظر، واقعات اور نتائج بیان کیجیے۔

جواب :۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی کا آغاز ہندوستان کی سیاست میں زبردست افراتفری پیدا کرنے کا دور ثابت ہوا تھا۔ چاروں طرف سیاسی خلفشار برپا ہو رہا تھا۔ انگریز حاکم حالات کو مناسب صورت میں درست اور پر امن رکھنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن ہندوستان کے لوگ اب انگریز کو مار بھگانے کے ہی درپے ہو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے مہاتما گاندھی کئی رخی سیاست کے بل بوتے پر ہندوستان کے عوام کو اشاروں پر نچا رہے تھے۔ وہ مسلمانوں سے ملتے تو اپنی تمام تر ہمدردیاں انہیں کے لئے وقف ظاہر کرتے اور ہندوؤں سے ملتے تو وہ تمام تر ان کے لیے تھے اچھوتوں کا سامنا ہوتا تو خود کو ان کی بھی خدمت کے لیے کوشاں ظاہر کرتے انہیں تو انگریز سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک نئی ہندو مملکت کے حصول سے غرض تھی ان کی راہ میں حائل ہوتے والے مسلمان رہنما بھلا کس طرح اچھے لگتے پھر مسٹر محمد علی جناح اور علامہ اقبال جیسے مقتدر مدبر اور بے مثال مفکر اور قانون دان ان کو تو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ تاہم انہیں ملک کی ہندو اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ اس لیے انہوں نے لارڈ اردن جیسے نرم طبیعت وائسرائے کو زیر اثر کیا ہوا تھا۔ لارڈ اردن اپریل ۱۹۳۱ء میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے اور ان کی جگہ لارڈ ولنگڈن نے لے لی، لارڈ ولنگڈن لارڈ اردن کے مقابلے میں ایک سخت گیر اور جابر وائسرائے تھا۔ اور اسے ہندوستان کے حالات سے بخوبی آگاہ کر کے روانہ کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے حسبِ عادت نہایت خشک اور

Marfat.com

رعب دار انداز میں ایک تار لارڈ ولنگڈن کو حسب ذیل متن کا ارسال کیا۔

" صوبہ سرحد اور یو پی کے نئے آرڈی ننس۔ صوبہ سرحد میں فائرنگ اور دونوں صوبوں میں میرے عزیز دوستوں کی گرفتاریاں۔ یہ اچانک ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ جن کو میں قطعی پسند نہیں کرتا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ان کو حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے خاتمے کا نشان سمجھوں یا ابھی آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے مل کر کچھ رہنمائی حاصل کروں کہ مجھے کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ اور کانگرس کو کیا مشورہ دینا چاہیئے۔"

یو پی میں لوگوں نے مالیہ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا۔ اور عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک کی رہنمائی پنڈت نہرو کر رہے تھے۔ سرحد میں خان عبدالغفار خان نے پنڈت نہرو کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس بنا پر حکومت نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا تھا۔

لارڈ ولنگڈن کو جب اس تار کا علم ہوا تو انہوں نے نہ صرف زبردست ناپسندیدگی کا اظہار کیا بذات خود اس کا جواب دینا بھی گوارہ نہ کیا۔ ادھر مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ لارڈ ولنگڈن میرے اس تار سے بہت ہوگا اور مجھے فی الفور ملاقات کے لیے بلائے گا۔ لیکن لارڈ ولنگڈن نے ان کی توقعات کے برعکس کہا سیکرٹری کو ہدایت کی کہ وہ اپنی طرف سے مہاتما گاندھی کو واضح جواب دے۔ جو جواب مہر کو اپنے تار کے عوض ملا۔ اس کا متن حسب ذیل تھا۔

" وائسرائے نے فرمایا ہے کہ وہ اور ان کی حکومت تمام سیاسی جماعتوں سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یو پی اور سرحد میں کانگرس کی سرگرمیاں ان کے دوستانہ تعلقات کے منافی ہیں۔ جن کا ہندوستان کا مفاد تقاضا کرتا ہے۔"

وائسرائے کے طرف سے اس خشک جواب سے مہاتما گاندھی کی توقعات اگرچہ خاک میں مل گئیں قوم کے سامنے وہ کیا منہ دکھاتے۔ چنانچہ اپنے ہٹ دھرم رویہ کے تحت اپنا راگ الاپتے ہی رہے اور وائسرائے کو اپنے مطالبات پیش کرتے ہی رہے۔ جس کا انہیں حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ تنگ آ کر انہوں نے تحریک سول نافرمانی چلائی۔ اور اس خطرناک حد تک بڑھائی کہ عورتوں کو بھی اس سلسلے میں مسلح کر کے میدان سیاست میں لا کر کھڑا کر دیا۔ بنگال میں مسلم دہشت گردی شروع ہوگئی۔ مہاتما گاندھی گرفتار کر لیے گئے۔

مسلمانوں نے شروع سے لے کر آخر تک انگریز کے خلاف آئینی جنگ ہی لڑی ہے اور جس

Marfat.com

کہ کانگرسی لیڈروں کے مقابلے میں مسلم لیگی رہنماؤں کو بہت کم جیل میں جانا پڑا ہے۔ اگر کہیں مسلم لیگیوں کو جیل میں ٹھونسا بھی گیا ہے تو وہ محض انگریز کی سینہ زوری اور تحکم کی بنا پر۔ ورنہ مسلمانوں نے ہمیشہ قانون کے دائرے میں رہ کر انگریز کو مارا ہے۔ انگریز کے سخت رویے کی بنا پر ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور کانگرس کے رویے نے انہیں انگریز سے اور بھی زیادہ بدظن کر دیا تھا۔ اور یہ ساری بے چینی انگریز کی طرف سے فرقہ وارانہ نمائندگی کی عدم موجودگی کی بنا پر تھی اس بے چینی کا علم وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو بخوبی تھا۔ لیکن وہ محض حالات کی رفتار کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ آخر کار برطانوی وزیر اعظم کی سرد مہری کو دیکھ کر مسلمانوں نے ڈائریکٹ ایکشن کی مہم شروع کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ لارڈ ولنگڈن کو اس پروگرام کا پتہ چل گیا۔ ساتھ ہی اس کے کانوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ اگر مسلمان نے ڈائریکٹ ایکشن شروع کیا اور ادھر کانگرس کی تحریک سول نافرمانی جاری رہی تو انگریز کو دو مختلف سیاسی جماعتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے احرار جیسی جماعتیں میدانِ سیاست میں کود پڑیں گے اور نظام حکومت میں زبردست خلل واقع ہو جائے گا۔ اس بات کا والسرائے پر گہرا اثر ہوا۔ اس نے معلوم کیا کہ ڈائریکٹ ایکشن کی تحریک کے آغاز کے لیے کس دن قرار داد پیش ہونے والی ہے اسے بتایا گیا کہ مسلم کانفرنس کا اجلاس ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو ہونے والا ہے اور اسی میں یہ قرارداد پاس ہو جائے گی چنانچہ والسرائے نے اس تاریخ کے دو دن پہلے ہی یعنی ۱۹ مارچ ۱۹۳۲ء کو ایک سرکاری اعلان جاری کیا کہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے بارے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے بہت جلد فیصلے کا اعلان کیا جانے والا ہے اس لیے کسی سیاسی جماعت کو کوئی ایسا قدم اٹھانے سے احتراز کرنا چاہیے جس سے ملکی معیشت کو نقصان پہنچے۔ ۲۱ مارچ کو مسلم کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں قرارداد ڈائریکٹ ایکشن کے بارے میں طے پایا کہ حکومت کی موجودہ یقین دہانی کے پیش نظر مسلم لیگ کو جون ۱۹۳۲ء تک سرکاری اعلان نہ آیا لیکن علامہ نے اپنے رسوخ سے اجلاس کو ملتوی کرا دیا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس مسئلے پر انگلستان میں زبردست غور و فکر ہو رہا ہے اور اعلان بہت جلد ہونے والا ہے۔

بالآخر ۴۔ اگست ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم برطانیہ کی طرف سے "کمیونل ایوارڈ" کا اعلان کر دیا گیا اس ایوارڈ میں جداگانہ انتخاب اور نشستوں کے تحفظ کا اصول برقرار رکھا گیا۔ پس ماندہ اقوام۔ سکھ ہندوستانی عیسائی اور یورپین فرقوں کے لیے علیحدہ نشستوں کا تحفظ کر دیا گیا۔ مفادات کی بنیاد پر زمینداروں تاجروں اور مزدوروں کے لیے بھی نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔ ان صوبوں میں جہاں

Marfat.com

مسلمان اقلیت میں تھے، ان کی نشستیں علیحدہ محفوظ کر دی گئیں، لیکن جہاں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں نشستوں کی تقسیم کچھ اس انداز سے کی گئی کہ مجموعی طور پر مسلمان زبردست خسارے میں رہے مثلاً صوبہ پنجاب کی کل آبادی میں ۵۷ فیصدی آبادی مسلمانوں کی تھی لیکن نشستوں کی تخصیص صرف ۴۹ ہی کی گئی جو سراسر ناانصافی تھی۔ اس کے برعکس سکھوں کی آبادی کل آبادی کا صرف ۱۳ فیصدی حصہ تھی لیکن انہیں ۱۸ فیصدی کے لحاظ سے نشستیں دی گئیں۔ اس منطق دریاضی کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ یہ کون سی بنیاد پر طے پایا گیا ہے۔

اسی طرح بنگال میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کا ۵۵ فیصد حصہ تھی انہیں صرف ۴۸ فیصد نشستیں دی گئیں۔ اس طرح انگریز نے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان اکثریت کو نقصان پہنچانے میں ایک زبردست مؤثر کردار ادا کیا۔

فرقہ وارانہ فیصلے کے تحت ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جملہ نشستوں اور مسلمانوں کے لیے مخصوص کی گئیں نشستوں کی تعداد حسب ذیلی تھی۔

مدراس	۲۱۰	میں سے		۲۹
بمبئی	۱۷۵	"	"	۳۰
بنگال	۲۵۰	"	"	۱۱۹
یو۔پی	۲۲۸	"	"	۶۶
پنجاب	۱۷۵	"	"	۸۶
بہار اور اڑیسہ	۱۷۵	"	"	۴۲
سی۔پی	۱۱۳	"	"	۱۴
آسام	۱۰۸	"	"	۳۴
صوبہ سرحد	۵۰	"	"	۳۶

وزیراعظم برطانیہ کا یہ اعلان صرف صوبائی نمائندگی کے بارے میں تھا۔ متذکرہ اعلان جس میں مرکزی اسمبلی کے متعلق فیصلہ ابھی باقی تھا، اور مسلم لیگ و کانگرس کے دوسرے مطالبات ابھی زیر غور تھے۔ ہونا ابھی باقی تھا۔

۴ اگست ۱۹۳۲ء والے اس اعلان سے مسلمانوں کی توقعات اور مطالبات پر اوس پڑ گئی۔ کیونکہ انگریز نے اس میں بھی ڈنڈی مار کردار ادا کیا تھا تاہم حالات کا تقاضا کچھ ایسا تھا کہ مسلمان

اس فیصلے کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے اور انہوں نے اسے تسلیم کیا۔ ۲۰ اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں طے پایا گیا کہ مسلم لیگ کو حکومت کی طرف سے کمیونل ایوارڈ کے باقی ماندہ حصے کا بھی انتظار کرنا چاہیئے، چنانچہ کمیونل ایوارڈ کے باقی ماندہ حصے کا بھی اعلان ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کر دیا گیا، کمیونل ایوارڈ کے مندرجہ ذیل نکات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

۱ - ہر فرقہ کے جداگانہ نمائندگی کے حق کو تسلیم کر دیا گیا۔ اور انہیں متناسب نمائندگی دیئے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں آباد بڑی قوموں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے علاوہ اچھوتوں اور عیسائیوں کو بھی متناسب نمائندگی کا حق مل گیا۔

۲ - مسلمانوں کو مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں ہر جگہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے نمائندگی دینا منظور کر لیا گیا۔

۳ - مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب پورے ایوان کا ایک تہائی مقرر کر دیا گیا۔

۴ - ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ انہیں آبادی کے تناسب سے زائد نمائندگی کی رعایت دی جائے گی جو انہیں ۱۹۱۶ء کے "لکھنؤ پیکٹ" میں حاصل تھی۔

۵ - سندھ کو غیر مشروط طور پر بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنانا منظور کر لیا گیا۔

۶ - مرکزی ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے ایک چوتھائی حصہ مقرر کر دیا گیا۔ حالانکہ مسلمان کا مطالبہ ایک تہائی حصے کا تھا۔

<u>تنقید</u>: کمیونل ایوارڈ مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ایک کھلا اعلان تھا اور اس میں مسلمانوں کے نہ صرف مطالبات کو ٹھکرا دیا گیا بلکہ ان کے حقوق کو بھی پامال کر دیا گیا۔ اس ایوارڈ میں بالواسطہ انداز میں ہندوؤں کی سرپرستی کی گئی اور پنجاب اور بنگال جیسے مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلم نمائندگی کے لیے نشستوں کو جان بوجھ کر کم دیا گیا۔

ہندوستانی عیسائیوں اور اینگلو انڈین لوگوں کو ان کی تعداد سے کہیں بڑھ کر نمائندگی دی گئی۔ مثلاً ان لوگوں کی نسبت ایک فیصد کے لگ بھگ تھی لیکن انہیں دس فی صد کے حساب سے نمائندگی دی گئی جو انصاف کے سراسر منافی ہے۔ حکومت برطانیہ نے جان بوجھ کر ہندوستان کے عوام کو عالم تحیر میں مبتلا ئے رکھا اور کمیونل ایوارڈ کے اعلان کو ٹالتے ٹالتے اتنا وقت ضائع کر دیا کہ ہندوستان بدامنی کا شکار ہو گیا۔

Marfat.com

پونا پیکٹ ۱۹۳۲ء

سوال: "پونا پیکٹ" کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ یہ معاہدہ کن حالات میں طے پایا، اور اس معاہدہ سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جواب: کمیونل ایوارڈ جس کا اعلان اگست ۱۹۳۲ء میں کیا گیا تھا کے تحت ہندوستان کے اچھوتوں کو حق رائے دہی کے علاوہ حق متناسب نمائندگی بھی مل گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان اچھوتوں کے منتخبہ نمائندے ہندو نمائندوں ہمراہ اسمبلی کی سیٹوں پر براجمان ہونے کے اہل قرار دے دیئے گئے مسلمان چونکہ زبردست کشادہ دل اور فراخ ذہن کا مالک ہے اور اس کا مذہب انسانی مساوات کا درس دیتا ہے۔ چونکہ اس کے لیے ایوارڈ کی اس شق پر اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن ہندو جو چھوت چھات کا سب سے بڑا بیمار ہوتا ہے اس امتزاج کو برداشت نہ کر سکا۔ اس کے نزدیک اچھوتوں سے ملنا مذہبی طور پر منع ہے۔ وہ اچھوتوں کو انسانی اقدار سے بہت نیچے درجے کا افراد خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اچھوت کا بھٹک جانا بھی "پاپ" کے مترادف ہے۔ چنانچہ اچھوتوں کی متناسب نمائندگی کو ہندو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

مہاتما گاندھی سول نافرمانی کی تحریک کی بنا پر لارڈ ولنگڈن کے حکم سے جیل میں تھے اور جیل ہی میں انہیں کمیونل ایوارڈ کی خبر ملی۔ یہ خبر ان پر برق سوزاں کی طرح گری اور وہ اسے سنتے ہی نہ صرف تلملا اٹھے بلکہ ان کے تن بدن میں اس سے زبردست آگ لگ گئی۔ وہ اب زیادہ دیر تک اپنے اس جھوٹے پروپیگنڈے پر پردہ نہ ڈال سکے جس میں وہ اور ان کے حواری یہ کہتے رہتے تھے کہ

> "ہم تو ہندوستان کے باسیوں کے لیے سوراج مانگتے ہیں۔ اور ہم کو نہ تو مذہب کی پابندی ہے، نہ ذات پات کی کیونکہ ہندوستان کے باسیوں کے لیے ایک جیسی آزادی چاہیے۔"

لیکن ہندو کی اصل دم پر جب بھی پیر آتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا منہ کس کی ٹانگوں

Marfat.com

کو بڑے مادہ فی الفور کاٹنے کو پڑتا ہے۔

اس دفعہ مہاتما گاندھی جو چلائے تو انہوں نے اپنا منہ برطانوی کابینہ میں وزیر ہند کی طرف کیا اور انہیں ایک زہر بیلے خط میں جو انہوں نے جیل ہی میں ڈرافٹ کیا تھا لکھا کہ برطانوی حکومت کے کمیونل ایوارڈ کا یہ فیصلہ کہ اچھوتوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے متناسب نمائندگی حاصل ہوگی، سراسر غلط ہے۔ اور ہندوؤں کے مذہبی عقائد پر سب سے بڑی ضرب ہے اگرچہ یہ امر قابل تسلیم ہے کہ ہندوستان میں اچھوتوں کی تعداد برہمنوں اور کھشتریوں سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود برہمن یہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی اچھوت ان کے نزدیک آ کر بیٹھ جائے۔ مہاتما گاندھی اس بات کو دانستہ بھول گئے کہ ہندوستان میں آزادی کے مطالبے کی حمایت میں اگر انہیں اکثریت حاصل ہوئی ہے تو وہ انہیں زیادہ تر اچھوتوں کے ووٹ پر ہوئی ہے۔ بلکہ ہندوؤں کے سب سے بڑے مہا سبھائی مونجے نے ۱۹۲۹ء میں بالکل واضح الفاظ میں یہ کہہ بھی دیا تھا کہ ہندوستان کے ملک کی حفاظت صرف اچھوت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اچھوت تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ان میں بہادری دبے باکی کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے برعکس کھشتری جو تعداد میں ویسے بھی بہت کم ہیں اور برہمن جو صرف خود کو حکمران ٹولہ تصور کرتے ہیں میدان جنگ میں اپنے ملک کے تحفظ کے لیے ایک لمحہ بھی کھڑے نہیں ہو سکتے اس لئے اچھوتوں سے نفرت اپنے تحفظ کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے اس قسم کے خیالات ہونے کے باوجود اور ان حقائق کے ہوتے ہوئے بھی مہاتما گاندھی آخر کار انتہائی تعصب کا مظاہرہ کرنے سے باز نہ رہے۔ بلکہ مہاتما گاندھی کے اس خط نے تو ان کی ہندوستان کے تمام اقوام کے لئے مطلوبہ آزادی کے مطالبے کی قلعی کھول دی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو پتہ چل گیا کہ جو شخص خود اپنے اچھوتوں (جو دراصل اسی دھرم کے پیروکار ہیں) سے اس قدر تعصب اور تنفر کا مظاہرہ کرتا ہے وہ مسلمانوں سے (جو ان کی نظروں میں ان کے جانی دازلی دشمن ہیں) کب اچھا سلوک کر سکتا ہے۔ یا ان سے کب خلوص دل کے ساتھ وفاداری کر سکتا ہے۔

بہرحال مہاتما گاندھی نے وزیر ہند کو لکھا کہ کمیونل ایوارڈ میں اچھوتوں کو دی گئی یہ رعایت ہندوؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ ہندو کبھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کونسلوں میں اچھوتوں کو نمائندگی ملے اچھوتوں کو حق رائے دہی تک ہی محدود رکھنا درست ہے اس سے آگے وہ کاروبار سلطنت میں حصہ لینے کے مجاز نہیں قرار دیئے جائیں۔ مہاتما نے اس کے ساتھ ہی گویا یہ دھمکی دی کہ اگر ان کا یہ مطالبہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء تک تسلیم نہ کیا گیا تو وہ "مرن برت" (بھوک ہڑتال تادم مرگ) رکھیں گے اور موت واقع

Marfat.com

ہوتے کی تمام تر ذمہ داری حکومت برطانیہ پر ہوگی۔

مذہبی نکتہ نظر سے تمام اچھوت ہندو عقاید کے ماننے والے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اور ان تہذیب و تمدن تمام تر ہندو مذہب کے مطابق ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب ہندوستان کی مردم شماری ہوئی تو مسلم لیگ نے مطالبہ کیا تھا کہ اچھوتوں کو مذہبی لحاظ سے ان کی ذات میں تسلیم کیا جائے تاکہ ہندوؤں کی اصل تعداد معلوم ہو سکے۔ اگرچہ یہ تجویز ٹھوس اور قابل عمل تھی لیکن اس وقت ہندو اخبارات نے اس پر بے حد برہمی کا مظاہرہ کیا تھا تاہم اچھوتوں کو ہندو ہی تصور کیا گیا۔

مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ ایک تو میں جیل میں ہوں۔ دوسرے تحریک سول نافرمانی تیزی پر ہے۔ اسی سے حکومت متاثر ہوگی۔ اور وہ دباؤ محسوس کرکے ان کا مطالبہ تسلیم کرے گی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوؤں کے عقائد پر لگنے والی یہ ضرب ہندوؤں میں زیادہ تحریک پیدا کرے گی جس کا حکومت ہند کو احساس ہوگا اور اس احساس کے پیش نظر وہ ان کا مطالبہ تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کرے گی۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ ۸ ستمبر ۱۹۳۲ء کو مہاتما گاندھی کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا حکومت کا یہ فیصلہ ہندو لیڈر کے منہ پر زبردست تھپڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جسے وہ قطعی طور پر برداشت نہ کر سکتے تھے۔ رعب و عدم تعاون کی دھمکیوں میں ناکام ہو کر بیرون جیل ہندو لیڈروں نے اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبید کو مختلف قسم کے ہتھکنڈوں سے ورغلانا شروع کر دیا اور اس کو متعدد نوعیتوں کے سبز باغ دکھائے۔ ہندوؤں کی طرف سے مسٹر راجا جو ایک متعصب کانگرسی تھے۔ اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبید کو (DR: AMBEDKAR) مغلوب ہو گیا اور اپنے موقف سے ہٹ گیا۔ چنانچہ پونا پیکٹ کو پونا کے مقام پر ایک معاہدہ طے پایا (جو اچھوتوں اور ہندوؤں کے درمیان ہوا۔)

اس معاہدے کے تحت اچھوت اپنے اس حق سے دست بردار ہو گئے جو انہیں کمیونل ایوارڈ کے تحت ملا تھا۔ اور جس کے مطابق انہیں جداگانہ حق انتخاب حاصل تھا۔ البتہ مخلوط انتخاب کے ذریعے تحفظات کے ساتھ چند ایک نشستیں ان کے لیے مخصوص کر دی گئیں۔ اس معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ جو اچھوت تعلیمی استعداد بڑھا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا اس کے لیے انتخاب میں حصہ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ آخر میں یہ بھی کہا گیا کہ مختلف ہندو اداروں میں سے اچھوتوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص رقم رکھی جائے گی۔ اور یہ بات اچھوتوں کی کم ظرفی سے فائدہ اٹھانے کے

Marfat.com

علاوہ اور کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔

ہندوؤں اور اچھوتوں کے درمیان اس متفقہ معاہدے کو حکومت ہند کے سامنے پیش کیا گیا تو حکومت نے اسے بلا تامل منظور کر لیا۔ اس کی فی الفور منظوری بھی اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ انگریز کو اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ اچھوتوں کا اپنے حق سے دست بردار ہو جانا دراصل ہندو کی دیوار مخاصمت جو اس نے مسلمانوں کے خلاف تعمیر کرنا شروع کر دی ہوئی ہے میں زبردست تقویت کا موجب بنے گی۔ اس لئے اس نے اس معاہدے کو بلا حیل وحجت تسلیم کر لیا۔ لیکن انگریز کو شاید یاد نہیں رہا تھا کہ مسلمان تو ۱۹۱۰ء میں بذاتِ خود اچھوتوں کو ہندو قرار دینے کی ایک تحریک چلا چکے ہیں اور جس کے تحت ان اچھوتوں کو مردم شماری میں ہندو مذہب کے پیروکار تسلیم کر لیا گیا ہوا تھا۔ چنانچہ انگریز کے اس بغض نے بھی ہندو کے اس پروپیگنڈے کو فیل ہونے سے بچا لیا جس کے تحت وہ لامذہبی اقتدار کا پابند کرتا ہوا ہندوستان کی آزادی کا طلب گار بنا ہوا تھا۔ اگر انگریز اس معاہدے کو رد کر کے اپنے فیصلے کا اطلاق جاری رکھتا تو بہت ممکن ہے کہ خود ہندو قوم ایک زبردست خلفشار کا شکار ہو جاتی۔ لیکن انگریز نے اس کو اس یقینی بحران سے محفوظ رکھنے میں عملی طور پر زبردست مدد کی۔ جیسے کہ وہ مختلف معاملات میں بالواسطہ کرتا چلا آ رہا تھا۔

Marfat.com

گول میز کانفرنسیں

سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک

سوال :- انگریز نے جب محسوس کر لیا کہ ہندوستان کے عوام میں سیاسی بیداری فعالیت اختیار کرتی جا رہی ہے تو اس نے مختلف جماعتوں کے نمائندوں سے بات چیت کرنے کے لیے اپنی حکومت کے دروازے کھول دیئے برطانوی حکومت سے براہ راست بات چیت گول میز کانفرنس کی صورت میں ہوئی، یہ کانفرنسیں کب ہوئیں اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے تفصیل سے بیان کیجیے۔

جواب :- انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں انگریزی حکومت کے لیے زبردست سوچ بچار اور بحران کا دور رہا ہے بالخصوص ہندوستان کی سیاست نے انگریز کو مجبور کر دیا کہ اس ملک کی مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو ایک جگہ بٹھا کر انگریزی حکام کی موجودگی میں اپنے اپنے موقف کو بالوضاحت بیان کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ کچھ افہام و تفہیم کا کوئی سلسلہ بن جائے۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لیے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو انگلستان مدعو کیا گیا، اور وہاں پر ہر ایک کو اپنے اپنے نکتہ نظر کو کھل کر بیان کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس طرح کی تین کانفرنس وقوع پذیر ہوئیں۔ اور ہر ایک کو گول میز کانفرنس کا نام دیا گیا۔

پہلی کانفرنس ۱۹۳۰ء کے آخر میں منعقد ہوئی۔ جب کہ باقی دو کانفرنسیں سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۳۲ء میں انعقاد پذیر ہوئیں۔ ان ہر سہ کانفرنسوں کا تفصیلی حال ذیل کی سطور میں بیان کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

پہلی گول میز کانفرنس:۔ پہلی گول میز کانفرنس ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو انگلستان میں شروع ہوئی اور ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ہندوستان کے وائسرائے نے کل ۷۰ مندوبین کی دعوت نامے جاری کیے جن میں ہندو اور مسلمان لیڈر شامل تھے۔ ہندوؤں کی سازش تھی بلکہ بعض مقامات پر تو کھلی دشمنی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کی برتری کو تسلیم کیا جائے اور حکومت میں ان کی فوقیت کو برقرار رکھا جائے اور مسلمانوں کو دوسرا درجہ دے کر ان کے ماتحت کر دیا جائے۔ لیکن اس کانفرنس میں ہونے والی بات چیت کا موضوع کچھ اس قسم کا تھا۔ اس سے بیشتر جو اقدام انگریز نے کیے تھے، ان سے بھی واضح طور پر پتہ چلتا تھا کہ انگریز ایک ایسا آئین تیار کرنا چاہتا ہے۔ جس سے دو قومی نظریے کی وضاحت ہو جائے اور مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں ایک منفرد اور بااختیار قوم کی حیثیت حاصل ہو۔

مدعو مندوبین میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام قابل ذکر ہیں۔

مسلم لیگ:۔

۱۔ سر آغا خاں
۲۔ سر شاہنواز
۳۔ نواب سر احمد سعید چھتاری
۴۔ مولانا محمد علی جوہر
۵۔ راجہ شبیر محمد
۶۔ مولوی فضل الحق
۷۔ غلام حسین ہدایت اللہ
۸۔ سر میاں محمد شفیع
۹۔ چودھری ظفر اللہ خان
۱۰۔ بیگم شاہنواز
۱۱۔ مسٹر محمد علی جناح۔

کانگرس:۔

۱۔ سر تیج بہادر
۲۔ مسٹر جیکر
۳۔ ڈاکٹر مونجے وغیرہ

کانگرس کا شرکت سے انکار:۔

کانگرس نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ جنوری ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے یوم آزادی منایا اور اعلان کیا کہ جب تک ہندوستان کے عوام کو کامل آزادی نہیں مل جاتی۔ اس وقت تک تحریک سول نافرمانی جاری رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی کانگرسیوں نے لارڈ ولنگڈن جیسے مقتدر وائسرائے کو زیر سیاست کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کیے، ان سے حکومت نے

Marfat.com

اپنی زبردست بیزاری کا اظہار کیا۔ کیونکہ کانگرس تشدد اختیار کرتی جا رہی تھی۔

حکومت نے نمک پر محصول لگا دیا تو کانگرس نے انگریزوں کے خلاف احتجاجاً خود نمک سازی شروع کر دی اور محصول دینے سے گریز کیا۔ اس کے علاوہ کانگرسیوں نے انگریزوں کو بلیک میل کرنے کے لیے راہیں ہموار کرنا چاہیں۔ چنانچہ وائسرائے کے حکم سے کانگرسی لیڈروں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ مہاتما گاندھی بھی دھر لیے گئے۔ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔

ہندو اس سے برہم ہو گئے، انھوں نے انگریز کی تجویز کی ہوئی کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار سے ان کا خیال تھا کہ شاید ان کی عدم شرکت سے کانفرنس کا اجلاس ہی نہیں ہو گا لیکن انگریز نے پروگرام کے مطابق اس کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جو ہندوؤں کے لیے پچھتاوے کا باعث بنا۔

جب یہ کانفرنس شروع ہوئی تو اس میں اگرچہ کانگرس کی نمائندگی کرنے والا کوئی نہ تھا لیکن وزیر اعظم برطانیہ اور وزیر ہند کے رویہ سے یہ بات بالکل صاف نظر آ رہی تھی کہ کانگرس کی عدم موجودگی میں وہ خود کانگرس کا موقف بیان کریں گے۔ برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ (RAMSEY MECDONALD) نے اقلیتوں کے تحفظات کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں نیشنلزم کے نظریے کو بھی دہرایا۔

کانگرسی ذہن کی نمائندگی ایک مخصوص ہندوستانی گروپ بھی کر رہا تھا جو اس کانفرنس میں شریک تھا۔ ان میں مہاراجہ بیکانیر سب سے پیش پیش تھے۔ مہاراجہ بیکانیر نے تجویز پیش کی کہ تمام ہندوستانی ریاستوں کو اپنا وجود یکسر ختم کر دینا چاہیے اور ایک وفاق قائم کر لینا چاہیے اور والیان ریاست کے حقوق کی حفاظت دی جانی چاہیے تاکہ وفاق کے ساتھ الحاق کے بعد ان کا اپنا مستقبل مخدوش نہ ہو جائے، ان تمام امور پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا گیا۔

اگرچہ مسلم لیگ کے وفد کی سربراہی سر آغا خاں کر رہے تھے۔ لیکن ان میں جوش اور ولولے کے لحاظ سے سب سے زیادہ سرگرم رکن مولانا محمد علی جوہر تھے۔ انھوں نے انگلستان جا کر نہ صرف اپنے موقف کو کمال احسن درجے سے انگریزوں کے سامنے پیش کیا، بلکہ ان کی احساس آزادی اور آرزوئے حصول استقلال کی تکمیل کے جذبات ان کے مندرجہ ذیل الفاظ میں مضمر ہیں۔ انھوں نے فرمایا۔

Marfat.com

"میں ایک غلام ملک میں زندہ رہنے سے آزاد ملک میں مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔ میں یہاں سے ہندوستان کے لیے آزادی لے کر جاؤں گا۔ یا اسی ملک میں اپنی قبر کے لئے جگہ لوں گا۔

پہلی گول میز کانفرنس میں بنیادی امور طے پائے ان میں سے مندرجہ ذیل بہت اہمیت حامل ہیں۔

۱۔ اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان میں وفاقی طرز کی حکومت قائم ہوگی۔

۲۔ سر تیج بہادر سپرو کے کہنے پر انگریزوں نے اس بات کو بھی تسلیم کر لیا کہ ہندوستان میں مرکزی طور پر ایک ذمہ دار حکومت بنائی جائے اور ہندوستان کو قلمروی کا درجہ دیا جائے سر تیج بہادر کی اس تجویز کو مسلم لیگی زعماء نے بھی مان لیا۔

۳۔ تمام سیاسی جماعتوں کو اپیل کی گئی کہ وہ ہندوستان کے حالات میں امن پیدا کر کے دستور سازی کی طرف توجہ دیں۔ وزیراعظم میکڈونلڈ نے بالخصوص کانگرس کی تحریک سول نافرمانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب ان لوگوں کو تعمیری کام کی طرف توجہ کرنی چاہیئے تاکہ ہندوستان کے صوبوں میں نئی ذمہ دار حکومت قائم ہو سکے۔

۴۔ کانفرنس میں مندرجہ ذیل آٹھ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تاکہ کانفرنس کو درپیش مختلف مسائل کو علیحدہ علیحدہ پرکھا جائے۔

(i) رائے دہی کی کمیٹی

(ii) وفاقی ہیئت اور تنظیم کی کمیٹی

(iii) صوبائی دستور کی کمیٹی۔

(iv) صوبہ سندھ کی تشکیل کی کمیٹی

(v) صوبہ سرحد کے لیے کمیٹی

(vi) برما کے مسائل کے بارے میں کمیٹی۔

(vii) ہندوستان کے دفاع کے بارے میں کمیٹی۔

(viii) اقلیتوں کے مسائل کی کمیٹی۔

کانفرنس کی ابتدائی کارروائی نہایت خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں ہوئی اور متعدد امور میں مصروف رہے، اور کام کی کثرت۔ جذبات کی شدت اور احساسات کی زیادتی نے نہ صرف

Marfat.com

خوشی و مسرت کی ایک لہر دوڑنے لگی۔ لیکن اس تمام سازگار ماحول کو گدلا کرنے والے عناصر بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ جنہوں نے کانفرنس کی کامیابی اور خوشی کو جزوی ناکامی اور سنجیدگی میں تبدیل کر دیا، کیونکہ جس وقت کانفرنس میں فرقہ وارانہ مسائل کا ذکر شروع ہوا تو ہندو مہاسبھا کے مسٹر جیکر نے زہر افشانی شروع کر دی جس سے تمام فضا مکدر ہو گئی۔

چونکہ ہندوستان میں فرقوں کی ایک وافر تعداد پائی جاتی ہے اور جب تک ان کے مسائل کو حل نہ کیا جائے یا ان کے ساتھ کوئی افہام و تفہیم کا معاملہ طے نہ کیا جائے۔ دستور کس طرح بن سکتا تھا دوسرے لفظوں میں کمیونل مسئلہ آئین ہند کی تشکیل کے لیے ایک بنیادی مسئلے کی حیثیت رکھتا تھا۔ انگریزوں اور مسلمانوں نے بہت کوشش کی کہ معاملہ کسی نہ کسی طرح طے پا ہی جائے لیکن مسٹر جیکر ہندو مہاسبھائی کی ہٹ دھرمی نے اس مسئلہ کو حل نہ ہونے دیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک اس موضوع پر بحث رہی لیکن جب کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہ آیا تو اس کانفرنس کو برخاست کر دیا گیا۔

مولانا محمد علی جوہر کی وفات:۔ مولانا محمد علی جوہر مسلمانانِ ہند کی آزادی کے جذبے سے پوری طرح سرشار تھے، اور ان کی دلی آرزو یہ تھی کہ جس قدر جلدی ہو سکے وہ آزادی کی شمع کو اپنے ہاتھ سے روشن کریں اور برصغیر پر چھائے ہوئے اس خوفناک اندھیرے کو اجالے میں تبدیل کر دیں۔ وہ انگلستان روانہ ہونے سے قبل ہی علیل تھے لیکن بقول ان کے آزادی صحت انسانی سے زیادہ قیمتی چیز ہے اس لیے آزادی حصول کو صحت کے حصول پر ترجیح دینی چاہئیے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کو سٹریچر پر بھی انگلستان جا کر آزادی حاصل کرنی پڑے تو وہ ضرور جائیں گے۔

کانفرنس میں شرکت کے دوران انہوں نے اپنی ذہانت، فصاحت، بلاغت علمیت اور رفالون دانی کا سکہ انگریزوں سے منوا لیا، ان کی طرف خطابت نے پورے ملک فرنگ کو متاثر کیا، یہاں تک کہ مشہور انگریزی ناول نگار ایچ۔ جی ویلز یہ بات کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ـــ محمد علی کے پاس برق کی زبان، میکالے کا قلم اور نپولین کا دل ہے۔

مولانا موصوف نے کانفرنس کے سلسلے میں انگلستان پہنچ کر بھی دن رات کام کیا ڈاکٹروں کے مشورے کے بارے میں جس میں انہوں نے مولانا کو مکمل آرام کے لیے کہا تھا مولانا اپنے مشن میں مصروف رہے، اور کام کی کثرت۔ جذبات کی شدت اور احساسات کی زیادتی

Marfat.com

دل پر اثر ڈالا، بلکہ دماغ پر بھی بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا، اور یہی بات بالآخر ان کی وفات کا باعث بنی۔ ۴، جنوری ۱۹۳۱ء کی شب کو مولانا کے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور اس کے سبب وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ہ

دوسری گول میز کانفرنس:۔ دوسری گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو شروع ہوئی اور یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ مہاتما گاندھی نے بہ نفسِ نفیس اس کانفرنس میں شرکت کی۔ کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ حکومت برطانیہ سنجیدگی کے ساتھ کانفرنس کی کاروائی کو آگے بڑھا رہی ہے اور بہت سے مقامات پر وہ کانگرس کی نمائندگی بالواسطہ خود کر رہی ہے۔ اس لیے اندیشہ ہو کہ حکومت کوئی ایسا فیصلہ کر لے جس سے ہندوستان کے ہندوؤں کو بالخصوص اور دیگر عوام کو بالعموم کوئی نقصان پہنچ جائے۔ اس کانفرنس میں شرکت کا دوسرا مقصد مہاتما گاندھی کا یہ تھا کہ وہ اس کو ناکام بنانا چاہتے تھے تاکہ برطانوی حکومت کو کانگرس کے اثر کا پتہ چل سکے۔

مہاتما گاندھی نے کانفرنس کے پہلے دن سے نہایت قابل اعتراض رویہ روا رکھا انہوں نے خود کو پورے ہندوستان کا واحد نمائندہ قرار دیا اور دوسروں کو اپنے بعد ثانوی حیثیت کا مالک قرار دیا۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ ہندوستان میں اگر کوئی واحد سیاسی جماعت ہے تو وہ محض کانگرس ہے۔ باقی تمام ذیلی جماعتیں ہیں اور میں کانگرس کا واحد منتخبہ نمائندہ ہوں۔ اس لیے میں کانگرس کے مفاد کے علاوہ کسی قسم کی بحث سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

انہوں نے نہایت متکبرانہ انداز میں پکار کر کہا کہ اس کانفرنس میں شامل ہونے والے کانگرس کی طرف سے بھیجے گئے نمائندوں کے علاوہ باقی تمام نمائندے حکومت کے "ٹوڈی" ہیں ظاہر ہے کہ مہاتما کے رویے سے کانفرنس کے ماحول پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ یہ اجلاس شروع ہی سے فرقہ وارانہ تعصب کا شکار ہونے لگا اور گاندھی نے امن و آشتی کی بات چیت کو ڈنگ مارا۔ جب کہ یہ نہایت خوشگوار ماحول میں پروان چڑھنے والی تھی۔

پہلی گول میز کانفرنس میں جو کمیٹیاں بنائی گئی تھیں ان میں سے ایک کمیٹی کو فرقہ وارانہ مسائل کے حل کرنے کے ذرائع تلاش کرنا سپرد کیا گیا تھا۔ اور اس کمیٹی نے اس اجلاس میں اپنی رپورٹ بھی پیش کرنا تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی کے تعصب انگیز سلوک نے مسائل کے حل کی راہ میں پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ مہاتما گاندھی جانتے تھے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر اگر انصاف کی نظر سے فیصلہ کیا گیا تو مختلف

Marfat.com

فرقوں کو پورے معاشرے میں ایک گرانقدر مقام مل جائے گا جس سے کانگرس کی عظمت کی ساکھ ٹوٹ جائے گی۔ بہت سی اور قومیں انہی میں سے ابھر آئیں گی۔ اور وہ ہندو یکانگت کو پارہ پارہ کردیں گی۔ ہندو مذہب رکھنے والے اچھوت بھی کل اپنا مقام پالیں گے۔ اس لئے ان کی سرتا پیر یہ سعی کہ کسی نہ کسی طریقے سے فرقہ وارانہ مسئلے کو کھٹائی میں ڈالا جائے اور اسے ناکام بنادیا جائے اور اس مسئلے پر کانفرنس میں بحث ہی نہ ہو۔ لیکن دوسری طرف دیگر مندوب خوب تیار ہو کر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دلائل وحقائق کے ذریعے مہاتما گاندھی کی ایک بدنیتی پر مبنی کوشش کو سراسر ناکام بنادیا اور فرقہ وارانہ مسائل کا موضوع کانفرنس میں زیر بحث آیا جب مہاتما گاندھی اپنی اس کوشش میں ناکام ہوگئے تو انہوں نے کانفرنس میں افراتفری ڈالنے کے لئے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے نہرو رپورٹ (جس کے ردعمل کے طور پر مسٹر محمد علی جناح نے چودہ نکات پیش کردیئے تھے۔ اور مسلمانان ہند نے اس نہرو رپورٹ کو یکسر ناقابل تسلیم قرار دے دیا تھا) کو ایک بار پھر معمولی رد و بدل کے ساتھ اس کانفرنس میں پیش کردیا تھا۔ گاندھی کے اس اقدام نے نہ صرف کانفرنس کے مندوبین کے ذہنوں میں گاندھی کی طرف سے استعمال کیے جانے والے تعصب ناک رویے کو عیاں کردیا بلکہ ان کے دلوں میں نفرت بھی پیدا کردی۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں نے مخالفت کرنا ہی تھی اس کے علاوہ بہت سے غیر مسلم مندوبین نے بھی شدید مخالفت کا اظہار کیا۔ چونکہ گاندھی ایک تجویز پیش کرچکا تھا اس کے جواب میں مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ اس لیے انہوں نے پسماندہ اقوام (اچھوت) ہندوستانی عیسائی، اینگلو انڈین اور دیگر یورپین نمائندوں کے مطالبات پیش کردیئے اور اعلان کیا کہ ان مطالبات کو یا تو پورا پورا تسلیم کیا جائے یا کالمعدم کردیا جائے۔ ان مطالبات میں کسی قسم کے سمجھوتے یا رد و بدل کی گنجائش نہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ تجویز سر آغا خان نے پیش کی۔ اس تجویز پر کھل کر بحث ہوئی۔ لیکن بات کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچی۔ چونکہ یہ مسئلہ زبردست اہمیت کا حامل تھا اور لازمی طور پر یہ تصفیہ طلب تھا۔ کیونکہ ملک میں نافذ کیا جانے والا آئندہ آئین جماعتی اور آبادیاتی لحاظ سے تمام فرقوں کی نمائندگی تقاضوں کے مطابق بننا تھا۔ ہندوستان کے مذہبی اپنے اندر لاتعداد فرقے سموئے بیٹھے تھے۔ اور ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کو برہمن اپنی زبان میں اچھوت کہتے ہیں۔ برہمن ان اچھوتوں کی حمایت تو چاہتے تھے لیکن انہیں نمائندگی کے حق سے محروم رکھنا چاہتے تھے اور یہ چال محض اس لیے تھی کہ اپنی فوقیت کو وہ برقرار رکھ سکیں۔ انگریز

Marfat.com

کے نزدیک یہ نکتہ تھا کہ اس کو کسی مذہب یا فرقے سے کوئی دلچسپی یا لگاؤ نہیں اسے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کو کس طرح جماعتی نمائندگی دی جا سکتی ہے۔

وزیراعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے بذات خود بہت کوشش کی کہ اس کانفرنس میں فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی حل نکل آئے لیکن گاندھی کی اس آن بدل رٹ نے مسئلہ کھٹائی میں ڈال ہی دیا، اور وزیراعظم برطانیہ کو مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ میں اس کانفرنس کے نمائندوں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ جلد از جلد فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تلاش کریں ورنہ حکومت برطانیہ جو بھی مناسب حل خیال کرے گی نافذ کر دے گی، اور اس اعلان کے ساتھ کانفرنس کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

یہ کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ناکام ہو کر انجام پذیر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں گاندھی کی چال کامیاب رہی۔ ان کا خیال تھا کہ اب یہ مسئلہ اس قدر زیادہ دیر کے لیے التوا میں پڑا ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی اور مسائل ارتقاء پذیر ہو جائیں گے اور یہ مسئلہ حالات کی نذر ہو جائے گا۔ وقتی طور پر تو وہ بہت خوش ہوا کیونکہ وہ کانفرنس کو اگر پہلی ضرب سے نہ مار سکا تو دوسری منافقت سے پریشان کر گیا اور مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان کی راہ میں چٹان بن کر حائل رہنے کا مصداق بنتا رہا۔ اگر وہ کسی ایک مسئلے پر راضی ہو جاتا تو حالات کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ تاہم اس کی خوش فہمی زیادہ دیر تک اسے خوش نہ رکھ سکی اور برطانوی حکومت صرف ایک سال آٹھ ماہ انتظار کرنے کے بعد فرقہ وارانہ مسائل پر اپنا فیصلہ صادر کرنے پر مجبور ہو گئی۔

۴ر اگست ۱۹۳۲ء کو برطانوی وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کر دیا (اس اعلان کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں آ چکی ہیں) اچھوتوں کی متناسب نمائندگی مل جانے پر گاندھی پر جو گزری اور پھر اس نے جو کاروائیاں روا رکھیں ان کا ذکر "کمیونل ایوارڈ" کے موضوع کے تحت آ چکا ہے۔

تیسری گول میز کانفرنس:- تیسری گول میز کانفرنس ۱۷ر نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی اور ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو ختم ہو گئی اس اجلاس میں کانگرس نے شرکت نہ کی اس کی وجہ واضح تھی، کانگرس نے ہندوستان میں نافذ کی جانے والی آئینی اصلاحات کے سلسلے میں انگریز کے انہماک کا جائزہ لے لیا تھا اور اسے پتہ چل گیا تھا کہ یہ اصلاحات بہت جلد نافذ ہو جانے والی ہیں۔ اگر اس کانفرنس میں شرکت کر لی گئی تو ممکن ہے کہ ان اصلاحات کے سلسلے میں حکومت برطانیہ کانگرس سے براہ راست یا بالواسطہ کسی ایسے مسئلے کو حل کرانے

Marfat.com

پر مجبور کر دے جس کو کانگرس اصولی طور پر پسند نہ کرے اور بہت ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا مسئلہ کھڑا کر دے جس پر باہمی اتفاق نہ ہونے کی صورت میں کمیونل ایوارڈ کی طرح انگریز کا کوئی فیصلہ بھی تسلیم کرنا پڑے۔ ادھر مسلمانوں کی طرف سے گزشتہ کانفرنس میں مسٹر محمد علی جناح نے اس لیے شرکت نہ کی تھی کہ وہ سیاست سے بیزار ہو کر انگلستان چلے گئے تھے اور وہاں وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا اور تیسری کانفرنس میں بھی انہوں نے شرکت نہ کی۔ حالانکہ وہ انگلستان میں موجود تھے، وہ گاندھی کے رویہ سے سخت نالاں تھے۔ تاہم ان کی تمام تر نیک خواہشات مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ تھیں۔

اس کانفرنس میں کوئی خاص اہم کام سرانجام نہ پایا۔ صرف تین کمیٹیوں نے جن میں رائے دہی کمیٹی۔ وفاقی مالیات کمیٹی اور ریاستوں کے امور کی کمیٹی شامل تھی، کو اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی ان کمیٹیوں کی رپورٹوں پر چند دن غور ہوتا رہا۔ اور بالآخر ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو یہ کانفرنس اختتام پذیر ہو گئی۔ اس کانفرنس کے علاوہ برطانوی حزب اختلاف کے ارکان نے بھی شرکت نہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں جو آئینی اصلاحات نافذ کی جا رہی ہیں وہ ضرورت سے زیادہ ہیں حالانکہ یہ اعتراض حقیقت کے بالکل برعکس تھا۔ وہ آئینی اصلاحات جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت نافذ کی گئیں۔ اگرچہ انگریز سے ان کی توقع کم تھی لیکن وہ مطالبات سے بہت کم تھیں۔ ان اصلاحات کو ہندوستان کی آزادی کی طرف ایک اہم قدم ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

تیسری گول میز کانفرنس کے بعد ایک قرطاس ابیض "WHITE PAPER" شائع کیا گیا۔ جس میں تینوں کانفرنسوں کی کارروائیوں کا جائزہ لیا گیا۔ اس کی اشاعت مارچ ۱۹۳۳ء میں ہوئی اور اگلے سال اس کو برطانوی پارلیمنٹ میں برائے بحث و تمحیص پیش بھی کیا گیا۔ قرطاس ابیض میں کچھ ٹھوس نوعیت کی سفارشات بھی کی گئیں۔ ان سفارشات پر تفصیلی بحث کے بعد آئین سازی کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی بنا دی گئی۔ جس میں دونوں ایوانوں کے سولہ سولہ نمائندوں کے علاوہ ۱۹ ہندوستانی — ۷ ہندی ریاستوں اور ۱۲ برما کے نمائندوں کو شامل کر کے مسودہ تیار کرنے کی غرض سے نامزد کیا گیا۔ ۱۹ ہندوستانی نمائندوں میں ۸ مسلمان نمائندے تھے اس کمیٹی نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء تک اپنی کارروائی مکمل کر لی اور اپنے مسودہ آئین کو آخری شکل دے کر فروری ۱۹۳۵ء کو آخری صورت دے کر منظور کر لیا۔ شہنشاہ برطانیہ نے ۲۴ جولائی ۱۹۳۵ء کو اس قانون پر دستخط کر دیے۔ جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نام سے نافذ ہوا۔

Marfat.com

اگر ان تینوں گول میز کانفرنسوں کو بنظرِ غور دیکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کانفرنسوں کی کامیابی کے لیے اگر کسی نے خصوصی کام کیا تو محض مسلم لیگ تھی کیونکہ مسلم لیگ نے تینوں کانفرنسوں میں مسلسل شرکت کی اور اس کے برعکس کانگرس نے دو مرتبہ اس کا مقاطعہ کیا اور ایک دفعہ جو شرکت کی تھی تو محض فساد ڈالنے کے لیے اس کے علاوہ کانفرنس کے تیسرے دور میں برطانوی حزبِ اختلاف بھی اس سے علیحدہ ہو گئی۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ انگریز۔ ہندوستانیوں کو ضرورت سے زیادہ آئینی مراعات دے رہا ہے حالانکہ وہ یہی بات کانفرنس میں شرکت ہو کر بھی کہہ سکتے تھے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت بالکل عیاں ہو گئی تھی کہ انگریز اب کسی نہ کسی طریقے سے ہندوستانیوں کی آئینی حکومت بنانے کو تیار ہو گیا تھا، اور وہ خود اس آئینی حکومت کے نفاذ کے لیے بے قرار تھا یہی وجہ ہے کہ کانفرنس کے بہت سے مسائل کو حل کرنے کے لیے اس نے خود کو کبھی کانگرس کا ہم فریق گردانا اور پہلی کانفرنس میں نمائندوں کی عدم موجودگی میں اس کے موقف کو خود بیان کیا اور پھر دوسری کانفرنس میں کانگرس کی ہٹ دھرمی کو کمیونل ایوارڈ دے کر توڑ بھی دیا۔ کیونکہ انگریز خود چاہتا تھا کہ آئینی خلفشار کا معاملہ کسی نہ کسی صورت میں بااندازِ حسن حل ہو جائے اور ملک میں امن و امان قائم ہو۔ اس لیے ہم نہایت محتاط ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ گول میز کانفرنسیں مسلمانوں کی کامیابی کی دلیل تھیں۔ کیونکہ دِگرگوں حالات اور دو طرفہ مخالفت کے باوجود ان کی آواز برطانیہ کے دونوں ایوانوں کو ہلا گئی اور تاجدارِ برطانیہ ہندوستان کے عوام کو حکومت کے کاموں میں شریک کرنے پر رضامند ہو گیا۔

Marfat.com

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

سوال:۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ اگرچہ ہندوستان کی مکمل آئینی آزادی کا آئینہ دار نہیں تھا۔ تاہم اس کو مکمل آزادی کی طرف ایک اور ٹھوس قدم قرار دیا جاسکتا ہے۔" اس قول کی روشنی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی خصوصیات تنقیدی نکتہ نظر سے بیان کیجیے؟

جواب:۔ ہندوستان میں سیاسی بیداری اب اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ گزشتہ سالوں کی نافذ کردہ انگریزی آئینی اصلاحات بالخصوص مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات بالکل بے معنی سی نظر آنے لگی تھیں۔ پورے ہندوستان میں سیاسی آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ اچھوتوں جیسے عوام کو لیڈر میسر آگئے تھے جو اپنی اپنی اقوام کو انگریز سے جنگ کرنے کے لیے تیار کر رہے تھے بلکہ انگریز کے ساتھ سیاسی زور آزمائی شروع ہو چکی تھی۔ عدم تعاون، سول نافرمانی بھوک ہڑتال اور ستیہ گرہ جیسی تحریکیں عام ہو رہی تھیں۔

ان تمام حالات سے نپٹنے کے لیے انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ مفاہمت کرنے کے لیے تیار ہوا تو اس نے کبھی نہرو رپورٹ کی شکل میں وقت بتایا کبھی مسٹر جناح کے چودہ نکات پر تبصرہ کیا اور کبھی گول میز کانفرنسوں میں ہندوستان کی اقوام کو مصروف کار رکھا۔ تاہم گول میز کانفرنسیں ثمر آور ہوئیں۔

۱۹۳۲ء کے آخر تک گول میز کانفرنسوں کی تمام کارروائیوں کو مکمل دستاویزات کی صورت میں ڈھال لیا گیا اور بعد ازاں ایک قرطاس ابیض شائع کیا گیا جس میں انگریز نے

Marfat.com

ہندوستان کے آئینی امور میں منتخب نمائندوں کو پوری طرح حصہ لینے کی اجازت دے دی۔
ان کانفرنسوں میں اگرچہ کانگرس نے کسی انہماک کا مظاہرہ نہ کیا لیکن انگریز کے اپنے رویے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ان کو کامیاب بنانا چاہتا ہے۔ اسی لیے پہلی گول میز کانفرنس میں انڈین نیشنل کانگرس کی عدم موجودگی میں بالواسطہ ہندوؤں کے خیالات کی ترجمانی انگریز نمائندوں نے کی بعد ازاں تیسری گول میز کانفرنس میں انگریز نمائندوں کی عدم موجودگی اس بات کی غماز تھی کہ اب یہ کاروائی کسی نتیجے پر ضرور پہنچے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ۱۹۳۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں ایک باقاعدہ ایکٹ پاس ہوا جس کے تحت اہل ہندوستان کو بہت سے امور میں نمائندگی حاصل ہوگئی۔

یہ ایکٹ اگرچہ ۱۹۳۵ء میں پاس ہوگیا اور جزوی طور پر اسے نافذ بھی کر دیا گیا لیکن اس کا مکمل طور پر نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ اس کی وجہ جارج پنجم کی وفات اور ان کے بعد انگلستان میں ہونے والی کچھ قانونی کارروائیاں تھیں۔ اس ایکٹ میں بہت سی خصوصیات بھی تھیں اور اس پر ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں نے کڑی تنقید بھی کی ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم دوم شروع ہوگئی تو ان اصلاحات کا نفاذ معطل کر دیا گیا، اور مرکز کے نظام کو پھر ۱۹۱۹ء کی قانونی اصلاحات کے تحت کام کرنے کے لئے حکم دے دیا گیا۔
اس طرح جنگ عظیم دوم کے خاتمے تک فیڈرل سکیم پر عمل جو عمل جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت منظور کی گئی تھی، روک دیا گیا۔
سب سے پہلے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی خصوصیات پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

خصوصیات :-

۱۔ صوبائی آزادی یعنی صوبائی خود مختاری کا حصول۔
اس ایکٹ کے تحت تمام صوبوں کو (PROVINCIAL-AUTONOMY) دے دی گئی۔ اس طرح تمام صوبوں کو پارلیمانی طرز کی تمام تر ذمہ داری حاصل ہو گئی اور اس ذمہ داری کے تحت انہیں حکومت کی تشکیل کا اہل قرار دے دیا گیا۔
صوبائی وزیروں کو صوبائی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہونا ضروری قرار دیا گیا سیاسی جماعت کے لحاظ سے اکثریت والی پارٹی کو حکومت بنانے کا بھی اختیار دے دیا گیا۔ اراکین اسمبلی کی نامزدگی ختم کر دی گئی۔ فرقہ وارانہ نیابت قائم رہی ایسے مخصوص شعبوں کو جن کا تعلق محض صوبائی کاروبار کے ساتھ تھا۔ کو یکسر ختم کر کے صوبائی وزارتوں

Marfat.com

کو نئے سرے سے نظام تشکیل کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

۲۔ **صوبائی حکومت اور صوبائی گورنر:۔** تمام صوبائی اسمبلیوں کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ اختیارات کی حدود میں رہ کر صوبائی معاملات میں دخل دینے میں پوری پوری آزادی رکھتے ہیں اور اسمبلی کے ذریعے ہر وہ قانون بنا سکتی ہیں جن کا تعلق مفادات دامنِ عامہ سے ہو۔ ہر صوبائی اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون کی توثیق اسمبلی کے سربراہ کے سپرد ہوئی۔ ہر صوبائی اسمبلی کا سربراہ متعلقہ صوبے کے گورنر کو بنایا گیا، اور ہر گورنر انگریز تھا۔ اس طرح صوبائی قوانین کی ترویج سے پہلے ان کی توثیق انگریز گورنر سے حاصل کرنا ضروری تھی۔

اگرچہ گورنر کو صوبائی جمہوریت کے منافی کوئی قدم اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے خاص اختیارات حاصل تھے جن کے تحت وہ اپنی مخصوص ذمہ داریوں (SPECIAL - RESPONSIBILITIES) سے عہدہ برا ہو سکتا تھا۔ ان مخصوص ذمہ داریوں کے تحت وہ دوسرے معنوں میں صوبے کے ہر کام میں مخل ہو سکتا تھا، چاہے اس کا تعلق جمہوریت کے تقاضوں کے مثبت پہلوؤں سے ہو یا منفی پہلوؤں سے۔ چنانچہ جمہوری تقاضوں کی نام نہاد ترویج کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کے تسلّط کو برقرار رکھا گیا۔

۳۔ **صوبائی وزارت:۔** طے پایا کہ صوبائی وزراء کی فہرست صوبائی اسمبلی کی اکثریت والی پارٹی کا لیڈر تیار کرے گا۔ تمام وزراء ایک ہی کابینہ کے مطابق مشترکہ ذمہ داریوں کے تحت صوبے کا نظم و نسق چلانے کے لیے اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو استعمال کریں گے۔ جس وقت صوبائی اسمبلی میں وزارت کے حامیوں کی اکثریت نہ رہے گی تو اس وزارت کو مستعفی ہونا پڑے گا۔ اور حزب مخالف اپنی وزارت قائم کرے گی۔

جہاں تک صوبے میں وزارت بنانے کا تعلق ہے، آئین کی ان شقوں میں صوبوں کو جو آئینی آزادی دی گئی، وہ بلاشک و شبہ فراخدلانہ تھی۔ بالخصوص اس کی آزادی تو اس وقت مسلّم ہوتی ہے جب اکثریت کی حمایت رکھنے والی وزارت کو اس وقت وزارت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، جب اسے اسمبلی میں اکثریت کا ووٹ حاصل

Marfat.com

نہ رہے اور اس پر طرہ یہ کہ اسمبلی کی اکثریتی پارٹی کی حمایت کے فقدان کی صورت میں آپوزیشن کو وزارت بنانے کا حق مل گیا۔ یہ امر جمہوریت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

رائے دہندگان اور ان کی اہلیت :- اس ایکٹ کے تحت رائے دہندگان کو حق رائے دہی میں پوری طرح جمہوری آزادی دی گئی اور حق رائے دہی کے استعمال کو زیادہ سے زیادہ وسیع تر بنا دیا گیا۔ رائے دہندہ بنانے کے لیے گذشتہ انڈین کونسل ایکٹ ۱۹۱۹ء میں جو پابندیاں رکھی گئی تھیں ان میں سے بہت سی پابندیوں کو نرم کر دیا گیا، اس مرتبہ ووٹر کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کی تکمیل بھی اہلیت کو روا رکھتی تھی۔

۱ - معمولی ٹیکس یا لگان ادا کرتا ہو۔

۲ - شہری جائیداد کا مالک ہو۔

(کرایہ دار ہونے کی صورت میں ایک روپیہ ماہوار کرایہ ادا کرتا ہو)

۳ - زمین کا مالک ہو۔

۴ - خواندہ ہو۔

(خواندہ سے مراد یہ ہے کہ وہ انگریزی میں اپنا نام لکھنے اور دوسرے کا نام پڑھنے کے قابل ہو)

۵ - کسی بالغ رائے دہندہ سے شادی کر لینا۔

دوسرے لفظوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت تقریباً تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو حق رائے دہی مل گیا۔ جو لوگ عاقل اور بالغ ہوتے ہوئے بھی رائے دہندہ نہ بن سکتے تھے، ان میں مندرجہ ذیل بالخصوص شامل تھے۔

۱ - فاتر العقل شخص (جو کبھی کبھی عقل سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہو)

۲ - دیوالیہ شخص۔

۳ - سرکاری ملازم

۴ - غیر ملکی (جو ہندوستان کا باشندہ نہ ہو بلکہ ہندوستان میں عارضی طور پر آباد ہو)

رائے دہی کے لیے خفیہ پرچی یعنی (SECRCT BALLOT) کا طریقہ اختیار کیا گیا اور سرکاری افسروں کو خاص طور پر ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ انتخابات میں کسی قسم کا دخل نہ دیں

Marfat.com

اختیارات کی تقسیم:- وفاقی طرز حکومت کو پیش نظر رکھتے ہوئے صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے درمیان اختیارات کو تقسیم کر دیا گیا۔ اس ایکٹ کے ساتھ ایک خاص ضمیمہ شامل کیا گیا جس میں ان اختیارات کی تقسیم کا تفصیلی ذکر کیا گیا۔ یہ فہرستیں مندرجہ ذیل امور پر مبنی تھیں۔

۱۔ پہلی فہرست میں صوبائی حکومت کے اختیارات گنوائے گئے۔

۲۔ دوسری فہرست میں مرکزی حکومت کے اختیارات کی تفصیل بیان کی گئی۔

۳۔ تیسری فہرست مشترک نوعیت کے قانون بنائے جانے کے متعلق تھی مثلاً ایکسائز تعمیرات وغیرہ۔ اسے انگریزی زبان میں (CONCURRENT LIST) کا نام دیا گیا۔

اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ ان فہرستوں میں شامل مخصوص موضوعات کے علاوہ اگر کوئی مسئلہ صوبائی حکومت کو درپیش ہوگا تو اس کے حل کے لیے صوبے کو براہ راست وائسرائے سے رجوع کرنا پڑے گا اور وائسرائے کا فیصلہ آخری تصور کیا جائے گا تاہم تجارت امور خارجہ۔ ریلوے۔ دفاتر اور پولیس کے محکمے مرکزی حکومت کے سپرد ہوں گے۔

فیڈرل کورٹ کا قیام:- ہندوستان کے صدر مقام دہلی میں فیڈرل کورٹ کے نام سے ایک اعلیٰ عدالت قائم ہوئی۔ اس عدالت کو ان تمام پہلوؤں کی سماعت کا اختیار دے دیا گیا جن کو لندن کی پریوی کونسل سنا کرتی تھی اور اپنے فیصلے دیا کرتی تھی۔ فیڈرل کورٹ کو اس امر کا اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ آئین کی مختلف شقوں کی تشریح کر سکتی ہے اور اس کے واضح کیے ہوئے مفہوم کو آخری فیصلہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی آئینی قانونی مسئلے میں کسی قسم کی کوئی الجھن محسوس ہو تو وائسرائے کو اس عدالت سے رجوع کرنے کا اختیار تھا۔ تاکہ وہ اس مسئلے میں عدالت کی رائے حاصل کرے۔ اس عمل کو انگریزی اصطلاح میں REFERENCE کہتے تھے۔

سروس کمیشن کا قیام:- مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے جانے کے لیے امیدواروں کے انتخاب کی غرض سے ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کا نام سروس کمیشن رکھا گیا۔ یہ کمیشن حکومت کے بنائے ہوئے اصولوں کے تحت منتخب امیدواروں کے درمیان مقابلے کے امتحان کراتا تھا۔ اور ایک مخصوص تعداد میں ہندوستانیوں کو (جن میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی) سیلیکٹ

Marfat.com

کر کے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز کر دیتا تھا۔

ریلوے اتھارٹی کا قیام:۔ ہندوستان کے شمالی حصّے میں بالخصوص اور مرکزی حصّے میں بالعموم ریلوں کے جال بچھ چکے تھے۔ اس آئین کے تحت ریلوں کے نظام کو زیادہ احسن انداز میں چلانے کی غرض سے ایک انتظامیہ قائم کی گئی۔ جس کا نام "ریلوے اتھارٹی رکھا گیا۔ اس اتھارٹی کو اختیار دیا گیا کہ ریلوے کے نظام کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے اور ریلوے کو اعلیٰ ترین کمرشل سروس بنانے کے لئے مناسب ترین اقدامات کرے۔

ریزرو بنک آف انڈیا کا قیام:۔ ملکی سرمائے کے تحفظ اور مناسب استعمال کی غرض سے ایک انتظامیہ قائم کی گئی۔ جس کا نام "ریلوے انھارٹی رکھا گیا۔ اس اتھارٹی کو اختیار دیا گیا کہ ریلوے کے نظام کو زیادہ سے زیادہ بہتر بناتے اور ریلوے کو اعلیٰ ترین کمرشل سروس بنانے کے لئے مناسب ترین اقدامات کرے امپیریل بنک آف انڈیا کی وساطت سے چلتی تھی۔

سندھ ایک علیحدہ صوبہ:۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا دیر سے یہ مطالبہ تھا کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ مستقل صوبے کا درجہ دیا جائے۔ اور انگریز نے زبانی طور پر اس مطالبے کو متعدد بار بھی تسلیم کیا تھا لیکن اس علیحدگی کے لئے ایک آئینی شق کی ضرورت تھی۔ اس ایکٹ کے تحت سندھ کو بمبئی سے یکسر علیحدہ کر دیا گیا اور اس کو ایک خود مختار صوبے کی حیثیت مل گئی۔ چنانچہ مسلم اکثریت والا یہ نیا صوبہ بہت تگ و دو کے بعد وجود میں آیا۔

دیگر صوبوں کا قیام:۔ سندھ کی طرح ہندوستان کے شمال میں صوبہ سرحد کو شمال مغربی سرحدی صوبہ" کے نام سے اور مشرق میں اڑیسہ کو ایک خود مختار صوبہ کے لحاظ سے علیحدگی دے دی گئی۔ جہاں تک قبائلی علاقوں اور بلوچستان کا تعلق ہے انہیں برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کے زیر نگرانی ہی رہنے دیا گیا۔

مرکز میں فیڈریشن کی سکیم:۔ مرکزی حکومت کی مضبوطی کے پیش نظر یہ طے پایا کہ کہ ہندوستان کی متعدد ریاستوں کے سربراہوں کی متفقہ رائے سے پورے ہندوستان میں ایک وفاقی نظام قائم کیا جائے اس سلسلے میں تمام

Marfat.com

والیان ریاست سے معلوم کیا جائے کہ وہ کس قدر نمائندے مرکزی اسمبلی میں نامزد کرنا چاہتے ہیں یا انہیں انتخاب کے ذریعے بھیجنا چاہتے ہیں اور جب ہندوستان کی ریاستوں کی اکثریت اس سکیم پر رضامند ہو جائے تو وائسرائے کو اختیار حاصل ہے کہ وہ فیڈریشن آف انڈیا کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیں۔

اس سلسلے میں بہت زیادہ غور و خوض کیا گیا، اور اس غور و خوض میں دو سال گزر گئے اور ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اس لئے فیڈریشن آف انڈیا کے قیام کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

فیڈرل اسمبلی کی ہیئت:- مرکزی مجلس قانون ساز یعنی فیڈرل اسمبلی کی ہیئت بالکل عجیب سی بنائی گئی برطانوی صوبوں سے بالواسطہ انتخاب کے ذریعے کوٹہ سسٹم کے تحت اراکین کو فیڈرل اسمبلی کا ممبر چنا جاتا تھا۔ صوبائی اسمبلیوں میں انتخاب کے وقت فرقہ وارانہ تعداد کو لازماً ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا تھا۔ دیسی ریاستوں کے اراکین کی تعداد وائسرائے اور ریاستی حکمران کے مابین وفاقی معاہدہ کی رو سے متعین ہونا تھی البتہ ریاستی اراکین کو دیسی ریاست کے حکمران اپنی مرضی کے مطابق نامزد کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔

فیڈرل اسمبلی دو ایوانوں پر مشتمل تھی:- ایوان عام اور ایوان خاص

ایوان اعلیٰ کو انگریزی میں COUNCIL OF STATES کا نام دیا گیا۔ جس کے کل ارکان کی تعداد ۱۵۶ تھی۔ ان میں سے ۱۰۴ ارکان دیسی ریاستوں کی نمائندگی کرتے تھے ایوان عام کا دوسرا نام فیڈرل اسمبلی FEDRAL ASSEMBLY تھا جس میں کل ارکان کی تعداد ۲۵۰ تھی۔ اس میں ۱۲۵ ایسے ارکان کو شامل کرنے کی حکومت کو اجازت تھی جو دیسی ریاستوں کی طرف سے نامزد کئے گئے ہوں۔ فیڈرل اسمبلی کی میعاد پانچ سال کی تھی۔ لیکن وائسرائے کو اسے قبل از وقت ختم کرنے یا معطل کرنے کا اختیار تھا۔

مرکزی وزراء:- جہاں تک مرکزی وزراء کا تعلق ہے، اس میں ۱۹۱۹ کے تحت دی جانے والی مراعات میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی اور مرکز میں دوعملی کی پالیسی کو برقرار رکھا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے صوبوں کو بہت سی خود مختاری مل گئی۔ لیکن مرکز میں وہی مخصوص (RESEVRED) اور منتقل۔

Marfat.com

(TRANSFERED) شعبوں کی تفریق قائم رہی۔

جن محکموں کو مخصوص قرار دیا گیا، ان میں دفاع، خارجہ، مذہبی اور قبائلی علاقوں کے انتظام کے محکمے شامل تھے۔ یہ محکمے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے تین افراد کے سپرد تھے۔ یہ تینوں ارکان کونسل براہ راست وائسرائے کو جواب دہ تھے۔ جہاں تک منتقل شعبوں کے محکموں کا تعلق ہے وائسرائے اپنی مرضی سے فیڈرل اسمبلی کے اراکین میں سے انہیں نامزد کرلیا تھا۔ ان کی کل تعداد دس تھی اور یہ دس کے دس اسمبلی کے سامنے جواب دہ تھے۔

گورنروں کا تقرر اور ان کے اختیارات:۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت تمام صوبائی گورنروں کا تقرر خود وائسرائے کے اپنے ہاتھ میں تھا، اور ہر صوبے کا گورنر وائسرائے کی خوشنودی تک قائم رہ سکتا تھا تاہم نئے آئین کے تحت ہر صوبائی گورنر کو وسیع اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔

ان وسیع و اہم ترین اختیارات میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ قانون سازی کے اختیارات

۲۔ انتظامی اختیارات۔

عام حالات میں ملک میں قانون سازی کا کام صوبائی اسمبلی کے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے لیکن اگر اسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ صوبے کا نظم و نسق فی الفور کسی خاص مسئلے کی وجہ سے منفی انداز میں متاثر ہو رہا ہے تو وہ آرڈیننس جاری کرنے کا مجاز ہے جسے بعد ازاں صوبائی اسمبلی بل کی صورت میں اسمبلی کے اجلاس میں پیش کر کے یا تو منظور کروالیتی ہے یا رد کر دیتی ہے آرڈیننس کے خطوط پر بنایا جانے والا سرکاری بل جب اسمبلی سے منظوری پالیتا ہے تو اسے قانون کی صورت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری بلوں کے پاس ہو جانے کے بعد گورنر کی توثیق کی ازحد ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک صوبائی گورنر اسمبلی کے پاس کردہ مسودۂ قانون پر توثیق کے دستخط ثبت نہ کرے اس وقت تک وہ مسودۂ قانون ناقابل نفاذ ہوتا ہے اس لحاظ سے صوبائی قوانین کی ساخت میں سب سے زیادہ فوقیت گورنر کو حاصل ہوتی ہے۔ گورنر کسی منظور شدہ قانون کو رد بھی کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

جہاں تک انتظامی معاملات کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں گورنر کو صوبے کا سب سے اعلیٰ منتظم قرار دیا جاتا ہے اور امن عامہ قائم رکھنے قانون کا احترام کرانے اور قانون کا نفاذ کرانے کے لیے

Marfat.com

اس کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہیں۔ اگرچہ گذشتہ مسودات قانون میں گورنر کو بہت سے اختیارات حاصل تھے لیکن انتظامی معاملات میں اسے مرکز کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت اسے خصوصی ذمہ داریاں (SPECIAL RESPONSIBILITIES) سپرد کی گئیں گورنر کو اختیار تھا کہ صوبے کے امن و امان کے قیام کے لیے ہر وہ قدم اٹھائے جو اس کی فہم و فراست کے مطابق بالکل جائز اور مناسب ہو۔ اقلیتوں کی حفاظت کے لیے وہ اکثریتی جماعتوں پر کسی بھی قسم کی پابندی لگانے کا مجاز بنا دیا گیا چونکہ ملک بھر میں انگریزی تسلط کے خلاف نفرت کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا اور لوگوں کو کچھ آئینی آزادی بھی مل گئی تھی۔ اس لیے حکومت نے تمام صوبائی حکومتوں کے گورنروں کو ہدایات جاری کیں کہ اسمبلی میں کسی ایسے مسودہ قانون کو زیر بحث نہ لانے دیا جائے جس کی بنا پر انگریزی یا برطانوی مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، نہ ہی اسمبلی میں کوئی ایسا قانون پیش ہونے دے جس سے سول سروس پر کوئی برا اثر پڑتا ہو۔

تمام گورنروں کو مرکز کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ وہ صوبائی انتظامیہ کے لیے جو بھی قدم اٹھانا چاہیں۔ اس کے بارے میں پہلے کابینہ سے مشورہ کر لیں یا کم از کم اس وزیر سے ضرور مشورہ کر لیں جس کا اس خاص مسئلے یا موضوع سے تعلق ہو جس کے بارے میں گورنر کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں لیکن جہاں تک ریاستوں کے امور کا تعلق ہے، گورنر اس سلسلے میں کسی وزیر کے مشورے کا پابند نہیں اور نہ ہی گورنر کو کسی وزیر سے اس بارے میں کوئی مشورہ لینا چاہیئے بلکہ ایسے حالات میں اس کا ذاتی فیصلہ یعنی INDVIDUAL JUDGMENT ہی کافی ہوگا۔

ہنگامی حالات میں گورنر کے اختیارات:۔ اس ایکٹ کے تحت گورنر کو اختیار حاصل تھا کہ وہ اسمبلی کے اجلاس کو طلب کرے۔ ملتوی کر دے، اسمبلی کو خاص وجوہات کی بنا پر معطل کر دے یا اسمبلی کو بالکل کالعدم قرار دے دے اور ہنگامی حالات کا اعلان کر دے۔ ہنگامی حالات میں صوبے کا پورا نظم و نسق گورنر کے ذاتی اختیار میں آجاتا ہے اور وہ صرف سول سروس کے ذریعے فرماں روائی کرتا ہے۔ البتہ اسے اپنے مشیر مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔

ہنگامی حالات میں گورنر کی طرف سے جاری کیے جانے والے تمام فرامین (ORDINE-NCES) کی منظوری وائسرائے سے حاصل کرنا ضروری تھی، اس قسم کے تمام فرامین کے نفاذ کی مدت چھ ماہ کی تھی لیکن اس مدت کے بعد مزید اسی مدت کے لیے تجربہ پاسکتے تھے۔ وائسرائے

Marfat.com

کی منظوری کے بعد یہ فرامین گورنرز ایکٹ (GOVERNERS ACT) کہلاتے تھے۔

مالی امور:۔ گورنر کو صوبائی مالیات کے اخراجات اور ان کی مدوں میں رقوم کی تخصیص کے لئے خصوصی اختیارات دیئے گئے اس طرح صوبے کے خزانے پر سب سے اعلیٰ اتھارٹی صوبائی گورنر کو بنایا گیا اگر کسی مد میں صوبائی اسمبلی رقوم کی کمی کر دیتی تو گورنر کو صوبائی اسمبلی کے اس فیصلے کو کالعدم قرار دینے کا بھی اختیار دے دیا گیا اور اگر دوران بحث کسی بل کو گورنر اپنی فہم میں ناپسندیدہ خیال کرتا تو اس بل پر غور و خوض کی ممانعت کر سکتا تھا۔ اس طرح اسمبلی کی کارروائی بھی بالکل بے بسی کا شکار ہو جاتی۔

دستاویز ہدایات:۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت جہاں صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب انعقاد اور قانون سازی میں جمہوری نوعیت کی آزادی کی جھلک ملتی ہے۔ وہاں انگریز نے ان سب خوش فہمیوں کو صوبائی گورنر کے وسیع ترین اختیارات کے ذریعے خاک میں ملا دینے کے لیے ایک خصوصی دستاویز تیار کی۔ اس دستاویز کو INSTRUCTIONS OF INSTRUMENT کو کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت برطانوی حکومت کی طرف سے تمام گورنروں کو ان کے وسیع ترین اختیارات کی فہرست مہیا کی گئی۔ اس دستاویز کے آجانے سے صوبوں کی جمہوری اقتدار دراصل گورنر کی خودمختاری (AUTONOMY) میں تبدیل ہو کر رہ گئیں۔

تنقید:۔ اگرچہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء انڈین کونسل ایکٹ ۱۹۱۹ء کے مقابلے میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں لے کر آیا تھا لیکن ہندوستان کے عوام جس جمہوریت اور آزادی کے لیے مطالبے کر رہے تھے اور جس قسم کے قانون کے نفاذ کی توقع کر رہے تھے وہ انہیں ہرگز نہ ملا۔ پورے ہندوستان میں تمام سیاسی جماعتوں نے اس ایکٹ کی مجوزہ فیڈرل سکیم کی زبردست مخالفت کی اور اس کو ناقابل عمل قرار دیا۔ انگریز نے اس آئین کی تیاری کے لیے ہندوستان کے لیڈروں کے خیالات کو گول میز کانفرنس میں ریکارڈ تو کر لیا تھا۔ وہ ان کے نظریات سے آگاہ بھی اچھی طرح ہو گئے تھے۔ لیکن دو سال کے غور و خوض کے بعد مسودہ قانون انہوں نے برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کیا اس میں لاتعداد مطالبات کو برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ اس میں لاتعداد مطالبات کو برطانوی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کے عوام میں متوقع آئین کی آمد سے خوشی کی بجائے تحیر اور غم کے احساسات نے جگہ پائی۔

Marfat.com

مسلم لیگ نے شروع سے ہی اعلان کر دیا کہ مرکزی حکومت کی وفاقی سکیم بالکل بے معنی اور نقائص سے بھرپور ہے۔ مسلم رہنماؤں کی نگاہ میں یہ سکیم رجعت پسندانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود ملکی مفادات کے منافی ہے اور اس سکیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ ملک کی مکمل آزادی کے مسئلے کو اس طرح کھٹائی میں ڈال دیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ وقت گزر جانے کے بعد عوام کے استقلال سے بھرپور جذبات کو ٹھنڈا کر دیا جائے اور ان کی تگ و دو کو خاک میں ملا دیا جائے چنانچہ مسلم لیگ کی نظر میں یہ ایکٹ قابل استرداد ہے۔

اس ایکٹ کے تحت نافذ کی جانے والی فیڈرل سکیم کا اصل مقصد ہندو نوازی تھا۔ کیونکہ اس سکیم کے تحت مرکز میں ہندوؤں کو دائمی اکثریت حاصل رہنا تھی اور مسلمانوں کی آواز ہمیشہ ہندو شور و غل کی نذر ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی خدشہ تھا کہ وفاق میں ہندو ریاستوں کی بھاری اکثریت کی شمولیت ہندوؤں کے غلبہ کو ناقابل تسخیر بنا دے گی۔ اور ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ کے لیے اقلیت بن کر محکوم ہو جائیں گے۔ اسی ابدی غلامی سے بچنے کے لیے مسلمانوں نے ایک علیحدہ مسلم سٹیٹ کا مطالبہ شروع کر دیا۔

وفاقی سکیم پر جہاں تک ہندوؤں کے اعتراضات کا تعلق ہے ان کا خیال تھا کہ مرکزی حکومت کو مضبوط ہونا چاہیئے۔ اس لیے صوبائی خود مختاری عطا کرنے کی بجائے اس سکیم میں صرف مرکز کی استواریت کے لیے قدم اٹھانے چاہئیں اور صوبوں کو براہ راست مرکز کے تحت کام کرنے کا حکم دیا جانا چاہیئے۔ اس تجویز کا اصل مقصد یہ تھا کہ مرکز میں چونکہ ہندوؤں کی اکثریت ہو گی اور اسی اکثریت کے بل بوتے پر وہ ان صوبوں میں بھی اپنا مرکزی قانون چلا سکتے ہیں جن میں مسلم اکثریت ہے۔ اس طرح وہ مسلم اکثریت رکھنے والے صوبوں کی خود مختاری بھی سلب کرنا چاہتے تھے۔

ہندوؤں کے نزدیک یہ بات بھی قابل اعتراض تھی کہ دیسی ریاستوں میں سے نمائندوں کو بذریعہ نامزدگی لیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ باقی ہندوستان کی طرح دیسی ریاستوں میں بھی انتخابات کرائے جائیں تاکہ انگریز پرست عناصر فیڈرل حکومت میں نہ آسکیں۔ اس کے علاوہ برطانوی صوبوں سے نمائندوں کی تعداد کوٹا سسٹم کی بجائے آبادی کے لحاظ سے متعین کی جانی چاہیئے۔ ہندوؤں کے اس مطالبے میں بھی تعصب پنہاں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ہندو ریاستوں میں انتخابات کے ذریعے تو ظاہر ہے کہ ہندو ہی نمائندگی کے لیے آئیں گے۔ لیکن مسلم ریاستوں کو بھی بلیک میل کر کے ہندو نمائندے ہی مرکز میں بھیجے جائیں۔ چاہے وہ کانگرس کے نام پر ہی

Marfat.com

کیوں نہ ہوں۔

دیسی ریاستوں کے والیان نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ اس تجویز کے تحت وفاق میں شامل نہ ہوں گے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف ریاستوں کی اپنی توقیر و احترام کو ضرب لگے گی۔ بلکہ ہندوستان کے معمولی علاقوں میں سے منتخب ہونے والے نمائندوں کو ریاستوں میں دخل دینے کا اختیار حاصل ہوجائے گا جو ان کی توہین کے مترادف ہوگا۔ دیسی ریاستوں میں بالخصوص اس وقت بے چینی محسوس کی گئی۔ جب کانگرس کی طرف یہ مطالبہ کیا گیا کہ ریاستوں میں نامزدگی کی بجائے طریقہ انتخاب رائج کیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ تمام والیان ریاست نے مل کر ایک چیمبر تشکیل کی جس کا نام "چیمبر آف پرنسز MBER OF PRINCES رکھا گیا اس چیمبر نے مجوزہ فیڈرل سکیم کی متحد ہوکر اور ڈٹ کر مخالفت کی۔

مذہبی تعصب کے علاوہ ہندوستان کے عوام میں مجموعی طور پر جو اعتراضات کئے جارہے تھے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مرکزی حکومت میں دوعملی قطعی طور ناپسندیدہ تھی۔

۲۔ محفوص اور منتقل شعبوں کی تخصیص ایک ذمہ دار حکومت کی نفی کے مترادف تھی۔

۳۔ بجٹ کی مختلف مدوں پر بحث پر پابندی جمہوریت کے تقاضوں کے سراسر خلاف تھی کیونکہ کامیاب جمہوریت کا مقصد ہی یہ ہونا ہے کہ عوام اپنے مجموعی مفاد کی خاطر جس طرح مناسب سمجھیں خرچ کریں۔

۴۔ وزیروں کی آراء کو رد کردینے کے بارے میں گورنروں کے اختیارات وزراء کی توہین کے مترادف تھے اور وزراء غیر یقینی کیفیت کے مسلط کردینے کے برابر تھے۔

۵۔ محفوص وزراء فیڈرل اسمبلی کے سامنے جواب دہ نہ تھے۔ یہ تخصیص نہایت جانبدارانہ نوعیت کی تھی۔ ان تینوں وزراء کے پاس مخصوص محکمے بھی تھے جن کے بارے میں وہ سوائے وائسرائے کے کسی اور کے سامنے جواب دہ نہ تھے۔ چنانچہ وائسرائے ان کو اپنا مونٹر ٹول بنا سکتا ہے۔

مختلف زعماء کی آراء:۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بارے میں نہ صرف مسلمانوں نے اپنی پسندیدگی کا

Marfat.com

اظہار کیا بلکہ مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے مختلف زعماء نے اپنے اپنے خیالات کا پر مغز اور با معنی انداز میں اظہار کیا ہے:

مسٹر محمد علی جناح نے فرمایا:

"نیا آئین سراسر بے ہودہ اور نکما ہونے کے علاوہ بنیادی نقائص کا پلندہ ہے اور قطعی طور پہ ناقابل عمل اور ناقابل قبول ہے"

مشہور کانگرسی راج گوپال اچاریہ نے کہا:

"نیا آئین ۱۹۱۹ء کی دو عملی سے بھی بدتر ہے"

مشہور انگریز مؤرخ اے۔ بی کیتھ (A.B. KEITH) کا قول ہے۔

"۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں فیڈرل اسکیم کی بجائے "حرامی وفاق" (BASTARD FEDERATON) موجود ہے"

پنڈت جواہر لال نہرو نے اعلان کیا:

"ہمیں ایک خوبصورت موٹر ملی ہے جس میں انجن تو ہے ہی نہیں بس بریکیں ہی بریکیں ہیں"

شیر بنگال جناب اے۔کے فضل الحق نے ارشاد فرمایا:

"اس ایکٹ کے تحت نہ ہی ہندو راج تھا اور نہ ہی مسلم اقتدار، بلکہ برطانوی سامراجیت اس میں نمایاں تھی"

بنگال کے انگریز گورنر مسٹر آر جی کیسی (۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۷ء) نے اپنی کتاب "این آسٹریلین آف انڈیا" میں اس ایکٹ کے بارے میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے جسے سید ریاض حسن نے "پاکستان ناگزیر تھا" میں ترجمہ کر کے نقل کیا ہے۔

"گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء، خود اختیاری کی طرف ایک بڑا قدم تھا اور وہ سائمن کمیشن کی سفارشات سے بہت آگے بڑھ گیا۔ صوبوں کے اندر ان تمام شعبوں میں ذمہ دار حکومت قائم ہو گئی جو وفاق کے کسی صوبے میں ہو سکتی ہے ہیں۔ قریب قریب تمام معاملات میں گورنر اس کا پابند تھا کہ وزراء کے مشورے پر عمل کرے۔ چند معاملات میں وہ از روئے قانون ان کے مشورے کے خلاف عمل کر سکتا تھا۔ یہ تحفظات بہت ہی کم تھے اور گورنر کو خاص ہدایات تھیں کہ

Marfat.com

اپنے خصوصی اختیارات کو اس طرح نہ برتنے کہ وزراء اپنی واجبی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہ ہو سکیں۔"

آگے چل کر مسٹر حسن ریاض لکھتے ہیں کہ:

"اگرچہ گورنروں کو اس قسم کی ہدایات تھیں لیکن ان پر عمل بہت کم ہوا۔ بلکہ اس سے الٹا اثر ہوا، وہ یہ کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت تو کچھ نہ ہوئی اور ان کے اخلاق اور حوصلے پر اس قدر برا اثر پڑا کہ وہ اکثریت کے مقابلے میں انصاف حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ گورنروں اور گورنر جنرل کی خوشامد کرتے رہیں۔"

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت انتخابات:

اس ایکٹ کا نفاذ جولائی ۱۹۳۵ء میں عمل میں آیا۔ اب پورے ہندوستان میں سیاسی جماعتوں نے اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے لیڈروں کے ساتھ سر جوڑے اور آئندہ لائحہ عمل تیار کرنے کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں بمبئی کے مقام پر سید وزیر حسن کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ پہلے تو آپ نے ہندوستانی عوام پر دستور مسلط کرنے کی مذمت کی لیکن تھوڑی سی بحث و تمحیث کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اس دستور کے تحت ہونے والے انتخابات میں بھرپور حصہ لیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کانگرس کے مکار لیڈر اسی کو موقع غنیمت شمار کر کے اسمبلیوں کی نشستوں پر ایک طویل عرصہ کے لئے براجمان ہو جائیں۔ مسلم لیگ نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ انتخابات جیتنے کے بعد آئین میں تبدیلی کرانے کے لئے آئینی اقدام اٹھائے جائیں۔

کانگرس نے بھی اپنی سطح پر کچھ اسی قسم کے فیصلے کئے۔ تاہم ۱۹۳۶ء میں انتخابات عمل میں آئے۔ مجموعی طور پر کانگرس کو ان انتخابات میں زبردست کامیابی نصیب ہوئی اس کی وجہ دراصل ایک تو ہندو اکثریت تھی جو من حیث القوم کانگرسی تھی، اور دوسرے مسلمانوں میں افتراق تھا جو مسلمان ہوتے ہوئے بھی مسلم لیگ میں شامل نہ ہوتے تھے۔ اس افتراق کی وجہ ہندو رسوخ تھا جو مختلف صورتوں میں مسلمانوں کی مجبوریوں پر چھایا ہوا تھا۔ ان مجبوریوں میں مالی و سماجی مجبوریاں شامل تھیں۔ علاوہ ازیں انگریز کے پیدا کردہ حالات نے مسلمان کو ہندو کے سامنے سر اٹھانے کی کوشش کرنے کو ہر آن ناکام بنا دیا۔ لیکن ارادے کی استقامت نے بالآخر مسلمان کو کامیاب کیا اور وہ ہندو کے چنگل سے بھی آزاد ہو کر رہا۔

Marfat.com

مسلم لیگ کی ناکامی کی وجہ ایک اور بھی تھی، وہ یہ کہ جہاں مسلم اکثریت تھی وہاں کانگرس اور انگریز کی سیاسی شرارتوں کی بناپر مسلمان کو تقسیم کرنے کے لئے کچھ اور سیاسی جماعتیں تشکیل پذیر ہوگئی تھیں۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ یونینسٹ پارٹی۔ بنگال میں کرشک سرامک پارٹی اور سرحد میں غفار خاں کی پروردہ کانگرس مسلمانوں کے شیرازے کو بکھیرنے کا موجب بنیں ہندوستان بھر میں ۴۸۴ صوبائی نشستوں میں سے مسلم لیگ کو صرف ۱۰۸ نشستیں حاصل ہوئیں اس لحاظ سے مسلم لیگ کی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ مختلف صوبوں میں مسلم نشستوں اور ان میں مسلم لیگ کی حالت نہایت قابل رحم تھی کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

صوبہ	کل مسلم نشستیں	مسلم لیگ
پنجاب	۸۴	۲
بنگال	۱۱۷	۴۰
شمال مغربی سرحدی صوبہ	۳۶	-
سندھ	۳۵	-
بمبئی	۲۹	۲۰
مدراس	۲۸	۱۱
یو۔پی	۶۴	۲۷
بہار	۳۹	-
سی۔پی	۱۴	-
آسام	۳۴	۸
اڑیسہ	۴	-
	۴۸۴	۱۰۸

ان انتخابات کے بعد مسلم لیگ کے رہنماؤں کو حقیقی طور پر پتہ چل گیا کہ ابھی انہیں مسلمانان ہند کی راستے کو بہت زیادہ ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں ہندو افسوں کاری اور تفرقہ بازی کے عملی ثبوت مہیا آگئے۔ اب انہیں اپنی وہ تمام خامیاں نظر آگئیں جن کی بنا پر انہیں عوام کی حمایت سے

Marfat.com

محروم رہنا پڑا۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ ضرورت سے کہیں زیادہ جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت باقی ہے اور ہندو کی گمراہ کن پالیسی کے اثرات سے بچانے کے لئے بہت سے اقدامات کی احتیاج ہے۔ مسلم لیگ کو اب یہ احساس بھی شدت سے ہونے لگا کہ اگر یہی صورت حال رہی اور اسی قسم کا آئین زیادہ دیر تک نافذ العمل رہا تو مسلمانوں کی رہی سہی ساکھ بھی مٹی میں مل جائے گی۔ چنانچہ حوصلہ شکنی محسوس کرنے کی بجائے مسلم لیگ نے کہیں زیادہ عزم کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اور آنے والے بیس سال کے اندر انگریز کو مجبور کر دیا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے لئے ایک علیحدہ سلطنت تشکیل کرے جو سوائے تقسیم ہند کے اور کسی صورت میں نہیں ہو سکتی اس زبردست عزم کو حاصل کرنے کے لئے مسٹر محمد علی جناح قائد اعظم بن کر مسلمانوں کے رہنما بنے اور بالآخر پاکستان حاصل کر کے ہی دم لیا۔

Marfat.com

کانگریس کی حکومت

سوال:۔ کانگریس کی حکومت کی تشکیل، اس کی کارروگی مسلمانوں میں اس کے ردِ عمل کا بالتفصیل جائزہ لیجیے؟

جواب:۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء میں جن انتخابات کے نتائج کا اعلان کیا گیا ان میں مسلم لیگ کی صورت حال چنداں تسلی بخش نہیں تھی۔ اور حیرت انگیز طور پر مسلم لیگ نے کم نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس کمی کی وجوہات گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہیں۔ بہر صورت ان انتخابات میں مرکزی اسمبلی اور متعدد صوبائی اسمبلیوں میں کانگریس کو حکومت بنانے کا حق مل گیا۔ کانگریس کی انتخابات میں کامیابی دو اہم باتوں پر منتج ہوئی۔ ایک یہ کہ مسلمانوں میں احساس آزادی زیادہ پیدا ہو گیا۔ اور ایک یہ کہ ہندوؤں میں جذبہ تعصب کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ کیونکہ انہیں انتخابات جیتنے کا تکبر ہو گیا تھا۔ اس بنا پر کانگریس کے لیڈروں میں انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویے کی ایک روچل پڑی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ کانگریس حکومتیں بنانے میں کسی غیر کانگریسی سے کسی قسم کا کوئی اشتراک نہیں کرے گی۔ ان کے تکبر کی حد یہاں تک بڑھ گئی کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک بھرے جلسے میں یہ بڑھ ماری کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ایک برطانیہ اور دوسری کانگریس اس اعلان سے ظاہر تھا کہ پنڈت نے ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود سے انکار کر دیا ہے۔ پنڈت کا یہ اعلان مسلمانانِ ہند کے لیے ایک تازیانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ پورے ہند کے مسلمانوں میں غیض و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور یہ احساس پیدا ہوا کہ ابھی تو کانگریس نے صرف انتخاب جیتنے ہیں تو مسلمانوں سے تنفر کا مظاہرہ اتنی شدت سے ہونے لگا ہے۔ جب انہیں مستقل طور پر حکومت کا موقع ملا تو یہ مسلمانانِ ہند پر کیا کیا مظالم نہ ڈھائیں گے۔ پنڈت نہرو کے متکبرانہ دعویٰ کا جواب فی الفور قائد اعظم محمد علی جناح نے دیا۔ اور اعلان کیا کہ ہندوستان میں تین پارٹیاں ہیں ایک برطانوی جماعت دوسرے ہندو اور تیسرے مسلمان جن کے وجود کو نہ صرف انگریز کا انڈین کونسلز ایکٹ ۱۹۱۹ء بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء آئینی طور پر تسلیم بھی کرتا ہے۔ قائد اعظم نے یہ بھی کہا کہ پنڈت جی کو یہ نہیں فراموش کر دینا چاہیئے کہ ان کی کانگریس میں بہت سے درغلائے ہوئے مسلمان

Marfat.com

شامل ہیں جن کے معصوم کندھوں پر بے تعصبی کا مکارانہ ہاتھ رکھ کر انہیں حقائق سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن بہت جلد پنڈت جی کا یہ نشہ ہرن ہو جائے گا۔

کانگرس کو بہار، اڑیسہ، سی پی، بمبئے، اور مدراس میں غالب اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ اس لیے ان صوبوں میں خالص کانگرس کی وزارتیں تشکیل ہونا تھیں۔ یوپی میں اگرچہ مسلمانوں کی کل آبادی سولہ فیصد تھی لیکن صوبے کی کل ۲۲۸ نشستوں میں سے مسلمانوں کے لیے ۶۴ نشستیں محفوظ تھیں۔ اس کے مقابلے میں کانگرس صرف ایک نشست حاصل کر سکی تھی۔ باقی نشستیں آزادی اور دوسری مختلف سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کو ملی تھیں۔ اس صورت حال میں مسلم لیگ کے اکابرین کو توقع تھی کہ یہاں کی وزارت بنانے میں کانگرس مسلم لیگ سے تعاون کرے گی لیکن کانگرس کی بوالعجمی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت کانگرس کو اس بات کے لیے کہا گیا تو علاقے کے سب سے بڑے کانگرسی مولانا ابوالکلام آزاد نے کسی عجیب منطق سے یہ فقرہ کہا کہ کانگرس صرف اسی صورت میں مسلم لیگ سے تعاون کر سکتی ہے جب وہ خود کانگرس میں ضم کر دے اور وہ کانگرس کے قواعد وضوابط کی پابندی کا وعدہ کرے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ کانگرس کے عزائم کیا تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہندو کے بدترین عزائم کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی بہت سے مسلمان اکابرین کانگرس کو اپنی پناہ گاہ کیوں خیال کرتے تھے۔ اور جب کہ انہیں معلوم تھا کہ ہندو کبھی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا اور یہ ہمیشہ بغلگیر ہوتے وقت پیٹ میں چھرا گھونپتا ہے۔ دراصل مسلمانوں کو یہ تصور دیا جاتا رہا کہ جہاں تک نظام حکومت چلانے کا تعلق ہے اور جہاں تک ملکی انتظامیہ کا تعلق ہے اس میں مذہب چنداں اہم کردار ادا نہیں کرتا۔ مذہب تو صرف ذاتی کردار کو درست کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب، سندھ اور بنگال ایسے صوبے تھے جہاں مسلمان غالب اکثریت میں تھے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اور کانگرسی مہروں کی برادر کشی پالیسی استعمال کر کے ان صوبوں میں مسلم لیگ کو پنپنے نہ دیا۔ اس کے ساتھ انگریز نے بھی پس پردہ بڑا بھیانک کردار ادا کیا۔ صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی حتمی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر دیا۔ کیونکہ انگریز نے اس صوبے کو نیم فوجی علاقے کی حیثیت دے رکھی تھی اور یہاں پر سیاسی اصلاحات کے بارے میں کبھی غور و فکر ہی نہیں کیا تھا بلکہ انہیں ہمیشہ عصائے حکومت کی ضرب سے ڈرایا ہی جاتا رہا۔ انگریز نے وہاں کے عوام پر سختیاں کر کے انہیں زیادہ باغیانہ انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اس صوبے کی اخلاقی و سماجی تنظیموں کو محض سیاسی قرار دے کر ان کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا جن میں خان عبدالغفار خاں بھی

Marfat.com

شامل تھے۔ عوام نے اس کے خلاف جب مظاہرے کیے تو انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا اور پھر ان پر مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس صورت حال سے کانگرس نے بہت فائدہ اٹھایا۔ کانگرس کے اس کیفیت سے بخوبی آگاہ تھے جو سرحد کے باشندوں پر طاری تھا۔ ان سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے خان عبدالغفار خان کو اپنے آغوش میں لینے کے لیے بازو پھیلائے اور تھوڑی سی ظاہری ہمدردی دیکھ کر خان عبدالغفار خان نے خود کو پورے کا پورا ان کی آغوش میں ڈال دیا۔ اس طرح پورے صوبے کی سیاست کانگرس سے متاثر ہوگئی۔ یہاں تک کہ دوسرے لفظوں میں صوبہ سرحد کانگرس کی آغوش میں دھکیل دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت والے اس علاقے میں کانگرس نے وزارت بنائی۔ اور ڈاکٹر خان صاحب اس وزارت کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی۔ یہ جماعت دراصل انگریز کی پروردہ افراد پر مشتمل جماعت تھی جس کے زیادہ تر عزائم ایسے تھے جو کانگرس کے تھے۔ کیونکہ یہ جماعت خالصتاً مسلم جماعت نہ تھی۔ انگریز نے مسلم اکثریت والے اس صوبے میں حقیقی مسلمانوں کے زور کو توڑنے ان کے اتحاد میں تفرقہ ڈالنے اور ان کے احساس علیحدگی کو مفقود کرنے کی غرض سے یہ جماعت تشکیل دلائی تھی۔ اور ۱۹۴۷ء تک انگریز کے ہاتھوں یہ جماعت کٹھ پتلی بنی رہی۔ سر سکندر حیات نے چھ وزیروں پر مشتمل ایک کابینہ بنائی۔ جس میں تین وزراء مسلمان۔ دو ہندو اور ایک سکھ شامل تھا۔ چونکہ اس حکومت کو انگریز کی پوری پوری حمایت حاصل تھی اس لیے کانگرس کی افسوں کاری اس پر اثر انداز نہ ہو سکی اور یہاں تقسیم ہند تک یونینسٹ پارٹی حکومت کرتی رہی۔

صوبہ سندھ میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی اکثریت میں تھی تو ضرور لیکن اسے غالب اکثریت حاصل نہ رہی۔ اور یہ وزارت متعدد بار ٹوٹی اور کئی بار بنی۔ بنگال میں کرشک پرجا پارٹی کی قیادت اے۔ کے۔ فضل الحق کر رہے تھے۔ اور انہیں صوبے میں کافی شہرت حاصل تھی۔ صوبائی انتخابات میں اس پارٹی نے دوسری پارٹیوں مثلاً مسلم لیگ۔ پس ماندہ اقوام، آزاد اور غیر کانگرسی ہندو جماعتوں کے مقابلے میں اجتماعی طور پر زیادہ نشستیں حاصل کی تھیں۔ چنانچہ وہاں بھی ایک مخلوط وزارت بنی۔ مجموعی طور پر اس کابینہ کے دس وزراء میں سے پانچ وزیر مسلمان تھے۔ اور پانچ وزارتیں ہندوؤں کو ملیں۔ حالانکہ آبادی کے تناسب سے ان کی تعداد مسلمانوں سے کہیں کم تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ انگریز کی چکنی چپڑی باتیں تھیں جو سیاست کے میدان میں وہ دکھا رہا تھا۔ ہندو اندر ہی اندر اس وزارت میں اتحاد کا شیرازہ بکھیرنے میں مصروف رہے۔ اور ۱۹۴۱ء میں وہ بالآخر اپنی ناپاک

Marfat.com

کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے اور مسلم اکثریت کی وزارت ٹوٹ گئی۔ دو سال تک وزارت غیر مستحکم رہنے کے بعد جب ۱۹۴۳ء میں خواجہ ناظم الدین نے صوبائی مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو ایک مضبوط مسلم لیگی وزارت کا قیام ہوا۔ اسی طرح آسام میں سر محمد سعد اللہ خان نے چار وزراء پر مشتمل ایک وزارت بنائی جس میں ہندو عناصر مسلسل گڑبڑ پیدا کرنے میں لگے رہے۔ ایک سال کے عرصہ کے بعد سر محمد سعد اللہ خان کی وزارت ٹوٹ گئی اور کانگرس وزارت میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن کانگرس کی غلط کاریاں زیادہ دیر تک پاؤں نہ جما سکیں اور اگلے ہی سال کانگرس کی وزارت کا شیرازہ بکھر گیا۔

سہ رکنی کمیٹی کا قیام :- جب وزارتوں کا کام مکمل ہو گیا۔ تو کانگرس نے ان وزارتوں کی نگرانی کے لیے تین ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جس کو وزیر چننے، وزیر کو نکالنے اور وزیر کی کارکردگی پر نگاہ رکھنے کے اعلےٰ اختیارات دے دیئے گئے۔ یہ ارکان مندرجہ ذیل تھے۔ اور ان کے ذمہ جو صوبے لگائے گئے وہ ذیل میں ان کے سامنے درج کئے گئے ہیں۔

۱ ۔ مولانا ابوالکلام آزاد	صوبہ سرحد، پنجاب، یوپی، اور بنگال
۲ ۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد	اڑیسہ اور آسام
۳ ۔ ڈاکٹر ولبھ بھائی پٹیل	بمبئی، مدارس، سی پی، اور سندھ

اس انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام کو ہندوؤں نے نہایت اعتماد کے ساتھ ان علاقوں پر مامور کیا۔ جن میں مسلم اکثریت تھی اور ہندوؤں کو مولانا پر اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ ایک مسلمان کو مسلمانوں میں بھیج کر بھی اس بات کا خدشہ نہ رکھتا تھا کہ کسی وقت یہ مسلمان چشم بینا کھول کر مسلم لیگ کو نہ دیکھ لے اور فی الفور مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔ تاہم مولانا کانگرس کے ایک مخلص ترین رکن تھے۔ اور آخر دم تک رہے۔ اس مسلمان کانگرسی نے اپنی آنکھوں سے مسلم کشی دیکھی لیکن اس کی رگ حمیت پھر بھی نہ پھڑکی۔ یہ مسلمان اس ٹولے کا رکن بن گیا۔ جس نے مسلح ہو کر مسلمان عورتوں اور بچوں کا خون بہایا اور مسلم خواتین کی عصمتوں کو لوٹا۔ یہ عالم دین اس گروہ سے منسلک ہو گیا۔ جو ازلی طور پر کفر و شرک کا پیروکار تھا اور نہایت وفاداری سے ہندو استعمار کا ساتھ دیا۔ اس سہ رکنی کمیٹی کو اختیار تھا کہ وہ کسی بھی وزیر کو جواب دہی کے لیے اپنے پاس طلب کر سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے زیر نگرانی صوبوں کے وزراء عوام کے منتخب نمائندوں سے زیادہ ان با اختیار ارکان کے سامنے زیادہ انکساری سے جواب دہ تھے۔

Marfat.com

کانگرسی حکومت کی شرانگیز کارروائیاں:۔ کانگرس کا محض ڈھونگ تھا کہ وہ اپنے منشور میں اس امر کا دعویٰ کر رہی تھی۔ اس کے سامنے اولین مقصد ہندوستان کی انگریزی استعمار سے آزادی ہے اور ہندوستان میں ایک مشترکہ نوعیت کی حکومت قائم کرنا ہے جو بلا امتیاز مذہب و ملت وجود میں آئے گی۔ لیکن حقیقت اس اعلان سے بہت بعید تھی۔ کانگرس ایک ہندو جماعت تھی۔ اس کے بانی ہندو تھے، اس کی پرورش کرنے والے ہندو تھے۔ ان کے انداز کار ہندوانہ تھے۔ ان کا طرز عمل ہندوؤں کا تھا۔ ان کی زبان زیادہ تر ہندی تھی۔ ان کے کارکنوں کے لباس ہندوؤں جیسے تھے۔ اس کے ارادے ہندو ازم کی ترویج پر مبنی تھے۔

المختصر اس جماعت کے دل میں ہندو سماج و مذہب کی ترویج و تقویت تھی لیکن زبان پہ مجموعی آزادی و ترقی کی بات تھی۔ یہ جماعت دوسرے لفظوں میں اعلیٰ ترین منافقت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ کانگرس کے عزائم زیادہ دیر تک پوشیدہ نہ رہ سکے۔ جونہی اس کو موقع ملا، اس نے پوری قوت سے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے سعی کامل کی جن کی مثالیں کانگرس حکومت کے قیام کے دوران ہندوستان میں پیش آنے والے واقعات کی شکل میں عیاں طور پر ملتی ہیں کانگرس نے سیاسی، سماجی، مذہبی، ثقافتی غرضیکہ ہر سطح پر مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لیے مہمیں تیز تر کر دیں۔ ان مہموں میں سے چند ایک اہم مہمات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

ترنگا پرچم:۔ کانگرس نے فیصلہ کیا کہ تمام ملک میں سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں پر یونین جیک کے ساتھ کانگرس کا سہ رنگا پرچم جسے تین رنگا یا ترنگا کہا جاتا تھا۔ لہرا دیا جائے۔ اس ترنگے کے لہرانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ دنیا پر یہ بات ظاہر کی جائے کہ ملک میں صرف دو جماعتیں ہیں۔ ایک انگریز دوسرے ہندو، اور کانگرس ہی عوام کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ کانگرس کے اس طرز عمل کے خلاف پورے ملک میں اجتماعات ہوئے لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ ان اجتماعات کا جس حاکم نے جواب دینا تھا، وہ تو خود اس کا پروردگار تھا۔ ہنگاموں کے باوجود کانگرس نے اپنا ترنگا لٹکائے رکھا۔

ہندی کی ترویج:۔ کانگرسی وزارتوں کے قیام کے بعد مختلف صوبوں میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اس طرح ہندو کی وہ چال جس کے ذریعے یہ مسلم ثقافت کو نابود کرنا چاہتے تھے۔ عمل پیرا ہو گئی۔ مسلمان پہلے تو فارسی بولتے تھے پھر

Marfat.com

ہندی و سنسکرت کے اثر سے اور ہندوؤں ہی کی سہولت کے لیے ایک ہی زبان اختیار کر لی جس کو اردو کہا گیا۔ اور اُردو کو مسلمانوں نے اپنی ثقافتی زبان قرار دیا۔ ہندوؤں کو یہ بات بھی ناگوار گزری کہ وہ ایسی زبان کیوں اختیار کریں جس میں مسلم ثقافت کے عناصر شامل ہوں اور جس سے اسلام کی کسی بھی طرح جھلک نظر آتی ہو۔

ہندوؤں کے نزدیک مسلمانوں کی قومی زبان اب اُردو تھی اور اسی بنا پر انہوں نے اردو سے مکمل بیزاری کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ ہندوستان کے ہزاروں سال کا علمی، ادبی، تاریخی اور ثقافتی سرمایہ اسی زبان میں محفوظ ہے۔ مسلمان اس طرح بے اعتنائی کو بالکل برداشت نہ کر سکتے تھے چنانچہ اردو اور ہندی کے مسئلے پر ایک زبردست نظریاتی تصادم ہوا لیکن کانگرس ایک ہٹ دھرم جماعت تھی۔ اس نے مسلمانوں کے کسی بھی نوعیت کے احساسات کا پاس نہ کیا، اور ہندی ہی کو مختلف صوبوں کی سرکاری زبان قرار دیئے رکھا۔ مسلمانوں کو کانگرس کی اس زیادتی پر سخت رنج تھا۔ اس رنج نے مسلمانوں میں علیحدگی کے جذبات کو اور زیادہ شدت بخشی۔ جو تحریک پاکستان کا ایک جزو بن گئی اور بالآخر کامیاب ہوئی۔

گاؤکشی کی ممانعت:- ہندوؤں کے نزدیک گائے ایک مقدس جانور ہے یہاں تک کہ یہ لوگ اس کے پیشاب کو بھی متبرک خیال کرتے ہیں۔ اس کے گوبر کو اپنے باورچی خانوں میں صفائی کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اسے "ماتا" ماں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی تقدس کا افسانہ کسی قدیم ترین روایت پر مبنی ہے جس کی تصدیق صرف سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک یہ ایک عام دودھ دینے والا جانور ہے۔ اس میں اور بھینس میں مسلمانوں کے نزدیک سوائے رنگ و شکل کے کوئی اور فرق نہیں۔ حکم خداوندی کے تحت گائے ان جانوروں میں شامل ہے جس کی قربانی یا جس کو ذبح کرنا از روئے شریعت بالکل جائز ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ زبردست تضاد کا باعث بن گئی ہے۔

چونکہ ہندو حکومت قائم ہو گئی تھی اور اس نے اپنے منشور کے تحت کام کرنا شروع کر لیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے عقائد کو بالائے طاق رکھ کر اور مسلمان کانگرسیوں کے جذبات کی پرواہ کیے بغیر حکومت نے گاؤکشی (گائے ذبح کرنے) پر قانونی طور پر پابندی لگا دی اور گائے ذبح کرنے کو فوجداری جرم قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ اس قسم کا فیصلہ مسلمانوں کے جذبات و عقائد کے

Marfat.com

سراسر منافی تھا۔ اگرچہ مسلمانوں نے اس سلسلے میں بہت چیخ و پکار کی، جلسے جلوس نکالے، عرض داشتیں روانہ کیں۔ انگریز کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ لیکن وہ تو کانگرس کا نقارخانہ تھی۔ مسلم لیگ کی طوطی کی آواز بھلا کس کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ اس مسئلے کیوجہ سے کئی مرتبہ ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے، لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیوں؟ وہ تو ہندو کی حکومت تھی۔ کانگرسی مسلمانوں کی اس میں کیا حیثیت تھی۔ حیرت ہے کہ اس قسم کے کھلے چیلنج کو دیکھ کر بھی مسلمان زعماء کانگرس کے دامن کو تھامے ہندو کے پیچھے پیچھے سر نیچا کئے چلتے رہے اور مسلم بھائیوں کی آوازیں سن کر بھی بے حس ثابت ہوئے۔ لیکن ان کی بے حسی زیادہ دیر تک ہندو مت کی تقویت کو قائم نہ رکھ سکی۔

ودیا مندر کی سکیم:۔ کانگرس نے ایک تعلیمی پالیسی رائج کی جس میں زیادہ زور ودیا مندر سکیم پر دیا گیا، یعنی طلبا کو مندر کی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ آگاہ کیا جائے دوسرے لفظوں میں یہ ہندو ازم کی تبلیغ کو سرکاری سطح پر جائز کرنے اور انہیں لازمی طور پر سکولوں میں ٹھونسنے کا کام تھا۔ اس کے ذریعے صرف ایسے عقاید و روایات کی تعلیم دینا مقصود تھا جس سے صرف ہندو مت کے بزرگوں کے احوال اور کارناموں کی تفصیل طلباء تک پہنچتی تھی۔ اس سکیم کے تحت طلباء کو بلا امتیاز مذہب پوجا پاٹ کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ گاندھی کی تصویر کو سامنے رکھ کر۔ اسے دیوتا تصور کر کے۔ اس کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ باندھ کر نہایت عقیدت و احترام کی حالت میں ان کی عظمت کے گن گائے جانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ پرائمری سکول میں جو نصاب تجویز کیا گیا اس میں ہندو مذہب کی عظمت و تاریخ کے بارے میں اسباق درج کئے گئے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس سکیم میں بھی ہندو نے مسلمان کو اپنا آلہ کار بنایا چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین جو حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے (اور بعد ازاں بھارت کے صدر بن کر فوت ہوئے) نے اس سکیم کی ترتیب میں کارہائے نمایاں سر انجام دیئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود ہندو ازم سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ وہ خود اپنے ماتھے پر تلک لگاتے تھے۔

بندے ماترم:۔ بندے ماترم کانگرس کا ایک ترانہ تھا۔ جسے متعصب ہندو ادیب بنکم چندر چیٹر جی نے ایک ناول انند ماٹھ میں نقل کیا۔ اس نغمے میں دھرتی ماتا (زمین) کو اپنے باسیوں (باشندوں) کے نام پیام امن و ترقی کا درس دیتے ہوئے بتایا گیا ہے۔ اس

Marfat.com

ہیں سب سے زیادہ دل آزار عنصر یہ ہے کہ اس نغمے میں دھرتی ماتا کے امن و امان کو تباہ کرنے کا ذمہ دار مسلمان کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور ہندوؤں کو زوردار الفاظ میں تلقین کی گئی ہے کہ وہ جس طرح ممکن ہو سکے ان لیٹروں (مسلمانوں) کا جلد از جلد خاتمہ کر دیا جائے۔ کانگرس میں شامل مسلمان اس قدر بے حس تھے کہ خود اپنی زبان سے اپنی تذلیل گوارہ کئے جا رہے تھے۔ کانگرس حکومت نے حکم جاری کیا کہ اس نغمے کو کانگرس کے تمام اجلاس شروع ہونے کے وقت پڑھا جائے اس کو سکولوں میں قومی ترانے کی حیثیت دی جائے۔ اور سرکاری تقاریب میں اسے باقاعدہ سازوں کے ساتھ سنایا جائے۔ ایک عرصہ تک یہ مسلم آزار نغمہ تعلیمی اداروں، دفتروں اور اجلاس میں پڑھا جاتا رہا۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف بے حد احتجاجات کئے لیکن ان بے چاروں کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی رہی۔ مسلمانوں کی دل شکنی ہندوؤں کے لیے دل کشی کا باعث تھی۔

رابطہ مہم: کانگرس جب برسر اقتدار آگئی۔ تو اس نے سرکاری سطح پر مسلم لیگ کو یکسر ختم کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ اس پروگرام کے تحت ایک مہم کا آغاز کیا گیا جسے "رابطہ مہم" کا نام دیا گیا۔ اس مہم کا بظاہر مقصد مسلمانوں کی "تنگ نظری" اور "تعصب" دور کرنے کے لیے کانگرس کے عمائد کا مسلمانوں سے براہ راست رابطہ قائم کرنا تھا۔ تاکہ افہام و تفہیم کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس منصوبے کو تیار کیا۔ اس منصوبے سے اگرچہ ابتدائی طور پر کچھ مسلمان درغلائے گئے۔ لیکن جب ہندوستان کے مسلمانوں پر اس منصوبے کے تحت پوشیدہ مقاصد عیاں ہونے لگے تو اس مہم کو زبردست منہ کی کھانی پڑی۔

سازشیں: ہندوستان کی گذشتہ ڈیڑھ صدی کی تاریخ کا مطالعہ کر کے دیکھا جائے تو ہمیں جابجا ہندوؤں کی سازشوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہندو کا یہ شروع ہی سے دستور رہا ہے کہ جب کبھی اس نے مسلمانوں پر وار کیا ہے۔ پس پردہ ہو کر ہی کیا ہے۔ اس وار میں یا تو سازشوں کے ذریعے شریک ہوا ہے یا بالواسطہ حملہ آور ہوا ہے۔ مسلمان کو گرانے کا اس کے پاس سب سے کامیاب حربہ ہے۔ ہندو کبھی براہ راست مقابلے میں آ کر کامیاب نہیں ہوا۔ سازشیں کرنا مسلمانوں کو غداری پر آمادہ کرنا اس کی فطرت ہے اور فطرت کو وہ اپنا دھرم ایمان تصوّر کرتا ہے۔ ہندو نے مسلمانوں کے خلاف اس وقت سازشیں کیں۔ جب ایک غیر ملکی حاکم اس پر مسلّط ہو چکا تھا۔ اور جب اسے خود اقتدار حاصل ہو گیا اس وقت سازشوں کی کثرت اور شدت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملک میں کانگرسی حکومت قائم ہوتے ہی کانگرس کے ہندوستانیوں

Marfat.com

نے مسلم اکثریتی صوبوں کے خلاف سازشوں کا ایک جال بچھا دیا۔ بالخصوص پنجاب، بنگال اور سندھ میں اس قسم کی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ جس سے خود مسلمان باہمی آویزش کا شکار ہو جائیں۔ پنجاب اور بنگال کی نسبت سندھ زیادہ متاثر ہوا۔ سازشوں کو مختلف صورتوں میں بروئے کار لایا گیا۔ کبھی ہندو غنڈوں کے ذریعے ہندو مسلم فسادات برپا کر دا دیے کبھی سکھوں کو برہم کر دیا اور کبھی مسلم لیگ کی گذشتہ انتخابات کی ناکامیوں کو ہوا دینا شروع کر دی۔ کبھی مختلف مسلمانوں کے درمیان ایسے لغو اور بے ہودہ پروپیگنڈا کو ترویج کیا جس سے ایک دوسرے کے دل کھٹے ہونے شروع ہو گئے۔

غرضیکہ کانگرس سے جس طرح بھی بن پڑی مسلم لیگ کو بالخصوص اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو بالعموم ہندو مذہب کے ہاتھوں نیچا دکھانے کی بھرپور سازشیں کی گئیں۔

ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات:۔ کانگرس نے حکومت حاصل کرنے کے بعد جو رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کا واضح نتیجہ یہ تھا۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصادم ہوں اور تصادم رونما ہو کر رہے۔ ہندو نے کانگرس کے نام پر حکومت حاصل کی تھی اور دنیا کو یہ بتایا تھا کہ کانگرس ایک لادینی جماعت ہے اور اس میں کسی تعصب اور رنگ و نسل کے امتیاز کی گنجائش نہیں لیکن اس کے قول اور فعل میں زبردست تفاوت پایا گیا۔ اسکے دکھانے کے دانت اور تھے اور کھانے کے اور ہندو دکھاوے کے طور پر خود کو بہت خوبصورت اور بے ضرر بتاتا رہا لیکن جونہی اقتدار اس کے ہاتھ میں آیا اس نے ذاتی اور ہندوازم کے مفادات کی تکمیل کی خاطر اسلام کے پرستاروں کو کھانے کے دانتوں سے چبا جانے کی کوشش شروع کر دی جس کا واضح نتیجہ فسادات کی شکل میں رونما ہوتا رہا۔

ادھر مسلمان ہندوؤں کے منافقانہ کردار سے زبردست نالاں و بے زار تھے، ادھر ہندوؤں کے با اختیار حلقوں نے پالتو کتوں کی طرح غنڈے پال رکھے تھے۔ جنہیں جہاں چاہتے جب چاہتے بھیج دیتے اور وہ شرفا کی ٹانگوں کو پڑ جاتے۔ باخبر شرفا جب ان کتوں کے جبڑے توڑتے تو حکومت امن عامہ میں خلل ڈالنے کے بہانے الٹا مسلمانوں کو ہی موردِ الزام ٹھہراتی۔ تاہم قتل و غارت مسلح ڈکیتی اور لوٹ مار کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن گئی تھیں۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جب ملزمین کی فہرست بنتی تو مسلمان ہی مسلمان ہوتے۔ مظلومین میں ہندو ہی ہندو ہوتے اور ہندو غنڈوں کے ہاتھوں لٹ کر بھی مظلوم مسلمان ملزمان بن کر کڑی سزائیں پاتے۔

Marfat.com

زیادہ تر فسادات کے مراکز یو۔ پی۔ سی۔ پی۔ بہار اور بمبئی کے صوبے تھے جہاں کانگرس کو حتمی اکثریت حاصل تھی۔ یہ تمام باتیں بالآخر ہندو مسلم فساد کا باعث بن جاتیں۔ ترنگے پرچم کے لہرانے، بندے ماترم کے ترانے، ہندی کی ترویج کرانے، رابطہ مہم چلانے، گاؤکشی بند کرانے اور ودیا مندر جیسی سکیم چلانے سے مسلمانوں کے خون میں انتقامی جذبات جوش مارتے تھے، اور یہی جوش بالعموم زبردست فسادات پر منتج ہوتا۔ یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔

ردِ عمل:- ان تمام حالات سے مسلمانوں کو ایک مختصر سی مدت کے بعد اس امر کا احساس ہو گیا کہ ہندو واقعی تعصب کلی سے کام لے کر مسلم ثقافت۔ مذہب اور تاریخ کو مسخ کرنا چاہتا ہے۔ اور کانگرس کا منشور صرف کاغذات کی حدود تک مقید ہے۔ اس کا اصل مقصد ہندو ازم کا پرچار اور اکھنڈ بھارت کا قیام ہے۔ چند سالوں کے بعد مسلم لیگ کی رکنیت میں گراں قدر اضافہ ہونے لگا اور مسلم لیگ نے بھی زبردست سیاسی و انتخابی مہمات کا آغاز کیا۔ مسلم لیگ نے ہندو کے ان تمام عزائم کو دلیرانہ اور بے باکانہ انداز میں بے نقاب کرنا شروع کر دیا جن کو اس نے بھولے بھالے مسلمانوں سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح۔ خان لیاقت علی خان اور نواب بھوپال جیسے عظیم الفکر رہنماؤں نے کانگرس کی سازش کی قلعی کھول دی۔ دو سال میں مسلم لیگ کی رکنیت کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی گئی ہے۔

Marfat.com

کانگرسی حکومت کے دوران مسلم لیگ کی جدوجہد!!

سوال: ۱۹۳۷ء میں کانگرس کی حکومت کے قیام کے بعد ۱۹۳۹ء تک مسلم لیگ نے اپنی بقا اور استواریت کے لیے جو جدوجہد کی، اس پر تبصرہ کیجئے علاوہ ازیں ان دو سالوں کے درمیانی عرصہ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے تعلقات کا تنقیدی جائزہ بھی لیجئے۔

جواب: ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگرس کی جیت کے بعد کانگرس کا مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ رہا، وہ ان کے لیے ایک عبرت ناک تازیانے سے کسی صورت بھی کم نہ تھا مسلمانوں نے ہندوؤں کو ووٹ دے کر جس پشیمانی کا مظاہرہ کیا، وہ مسلم لیگ کی آئندہ دو سالوں میں وسعت اور مقبولیت سے واضح ہے۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ کانگرس کی لادنیت کا لبادہ اوڑھ کر ہم تمام مسلمانوں کو اپنے دام فریب میں لے آئیں گے اور مکر کے آہنی پنجوں میں جکڑ کر ان کی شہ رگ تک کا خون پئیں گے اور ان سے گذشتہ کئی صد سالہ عہد حکومت کا خمیازہ اٹھوائیں گے۔ لیکن قدرت کو ان کی مکاری زیادہ دیر تک پسند نہ آئی۔ مسلم لیگ نے بھی اپنی خامیوں کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا اور اس کے رہنماؤں نے ان کوتاہیوں کو دور کرنے کا ایک جامع پروگرام بنایا۔

کانگرس کے دوران حکومت میں مسلم لیگ کی توجہ اب دو محاذوں کی طرف تھی۔ ایک محاذ ان حالات کا جو کانگرس کی حکومت کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے اور جن کی بنا پر مسلمانوں پر دن بدن سختیاں بڑھتی جا رہی تھیں، اور ان کے عقائد کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ دوسری طرف ان اقدامات پر غور کرنا تھا جن کے تحت مسلم لیگ کو مزید مقبول، طاقت ور اور استوار بنانے کے ذرائع اختیار کئے

Marfat.com

جاتے تھے۔ اس دور میں مسلم لیگ کے پاس تین عظیم ترین شخصیتیں تھیں۔

اول :۔ قائداعظم محمد علی جناح رح

دوم :۔ علامہ محمد اقبال رح

اور سوم :۔ نواب راجہ صاحب محمود آباد۔

ان تینوں اکابرین نے سر توڑ کر مسلم لیگ کی مقبولیت کے لئے ذرائع تلاش کئے، اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل کرنے کا عملی پروگرام بنایا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کو حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کی جائیں۔

۱۔ جلسوں کا انعقاد

۲۔ جلوسوں کی رہنمائی۔

۳۔ مختلف شہروں میں مسلم زعماء سے ملاقاتیں۔

۴۔ کانگرس کی سیہ کاریوں کی واضح تشہیر۔

۵۔ مختلف جماعتوں کے لیڈروں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطے۔

چنانچہ سب سے پہلے ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو قائداعظم نے راجہ صاحب محمود آباد کے کہنے پر لکھنؤ میں ایک جلسے کے انعقاد کا بندوبست کیا۔ اس اجلاس کی کامیابی کے لیے ہزاروں مسلم لیگی اور دوسرے مسلمان جلسہ گاہ میں پہنچنے کے لیے پہلے سے لکھنؤ پہنچ گئے۔ جلسے کی اس قدر عظیم سطح پر تیاریوں کو دیکھ کر کانگرس کے حواریوں کے منہ میں جھاگ آنے لگی اور انہوں نے جلسے کو ناکام کرنے یا اس کو منعقد نہ ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ خبریں عام ہوئیں کہ جس وقت قائداعظم جلسہ گاہ کے پنڈال پر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ ان کے پنڈال کو آگ لگا دی جائے گی، اور انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ پوری جلسہ گاہ میں موجود اور حاضر لوگوں پر شدید پتھراؤ کیا جائے گا۔ لیکن قائداعظم نے ان خبروں کے سننے کے باوجود اپنے ارادے میں ذرہ بھر تبدیلی نہ کی اور بڑی جرأت مندی کے ساتھ وہ جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور للکار کر ان گیدڑوں کو پکارا جو کئی دنوں سے بھبھکیاں دے رہے تھے، جلسہ نہایت کامیاب رہا اور قائداعظم نے جم کر ایک زبردست جذبات انگیز تقریر کی۔ جس سے تمام مسلمانوں کے گوشہائے ہوش کھل گئے۔

اسی دن سے یو۔ پی۔ میں کئی افراد کانگرس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے اس

Marfat.com

کے بعد قائداعظم نے جلسوں میں خطاب کرنے کی مہم کو اور تیز کر دیا، اور ۳ر نومبر ۱۹۳۷ء کو بمبئی میں عظیم الشان جلسہ میں روح پرور تقریر کی۔ اس تقریر میں قائداعظم نے ان جھوٹے وعدوں کی نقاب کشائی کی جس کے تحت اس نے مسلمانوں سے ووٹ حاصل کر کے انتخاب جیتا تھا اور جو بعد ازاں ان کے مفادات کو مسل دینے کا موجب بنی۔

قائداعظم نے عوام پر واضح کیا کہ کانگرس کبھی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتی، اگر مسلمانوں کی افادیت کی فکر رکھنے والی کوئی جماعت ہے تو وہ صرف مسلم لیگ ہے اس لیے کہ مسلم لیگ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں۔ انہوں نے انگریزوں کو بھی متنبہ کیا کہ اس کی کانگرس پروری اس کے ہندوستان میں زیادہ دیر تک قدم جمائے رکھنے میں ممد نہیں ہوگی کیونکہ کانگرس ایک ایسی جماعت ہے جسے شروع ہی سے ہوس ملک گیری لاحق ہے اور وہ اپنی تسکین ہونے تک اس ہوس کی تکمیل کے لیئے شکار ڈھونڈتی رہے گی۔ اور انگریز کو کبھی یہ تصور نہیں کرنا چاہیئے کہ ہندو کی پرورش کر کے وہ مسلمانان ہند کے عزائم میں کوئی فرق نہ ڈال سکے گا۔

قائداعظم نے کہا کہ اگر کانگرس یہ چاہتی ہے کہ ملک کو جلد از جلد آزاد کرایا جائے اور انگریز کو یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ زیادہ دیر تک ہندو مسلم فسادات کا تماشا دیکھتا رہے تو اسے چاہیئے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت کی حیثیت سے تسلیم کرے اور اس کے ساتھ مشترک النظریات ہو کر انگریز کو نکال باہر پھینکنے میں ہمدرد معاون ہو لیکن کانگرس کے لیئے مسلم لیگ کی یہ باتیں زہر قاتل معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ان جلسوں کی زبردست کامیابیوں سے بہت پریشان ہو چکی تھی۔ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ کا پلیٹ فارم دن بدن وسیع اور مضبوط ہوتا جا رہا ہے اور ہندوستان کے بیشتر علاقوں کے مسلمان اس میں جوق در جوق شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ جس سے نہ صرف کانگرس کو ضعف پہنچ رہا ہے بلکہ کانگرس کے دشمن کو قوت ملتی جا رہی ہے۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا۔ اس اجلاس کے انعقاد سے پیشتر وہاں کے عوام کو خبر مل چکی تھی کہ لکھنؤ اور بمبئی کے جلسوں میں مسلم لیگ کو عالی شان کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں اور جن خیالات کا اظہار قائداعظم نے ان جلسوں میں کیا تھا۔ وہ مسلمان ہند کے دلوں میں گھر کرتے جا رہے تھے۔ اس بنا پر یہ جلسہ اور بھی زیادہ رونق کا باعث بنا اس کی بے مثال کامیابی سے کانگرسی لیڈران بوکھلا اٹھے کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اب مسلم لیگ فعال جماعت بن گئی ہے اور اب یہ کچھ نہ کچھ لے کر چھوڑے گی۔ اس کے ساتھ مزید دشمنی

Marfat.com

کانگرس کی مزید کمزوری کا باعث ہو گی۔ اس لیے جس قدر جلدی ہو سکے، قائداعظم کا منہ بند کیا جائے اور ان سے مذاکرات کیے جائیں۔

یہ جلسہ کانگرس کے لیے زیادہ تشویش کا باعث اس لیے بھی ہوا کہ مسلم لیگ کی طرف سے اس میں ایک آٹھ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جسے کانگرس کی طرف سے کیے گئے غیر آئینی اقدامات اور دیگر مظالم کی تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ اس کمیٹی کے سربراہ نواب راجہ سید محمد مہدی آف میر پور سٹیٹ تھے۔ اس کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ پیش کی تو اس کو شائع بھی کر دیا گیا۔ اس طرح کانگرس کی تمام بدکرداریاں منظر عام پر آگئیں جو انگریزوں کی نظروں میں بھی کانگرس کی ذلت کا باعث بنیں۔ یہ رپورٹ کانگرس کے بھانڈے کو چوراہے میں پھوڑنے کا باعث ہوئی لیکن ڈھیٹ قوم اس قدر کھسیانی ہو گئی کہ ان حقائق کی توجیہ پیش کرنے کی بجائے ایسا راستہ اختیار کرنے لگی، جس سے مسلمانوں کے جذبۂ شوق میں کمی واقع ہو جائے یعنی انداز گفتگو میں اور لیڈروں کے لہجے میں نرمی آ گئی لیکن دل اور کردار میں کوئی فرق نہ آیا۔

۱۹۳۸ء میں قائداعظم نے سندھ کا بھی دورہ کیا اور وہاں جگہ جگہ لوگوں کے اجتماعات کو مخاطب کر کے مسلم لیگ کی عظمت اور کانگرس کی خطرت سے آگاہ کیا اور پورے سندھ کو اس بات پر متفق کر لیا کہ ہندو اور مسلمان دو ایسی قومیں ہیں جو ہر لحاظ سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ اب زیادہ دیر تک اکٹھی ہرگز ہرگز نہیں رہ سکتیں، سندھ کے مختلف مقامات کے اجلاس میں قائداعظم نے نہایت واضح انداز میں بتایا۔ ہندوؤں کا نظریہ حیات اور ہے اور مسلمان قوم کا نظریۂ زندگی کچھ اور، دونوں کے نظریات میں بعد المشرقین ہے اور یہ آپس میں کبھی نہ ملنے والی اقدار و روایات کی مالک قومیں ہیں۔ اس لحاظ سے قائداعظم نے پہلی دفعہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے دو قومی نظریے کا اعلان کیا۔ دو قومی نظریے کے اعلان نے کانگرس کے رہے سہے سکوں میں ہل چل مچا دی۔

جلسوں اور جلوسوں کے انعقاد کی سکیم اس قدر مفید ثابت ہوئی کہ مسلم لیگ کو تازہ روح اور نئی حیات مل گئی، اس میں ایک ایسی قوت پیدا ہو گئی جس سے کانگرس جیسی جماعت کو سوچنا پڑا کہ اب مسلم لیگ کے سیلاب کو روکنے کی کاروائیاں پہلے سے مختلف انداز میں کرنی چاہئیں، دوسرے لفظوں میں کانگرس جب مسلم لیگ کو نقصان پہنچانے میں بالکل ناکام رہی تو وہ قائداعظم سے بات چیت کرنے اور خط و کتابت کرنے پر مجبور ہو گئی۔

Marfat.com

خط وکتابت:- مہاتما گاندھی نے قائد اعظم کو ایک طویل خط لکھا جس میں بہت سے گلے شکوے کیے گئے۔ قائد اعظم نے اس خط کا جواب نہایت سنجیدگی سے دیا۔ مہاتما گاندھی نے یہ خط ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنو جلسے کی کارروائی سن کر سیگاؤں سے لکھا جس میں انہوں نے کہا تھا۔

"جس طرح میں نے اسے پڑھا ہے آپ کی پوری تقریر اعلان جنگ ہے"

قائد اعظم نے اس خط کا جواب ۵ نومبر ۱۹۳۷ء کو دیا، اور لکھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ میری لکھنوئی تقریر کو اعلان جنگ سمجھتے ہیں، وہ بالکل حفاظت خود اختیاری میں ہے۔ مہربانی کر کے اسے دوبارہ پڑھیے۔ اور سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ سال میں جو واقعات پیش آئے ہیں۔ ان پر آپ کی نظر نہیں رہی"۔

اسی دوران پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی قائد اعظم سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے مراسلات کا مقصد یہی تھا کہ ہم آپس میں مل بیٹھیں اور کوئی مفاہمت کر لیں۔ قائد اعظم نے انہیں بھی یہی شرط پیش کی کہ کانگرس پہلے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرے۔

نہرو کا تکبر:- پنڈت نہرو ایک خالص تخریبی برہمن تھا اور اس میں تمام وہ صفات پائی جاتی تھیں جو ایک اصل برہمن میں ہونی چاہییں یعنی۔ زبان کا بے حد شیریں۔ دل کا مکمل خود غرض مطلب براری کے لیے ذاتی ذلت کو عین خدمت تصور کرے، اور وقت نکل جانے پر پورا پورا طوطا چشم۔ کمزور کے سامنے بے حد خوفناک بلا کی حیثیت رکھے اور اپنے سے طاقتور کے سامنے بالکل بھیڑ جس سے کوئی مطلب نکلتا نظر آتا ہو اس کی مبالغہ خوشامد اور جس سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہ دکھائی دے۔ اس سے سخت نفرت۔ قوت کے ہاتھ میں آجانے کے بعد خود کو تمام دہوش طاقت کر لینا کہ ماحول سے اٹکھیلیاں لینے لگنا۔ ان تمام صفات کا مصداق پنڈت نہرو عملی طور پر قائد اعظم کے سامنے آگیا، اور شرمندگی و خجالت کا طوق گلے میں ڈال کر واپس لوٹا۔

اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ جب کانگرس کی وزارتیں قائم ہوئیں۔ اور مسلم لیگ اسمبلی میں حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھی تو انہیں حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھے دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو نے مدراس میں تقریر کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں صرف دو سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک کانگرس دوسری گورنمنٹ آف گریٹ برٹن۔ اس پر قائد اعظم نے فی الفور جواب دیا کہ یہ سراسر

Marfat.com

غلط ہے۔ ہندوستان میں تین سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک مسلم لیگ۔ ایک کانگرس اور ایک حکومت برطانیہ۔

انہی دنوں یوپی میں پانچ ضمنی انتخاب ہونے والے تھے۔ قائداعظم نے اعلان کردیا کہ اگر کانگرس کو اپنی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا اتنا ہی زعم ہے تو میں چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ان پانچوں ضمنی نشستوں کے ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدواروں کے سامنے اپنے کانگرسی امیدوار کھڑے کر کے دیکھ لے اور انتخابات جیت کر دکھائے۔ پنڈت جی نے یہ چیلنج قبول کرتے ہوئے پانچوں نشستوں کے لیے کانگرسی امیدوار کھڑے کیے۔ قدرت خدا کی دیکھئے کہ ان پانچوں نشستوں پر کانگرس کے امیدواروں کو بری طرح شکست ہوئی اور پانچوں مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوگئے۔ انتخابات کے اس نتیجے پر پنڈت جی کھسیانے ہو کر خط وکتابت کی راہ پر چل نکلے۔ ادھر تو پنڈت جی نے قائداعظم کے ساتھ مراسلہ نگاری کا سلسلہ شروع کردیا۔ ادھر رابطہ مہم کا آغاز کرادیا۔ (جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

پنڈت نہرو کے بعد کانگرس کی صدارت سوبھاش چندر بوس نے سنبھالی۔ مسٹر سوبھاش چندر بوس مسلم لیگ کی بیداری اور اس کی مقبولیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ سبھاش چندر بوس نے انہی خطوط پر خط وکتابت کی جن پر ان کے پیش رو کر رہے تھے۔

اصل مقصد پر لانے کے لیے قائداعظم نے سبھاش چندر بوس کو ایک خط میں تحریر کیا کہ

"کانگرس نے مسلم لیگ کی حیثیت کو دراصل ۱۹۱۶ء میں تسلیم کرلیا تھا۔ حیرت ہے — کہ وہ کون سے اسباب ہیں، جن کی بنا پر کانگرس اپنے فیصلے سے پھر گئی ہے۔

سبھاش چندر بوس نے اس کے جواب میں لکھا کہ!

"آپ کے خط کے سیاق وسباق سے نہ مفہوم واضح ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اس بات کی متوقع نہیں ہے کہ کانگرس اسے ایک مقتدر مسلم تنظیم تسلیم کرے گی، اس لیے میں آپ کو یہ خوش خبری دیتا ہوں کہ کانگرس کی مجلسِ عاملہ مسلم لیگ کی مقرر کردہ کمیٹی سے گفتگو کرنے کے لیے تیار ہے"

علامہ اقبال کی وفات: ابھی مسلم لیگ کی تنظیم نو کا سلسلہ پورے جوش وخروش سے جاری تھا۔ پنجاب میں علامہ اقبال اپنی پوری قوتِ دانش

Marfat.com

سے قوتِ افرنگ کے جن کو گرانے میں مصروف تھے اور پوری قوم میں نئی روح پھونکنے میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ بستر علالت پر بھی انہوں نے قائد اعظم سے رابطہ قائم رکھا۔ اور مسلم لیگ کی مضبوطی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کی کوششوں کو تیز کرنے کے لیے پوری جانفشانی سے مصروف رہے۔ اس کثرت کار کی بنا پر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ کا لاہور کے مقام پر انتقال ہو گیا۔ علامہ اقبال کی رحلت پوری "ملت بیضا" کے لیے ناقابل تلافی نقصان تھا۔ قائد اعظم کو جب ان کی وفات کی خبر ملی تو ان پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا کہ ایک اعلیٰ ترین دانشور اور ایک قابل قدر قومی رہنما جس نے اپنی نظموں اور خیالات سے پوری قوم میں نئی روح پھونکی تھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

مولانا شوکت علی کی وفات:- مولانا شوکت علی تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد مسلم لیگ کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔ اور مسلم لیگ کے ایک فعال اہم اور مخلص کارکن بن گئے تھے ۱۹۳۸ء کے ماہ نومبر میں آپ نے اس جہان فانی سے رحلت فرما کر پوری ملت اسلامیہ میں ایک زبردست خلا پیدا کر دیا۔ ان دونوں اکابرین ملت کی وفات نے مسلم لیگ کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ تاہم مسلم لیگ کی کشتی کا ایک اور اہم ترین کھیون ہار زندہ تھا۔ اس نے نہ صرف پوری مسلم لیگ کو ارفع ترین مقام پر لا کر کھڑا کر دیا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کی عظمت کا اعتراف کانگرس جیسی متعدد الاشکال جماعت سے کرا دیا۔

مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک جس قدر محنت سے کام کیا اور اس کے رہنماؤں نے جس حوصلہ مندی سے قدم بڑھائے اس کی مثال اقوام کی زندگیوں میں بہت کم ملتی ہے۔ دو سال کے عرصہ میں اس جماعت نے متکبر و حاکم جماعت سے اپنی عظمت کا لوہا منوا لیا۔ اس اعترافِ عظمت کا سہرا دراصل قائد اعظم محمد علی جناح کے سر پر تھا۔ جنہوں نے ہر ایک کانگرسی لیڈر کو اس کی بساط کے مطابق جواب دیا۔ دلائل سے انہیں قائل کیا۔ اور مسلمانوں کو حقیقت کی قبولیت کی طرف مائل کیا۔ اس طرح ان دو سالوں کا عرصہ مسلم لیگ کی زندگی میں ایک نئی روح پیدا کرنے کا دور تھا۔ جو قوت ان دو سالوں میں اسے حاصل ہوئی اس کی مدد سے بالآخر یہ ایک نیا ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

Marfat.com

جنگِ عظیم دوم
اور
ہندوستان کی سیاست

سوال:۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم دوم کے شروع ہوتے ہی ہندوستان کی سیاست نے ایک اہم کروٹ لی اور انگریز کو مسلم لیگ کے وجود کو کانگرس کے ہم پلہ تسلیم کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں انگریز نے جنگ کے دوران کانگرس اور مسلم لیگ کا بغور جائزہ لیا جس کے نتیجے پر بالآخر وہ مسلمانوں کی عظمت کا معترف ہوا۔"

جواب:۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے ۳ ستمبر کو اس جنگ میں ہٹلر کے خلاف فریق بننے کا اعلان کر کے خود کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ اسی روز فرانس نے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ آہستہ آہستہ اسی طرح یہ جنگ دوسری عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کر گئی یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں کانگرس راج قائم ہوئے ابھی دو سال ہی کا عرصہ گزرا تھا، اور کانگرس راج قائم ہوئے ابھی دو سال ہی کا عرصہ گزرا تھا، اور کانگرس اپنے منشور کی تکمیل میں کو رانہ انداز میں مصروف تھی۔ کانگرس کو عالمی حالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اسے تو ہر وقت یہ خیال تھا کہ کسی طرح جلد از جلد مسلمانوں پر غیر کانگرسیوں کا استحصال کر کے انہیں زیر کیا جائے، اور اکھنڈ بھارت کے خواب کی تعبیر لی جائے۔

برطانیہ کی جنگ میں شمولیت کے اعلان کے ساتھ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے ہندوستان کے عوام کی جانب سے ہٹلر کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں ۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو حکومت ہند کے لاء ممبر سر محمد ظفر اللہ خان نے مرکزی اسمبلی میں اعلان کیا کہ ہم ہندوستانی ہر وہ فرض ادا کرنے کے لیے تیار ہیں جو شہنشاہ برطانیہ کی طرف سے ہم پر عائد ہوتے

Marfat.com

ہیں۔ ۵ ستمبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا مسودہ قانون مرکزی اسمبلی میں پیش کر دیا، جس پر چار دن تک بحث ہوئی۔ اس کے بعد اس بل کو ایک سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ اسے آخری شکل دے سکے۔ تقریباً ۱۵ دن کے غور و خوص کے بعد ۲۷ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ مسودہ اسمبلی کی منظوری حاصل کر کے قانون ملک کی صورت اختیار کر گیا۔

وائسرائے ہند کے یکطرفہ ہندوستان کو آگ میں جھونک دینے کی بنا پر پورے ہند میں غم و غصے اور خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ حکومت کو اس حقیقت کا واضح طور پر احساس تھا۔ اور اس نے فوراً اعلیٰ سطح پر عوام کے اعلیٰ ترین لیڈروں سے ملاقاتیں کرنے کو ضروری سمجھا تاکہ ان کے عمائد پر اس ضرورت کی شدت کو واضح کیا جائے جس کی بنا پر حکومت برطانیہ نے ہندوستان کو بھی شامل جنگ کر لیا تھا۔ لارڈ لنلتھگو نے ہندوستانی عوام سے اپیل بھی کی کہ وہ جنگ میں انگریزوں کی مدد کریں اور ساتھ ہی اعلان کیا کہ میں ہندوستانی عوام کے رہنماؤں سے بالمشافہ گفتگو کرنے کو بصمیم قلب تیار ہوں۔ چنانچہ اس نے بیک وقت مسٹر گاندھی اور قائداعظم محمد علی جناح کو گفتگو کے لیے بلایا۔ ان دونوں رہنماؤں کو بیک وقت بلایا جانا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے باعث تحیر تھا۔ ہندو اس لیے حیران تھے کہ انگریز نے کانگرس جیسی حکمران جماعت کے لیڈر کو اقلیتی جماعت مسلم لیگ کے رہنما کے ہمراہ کیوں بلایا گیا ہے۔ اور مسلمان اس لیے متحیر تھے کہ انگریز کے رویے میں یہ یکایک تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی ہے۔ اور مسلم لیگ کو انگریز نے کس طرح کانگرس کے ہم پلہ خیال کر لیا۔ تاہم دونوں لیڈروں سے کھل کر مذاکرات ہوئے اس کے بعد حکومت، مسٹر گاندھی اور قائداعظم کے درمیان بہت مرتبہ گفت و شنید اور خط و کتابت ہوئی۔ حکومت ان عوامی رہنماؤں سے واضح انداز میں حمایت طلب کرنا چاہتی تھی اور دونوں جماعتوں کے رہنما اس سلسلے میں تنقیحات کی تشریح مانگ رہے تھے۔ دونوں کے انداز گفتگو میں زمین آسمان کا فرق تھا مسٹر گاندھی کی زبان میں اور لہجے میں جو نرمی کبھی دکھائی دیکھی تھی۔ تو محض اس لیے کہ وہ خود کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پاتے تھے۔ لیکن جہاں کہیں انہیں گریز کی ذرا سی گنجائش ملتی تھی۔ وہ مذاکرات کو کامیاب بنانے سے فرار اختیار کر لیتے تھے۔ اس طرح ان کا انداز بالکل منافقانہ اور منفیانہ تھا۔ اس کے برعکس قائداعظم کی توضیحات بالکل روشن اور مدلل تھیں۔ وہ جہاں کہیں بات کرتے پورے وثوق سے قائم ہو کر کرتے انہیں بات کو گول کرنے سے سخت نفرت تھی۔ وہ خود راست کردار لیڈر تھے۔ اور دوسرے لیڈروں سے یہ توقع رکھتے تھے لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہندو لیڈر

Marfat.com

کو فطرت کی طرف سے راست گوئی کا ملکہ ملا ہی نہیں۔ دراصل مسٹر گاندھی نے جب حکومت کو مبتلائے وبال دیکھا تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت شمار کر کے حکومت کے لیے اور زیادہ مسائل پیدا کرنے کی کوشش کی کبھی بات چیت کو بغیر نتیجے کر دینے کی صورت میں کبھی خود کو کانگرس کا چونی کارکن بھی نہ قرار دیتے ہوئے۔ اور کبھی ہندو قوم کی جنگ سے نفرت کا بہانہ کرتے ہوئے۔ اس دوران کانگرس نے جب یہ دیکھا کہ انگریز اس وقت مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اور وہ وہ ہندوستانیوں کی مدد کا طلب ہے تو اس نے مدد کرنے کی شرائط پیش کرنی شروع کر دیں۔ اور انہیں منوانے کے بعد ہندوستانیوں کو جنگ میں شامل کیا جانا مناسب قرار دیا۔ مسٹر گاندھی نے جن بہانوں کو اپنا آلہ کار بنایا۔ ان میں سے چند ایک ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

۱ - ۲۶ ستمبر ۳۹ء کو جب وہ وائسرائے سے تین گھنٹے ملاقات کرنے کے بعد واپس نکلے تو ان کی زبان پر یہ مطالبہ تھا کہ حکومت اپنی پالیسی کا اعلان کرے اور بتائے کہ جنگ کے بعد فی الفور کانگرس کو ہندوستان کا دستور بنانے کے لیے آزاد چھوڑا جائے گا۔

۲ - حکومت نے ہندوستانیوں کو جنگ میں ان کے رہنماؤں سے مشورہ کئے بغیر کیوں جھونک دیا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کو پہلے عوام سے رابطہ قائم کرنا چاہیئے تھا۔

۳ - حکومت ہندوستان بھر میں ایک ہی جماعت یعنی کانگرس کو واحد نمائندہ جماعت قرار دے کر اسے حکومت کی اجازت دے۔

۴ - یہ اعلان کیا جائے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان ایک آزاد ملک ہوگا۔ اور اس میں ملک کی واحد سیاسی جماعت کانگرس حکمران جماعت ہوگی۔

یہ تمام باتیں ایسی تھیں جن سے حکومت کو ایسے آڑے وقت میں ستانے والی حرکات تھیں جب کہ اسے خود یکسوئی اور جامعیت کی ضرورت تھی۔ انگریز وائسرائے نے ان اعتراضات کا جواب دیا تو ضرور لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے کانگرس کا بھیانک کردار ہر وقت گھومنے لگا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ وفاقی ہند کا دستور ۳۵ء عالمی جنگ کے خاتمے تک ملتوی کر دیا جاتا چنانچہ اسی تقاضے کے تحت ملک میں ڈیفنس آف انڈیا کا نفاذ کر دیا گیا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو گیا ہے کہ حکومت اور جماعتوں کے درمیان گفت و شنید کے دوران مسلم لیگ کا کردار بالکل مثبت رہا۔ اور قائداعظم محمد علی جناح نے حالات کے تقاضوں کے مد نظر انگریز کی مدد کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ لیکن اس کے لیے انہوں نے قومی وقار اور مذہبی

Marfat.com

برتری کے مسائل کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ چنانچہ مسلم لیگ کی طرف سے حکومت کو جو تجاویز پیش کی گئیں۔ وہ حسب ذیل تھیں۔ ان تجاویز کو کانگرس کے رہنماؤں کے مذکورہ بالا اعتراضات کے سامنے رکھ کر اگر پرکھا جائے تو یہ اس قدر اعلیٰ اور برتر دکھائی دیتی ہیں جن کی مثال صرف شرافت سے سامنا ماحول ہی میں مل سکتی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی تجاویز:۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت اور جنگ عظیم کے خطرات کے مدنظر حکومت کا یہ اقدام بالکل بجا ہے۔

کہ وہ دستور ہند کے وفاقی حصے کو جنگ کے خاتمے تک ملتوی کر دے لیکن جنگ ختم ہو جانے کے بعد حکومت کو ایک بار پھر پورے ملک کی سیاست کا جائزہ لے کر سارے دستور پر نظر ثانی کرنی چاہیئے کیونکہ ہندوستان کی سیاست گزشتہ دو سالوں میں بہت زیادہ تغیرات سے دوچار ہو چکی ہے۔

۱۔ یہ تجویز دراصل کانگرس کی مکارانہ چالوں کی بنا پر اور مسلمانوں کے خلاف ہندو کے ایمان سوز اور عقیدہ کش اقدام کے پیش نظر رکھی گئی کیونکہ کانگرس کی دو سالہ حکومت میں ایسی بدترین مثالیں تجربے میں پائی گئیں جن سے مسلمان کانگرس سے متنفر ہو کر اسے ترک کر کے مسلم لیگ میں جوق در جوق شامل ہو گئے تھے اور ہو رہے تھے۔ قائد اعظم کو یقین تھا کہ جنگ کے خاتمے تک کانگرس میں شمولیت شاذونادر ہی دکھائی دے گی، اور کانگرس میں صرف وہ مسلمان رہ جائیں گے جن کو ہندو کی زبردست مالی و سماجی سرپرستی حاصل ہو گی یا جو ہندو کے ورغلانے کے چنگل سے آزادی حاصل نہ کر سکے ہوں گے۔

۲۔ آئندہ دستور کے نفاذ سے پیشتر آل انڈیا مسلم لیگ کو مشورے کے لیے مذاکرات میں ضرور شامل کیا جائے اور اس دستور میں اگر کوئی ایسی شق ہو جو مسلم لیگ کے لیے قابل قبول نہ ہو تو اسے نافذ نہ کیا جائے۔

۳۔ اس تجویز کا مقصد یہ تھا کہ انگریز کہیں براہ راست کانگرس کے مشوروں کے تحت ایسے قانون بنانے پر مجبور نہ ہو جائے۔ جو مسلمانوں کے لیے بالآخر نقصان دہ ثابت ہوں کیونکہ گاندھی انگریز کے سامنے کانگرس کی ہمہ گیری کی یہ دلیل پیش کرتا تھا کہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جس میں تمام مذاہب کے نمائندے شامل ہیں، اور کانگرس کے جتنے بھی فیصلے ہوتے ہیں وہ ان تمام مذاہب کے نمائندوں کی مشاورت سے ہی ہوتے ہیں، اس لیے فرقہ وارانہ باتوں

Marfat.com

بیں آئین میں مخل ہونے کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔

۲۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس میں کوئی ایسا نمائندہ نہ تھا جس کو اسلام کی اقدار کے تحفظ کا خیال ہوتا یا اس میں اسلامی نکتہ نظر کے تحت مسلمانوں کی انفرادیت کا احساس ہوتا اس میں جتنے بھی لوگ تھے انہیں صرف سیاسی آزادی مطلوب تھی، انہیں حکومت چاہیئے تھی۔ انہیں عصائے سلطنت کی ضرورت تھی۔ انہیں قانون سازی کے اختیارات درکار تھے انہیں سیاسی برتری کی ضرورت تھی، انہیں اسلام سے قطعی محبت نہ تھی۔ وہ خود کو مسلمان ہونے کی بجائے ایک ہندوستانی کہلانا زیادہ مناسب خیال کرتے تھے لیکن مسلم لیگ میں شامل مسلمانوں کے مدنظر ملک میں ایک ایسے قانون کے نفاذ کی احتیاج تھی جس کی بنیاد اسلامی اصولوں کے منافی ہرگز ہرگز نہ ہو، اور جو اسلام میں کسی قسم کا رخنہ نہ ڈالے۔

۳۔ مرکز میں بننے والی مجوزہ وزارت میں مسلم لیگ کی نمائندگی پچاس فی صد ہوگی۔ اس تجویز کا اصل مقصد کانگرس کی اس پالیسی کو رد کرنا تھا۔ جس کے تحت وہ کسی بھی وقت کسی قانون کو چاہے وہ مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، پاس کرنے کے لیے اپنی اکثریت کو استعمال کر سکتی تھی۔

۴۔ برطانوی حکومت یقین دلائے کہ ہندوستان کی مسلم فوجیں کسی مسلمان ملک کے خلاف استعمال نہیں ہوں گی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ فلسطین کا مسئلہ عربوں کی مرضی کے مطابق حل کیا جائے گا۔

چونکہ یہ ایک عالمگیر جنگ تھی اس لئے اس دنیا کے مختلف ملکوں کو کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دینا ہی تھا۔ بہت ممکن تھا کہ دو مسلم ممالک آپس میں متحارب ہو جائیں۔ اس صورت حال میں کم از کم ہندوستان کے مسلمان اپنے بھائیوں کے سامنے بندوق نہ اٹھائیں۔ اور اپنی گولیوں کو ان کے ضیاع کے لیے استعمال کریں۔ مسلم لیگ میں یہ احساس ایک عالمی مسلم اخوت کا جذبہ تھا۔

۵۔ مسلمان اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اور مسلمانوں کی شکایات کا فی الفور تدارک کیا جائے گا۔ گورنروں کو خاص ہدایت جاری کی جائے گی کہ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے وہ اپنے خصوصی اختیارات بروئے کار لائیں۔

اس تجویز کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ہندو اکثریت والے صوبے کوئی ایسا قانون پاس

Marfat.com

نہ کریں یا ایسا اقدام نہ کریں۔ جس سے مسلم اقدار کو نقصان پہنچتا ہو یا جس سے اس صوبے کے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ غلام ہیں، اور ان کی شنوائی کوئی نہیں۔ گورنروں کو ایسی صورت حال میں بالکل غیر جانب دارانہ رویہ رکھنا چاہیئے۔

ان تجویزوں کے بعد کانگرس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مندرجہ ذیل تجاویز حکومت کے سامنے رکھیں۔

۱۔ عوام کو جنگ کا مقصد بتایا جائے اور ان سے حمایت کی منظوری لی جائے۔

یہ ایک ایسی تجویز تھی جس سے ایک موٹی عقل کا شہری بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ کانگرس کا ایسا پوچھنا کس قدر بے جا تھا۔ جنگ ہونے کے اسباب سب پر عیاں تھے۔ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے، اس میں وائسرائے یا حکومت برطانیہ اس کے عوام کے منظوری حاصل کرنے کی پابند نہیں تھی کیونکہ ہندوستان برطانیہ ہی کی ایک ڈومینیں تھی اور اپنی ڈومینیں (DOMINION) کے لوگوں سے کوئی حکومت اس کی رائے طلب کرنے کی پابند نہیں۔ بالخصوص اس وقت جب وہ حاکم خود دشمن کے نرغے میں ہو۔

۲۔ ہندوستان کے لیے آزادی کے پکے وعدے کا اعلان کیا جائے اور جنگ کے ختم ہوتے ہی موجودہ دستور ساز اسمبلی کو آزادی کا آئین بنانے کا حق دیا جائے۔

اس تجویز سے ہندو کی وہ پالیسی بالکل عیاں ہوتی ہے۔ جس کے تحت "پھنسے ہوئے سے سب شرطیں منوانا" مقصود ہوتا ہے۔ انگریز چونکہ جنگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ اس کے لیے ہندوستان کے عوام کی حمایت ازبس ضروری تھی اور ہندوستانی افواج کا استعمال ناگزیر تھا۔ اور ان کے بغیر اس کی بن پڑنا محال تھی۔ اس لیے یہ موقع اس کے لیے بے حد نازک نوعیت کا تھا۔

ہندو نے اس قدر مجبوری کی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز کو یہ اعلان کرنے پر مجبور کیا کہ وہ کہے کہ جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد دستور ساز اسمبلی کو آزادی کا آئین بنانے کا حق دے دیا جائے گا۔

لیکن حقیقت میں جنگ کے بعد کے حالات نے ایک اور پلٹا کھایا جس کے تحت پاکستان تشکیل پذیر ہو گیا۔

۳۔ حکومت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو فوری طور پر قومی حکومت کی عملی شکل دے دے

چاہے کسی بھی طریقے سے منتخب ہو، اس میں ہندووں کی اکثریت ہو گی۔ اس طرح کانگرس کو آئین سازی کا مکمل حق حاصل ہو جائیگا۔

یہ تجاویز کچھ اس نوعیت کی تھی جن کو بیک وقت بروئے کار لایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انگریز کی منشا یہ بھی تھی کہ فریقین میں سے کوئی بھی ناراض نہ ہو۔ ہندووں کی اپنی جگہ پر تسلی ہو جائے اور مسلم لیگ کو اپنے مقام پر تشفی حاصل ہو۔ کانگرس کے مطالبات کو مان کر انگریز فی الفور ہندوستان کی حکومت کی باگ دوڑ ہندووں کے حوالے کرنے سے قاصر تھا اور اس طرح اس کو جنگی ضروریات کے لیے ہندوستانی وسائل کے محدود ہو جانے کا اندیشہ بھی تھا۔ اس لیے حکومت برطانیہ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد وائسرائے نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں جنگ کے خاتمے تک ایسا نظام رائج رہے گا جس سے کسی سیاسی جماعت کی افادیت کو حکومت کی طرف سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے وفاقی حصّے کو معطل کر دیا گیا اور ساتھ ہی یہ یقین دلایا گیا کہ آئندہ دستور کی ترتیب کے سلسلے میں ملک کی تمام "سیاسی جماعتوں" کی آراء کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ تمام سیاسی جماعتوں سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز کے نزدیک کون کون سی جماعتیں تھیں، ایک کانگرس اور دوسری مسلم لیگ، اس طرح دوسرے لفظوں میں حکومت نے مسلم لیگ کی طرف سے پیش کی جانے والی تجاویز کو قبول کر لیا۔

جہاں تک ہندوستان کی طرف سے مسلم افواج کے مسلمان ملکوں کے خلاف لڑنے کا تعلق ہے وائسرائے نے اعلان کیا کہ فی الحال برطانیہ کسی مسلم ملک سے جنگ آزما نہیں ہے اور اگر کسی صورت میں کوئی مسلمان ان سے لڑنے کے لیے نہیں بھیجا جائے گا۔ برطانیہ نے مسلمانان ہند کو یقین دلایا کہ فلسطین کے معاملے میں عربوں کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ وائسرائے کے یہ اعلانات مسلم لیگ کے لئے پوری تشفی کا موجب تھے، لیکن کانگرس کے اضطراب میں قطعی کوئی فرق نہ آیا اور نہ ہی انگریز نے کانگرس کی تجاویز کو چنداں مناسب گردانا۔

یہ صورت حال دیکھ کر کانگرس نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ انگریز ہندوستان کی آزادی کو دیدہ دانستہ ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے ان کے پاس اس پروپیگنڈے کی ایک دلیل یہ تھی کہ اگر انگریز ہندوستان کو آزاد کرنا چاہتا ہی ہے۔ تو جنگ کے خاتمے کے بعد اس کی آزادی کا وعدہ کیوں نہیں کر لیتا۔ اس پر بھی جب کانگرس کو انگریز کی حمایت حاصل نہ ہوئی

Marfat.com

تھی تو انہوں نے اس خاموشی کو اپنی بے عزتی تصور کیا۔

کانگرسی وزارتوں سے استعفیٰ:- ہندوؤں کا خیال تھا کہ انگریز کو اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ کانگرسی لیڈروں کا شور و غوغا حق بجانب ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ کانگرس کے پروپیگنڈے سے خوف زدہ ہو جائے گا جس کے نتیجے پر مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ لیکن حقیقت اس کے الٹ تھی، وائسرائے نے متعدد بار گاندھی کو پاس بلا کر حالات کے تقاضوں کے پیش نظر اور ملکی سیاست میں تغیر کو مدنظر رکھتے ہوئے تفصیلات سے آگاہ کیا لیکن گاندھی کی ایک ہی رٹ اور ایک ہی ہٹ تھی کہ واحد نمائندہ جماعت کانگرس ہے اور ہندوستان کی جلد از جلد آزادی مطلوب ہے۔

بالآخر ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا جس میں انہوں نے کہا کہ شہنشاہ برطانیہ کی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ جب مستقبل کے لیے ہندوستانی وفاقی حکومت کے منصوبے پر غور شروع کرنے کا وقت آئے گا نیز اس منصوبے پہ غور کرنے کا جس سے سابق وزیر ہند کی ان یقین دہانیوں کی تعمیل ہونے والی ہے۔ جو انہوں نے پارلیمنٹ میں کی تھیں۔ تو یہ ضروری ہوگا کہ اس وقت کے حالات کی روشنی میں اس پر دوبارہ غور کیا جائے کہ ۱۹۳۵ء کے قانون کا جو منصوبہ ہے۔ اس کی تفصیلات کس حد تک باقی رہتی ہیں۔

علاوہ ازیں مجھے یہ اختیار بھی دیا گیا ہے۔ کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کے مختلف فرقوں اور جماعتوں کے نمائندوں اور والیانِ ریاست سے مشورہ کروں اور مناسب ترمیمات کروں شہنشاہ کا ارادہ ہے کہ سلطنت کے اندر ہندوستان اور یونائیٹڈ کنگڈم (حکومت متحدہ) کے درمیان اس شرکت کو اس مقصد کے لیے بڑھائے کہ عظیم نوآبادیات کے درمیان ہندوستان کو واجبی مقام حاصل ہو جائے۔

اقلیتوں کے بارے میں اعلان کرتے ہوئے وائسرائے نے کہا۔

کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ ہم از سر نو دستور وضع کرنے کا منصوبہ بنائیں یا ہندوستان کے آئندہ دستور کے کسی حصے میں ترمیم کریں اس لیے جو تحفظات اقلیتوں کی دستور میں دیئے گئے ہیں۔ ان کی بنظر غایت نگرانی کی جائے گی اور کسی دوسری جماعت یا فرقے کو اس میں مخل ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔

اقلیتوں کے بارے میں یہ اعلان اگرچہ کسی حد تک ان لوگوں کے لیے مفید تھا۔ جن کا تعلق

Marfat.com

ایسی جماعتوں سے تھا جو نہ تو کانگرس کے ساتھ تھیں اور نہ ہی مسلم لیگ کے ساتھ مثلاً اچھوت سکھ۔ اینگلو انڈین۔ ہندوستانی عیسائی وغیرہ۔

والسرائے کا یہ بیان کانگرس کی دلسوزی کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ ۲۲ راکتوبر اور ۲۳ راکتوبر ۱۹۳۹ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بمقام وردھا ہوا جس میں والسرائے کے بیان کی شدید مذمت کی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ برطانیہ کو اس وجہ سے کوئی مدد نہیں دے سکتی کہ یہ مدد اس کی اس استعماری پالیسی کی تائید کے مترادف ہوگی جس کو کانگرس نے ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہا ہے۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اس اجلاس میں حکم دیا گیا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے کانگرس کی وزارتیں ۳۱ راکتوبر ۱۹۳۹ء تک مستعفیٰ ہو جائیں۔ ۲۶ راکتوبر ۱۹۳۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے سیاسی حالات پر بحث ہوئی، وہاں تجویز پیش کی گئی کہ کانگرس کو مطمئن کرنے کے لیے والسرائے کی مجلس انتظامیہ میں توسیع کر کے کانگرسی ارکان کو شامل کر لیا جائے لیکن کانگرس کے رہنما اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور اپنا فیصلہ بحال رکھا۔

سب سے پہلے ۲۷ راکتوبر ۱۹۳۹ء کو مدارس کی وزارت مستعفی ہوئی، اس کے بعد ۱۴ رنومبر ۱۹۳۹ء تک تمام کانگرسی وزارتیں اپنے استعفے متعلقہ گورنروں کو پیش کر چکی تھیں، کانگرس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر انگریز کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ چنانچہ اسی غصے اور غضب کے تحت تمام استعفے منظور کر لئے گئے اور صوبوں کے نظام گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کے تحت گورنروں نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور سرکاری عہدہ داروں کو اپنا اپنا ایڈوائزر مقرر کر لیا۔ کانگرس کی وزارتوں کے بعد جو وزارتیں قائم رہیں، ان میں آسام کی مخلوط وزارت جس میں زیادہ تر وزراء مسلم لیگ کے تھے۔ اور جس کے وزیر اعلیٰ سر محمد سعد اللہ تھے پنجاب کی وزارت جس میں یونینسٹ پارٹی کو فوقیت حاصل تھی۔ بنگال اور سندھ وزارتیں۔

کانگرس کا پچھتاوا:- کانگرس کا خیال تھا کہ انگریز اس کے اس عمل سے پریشان ہو گا اور حکومت کی نظامت میں گڑبڑ پیدا ہوگی لیکن نتائج اس کے بالکل برعکس نکلے۔ انگریز نے کانگرسیوں کی استعفوں کی قطعی طور پر پرواہ نہ کی اور دفعہ ۹۳ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا ان صوبوں میں نفاذ کر کے گورنروں کو مکمل انتظامیہ کے اختیارات سونپ دیئے۔ اپنی یہ حالت زار دیکھ کر کانگرس بے حد پچھتائی لیکن اب

Marfat.com

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

کانگرس منہ اٹھائے ایک عرصہ دراز تک یہ دیکھتی رہی کہ شاید انگریز حکومت کو کچھ خیال آئے اور انگریز گورنر انہیں دوبارہ وزارتیں بنانے کی دعوت دیں۔

یوم نجات:- کانگرس وزارتوں کے استعفیٰ دے دینے سے ان کے وہ تمام بُت ٹوٹ گئے جو انہوں نے مسلمانوں کے لیے بھی بنائے۔ ان کے وہ تمام افسول ٹوٹ گئے۔ جن کے تحت انہوں نے بے بس مسلمانوں کو پتھر بنا یا ہوا تھا۔ خود بخود حالات کی ایک ہی ضرب نے کانگرس کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور مسلم لیگ کے مقاصد قدرتی طور پر از خود حاصل ہو گئے۔ قائدِاعظم نے ۶ دسمبر کو تمام مسلمانوں ہند سے اپیل کی کہ کانگرسی وزارتوں کے استعفوں کے بعد مسلمانوں پر کانگرسی صوبوں میں ظلم وستم ختم ہونے کی خوشی میں ۲۲ ردسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات منایا جائے۔ قائدِاعظم نے تمام مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ اس مبارک دن پر کسی قسم کی لاقانونیت کا مظاہرہ نہ کریں، کوئی ہنگامہ یا شور برپا نہ کریں کسی قسم کی آویزش میں نہ الجھیں اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی ہڑتال کریں۔

یوم نجات منانے کے لیے تمام مسلمانوں نماز جمعہ کے بعد (۲۲ ردسمبر ۱۹۳۹ء کو جمعہ کا دن تھا) شکرانے کے نوافل پڑھیں۔ اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر پرامن جلسے کریں اور ان میں قرار داد پاس کریں کہ کانگرسی حکومت کے دوران مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی تحقیقات غیر جانبدارانہ طور پر کرائی جائے۔

یوم نجات منانے کا اعلان کانگرس کے لیے بالخصوص اور ہندوؤں کے لیے بالعموم برق سوزاں سے کم نہیں تھا۔ دوسری طرف اچھوتوں، پارسیوں اور دیگر اقلیتی جماعتوں نے قائدِاعظم کے اس بیان کا خیر مقدم کیا۔ اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر نے "پونا پیکٹ کا حوالہ دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ "میں اپنی غفلت پر شرمندہ ہوں"۔۔۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پیکٹ پر دستخط کرائے جانے کے وقت مسٹر گاندھی میں جس قدر عجز وانکساری تھی اس وقت ان کے دل ودماغ کی کیفیت اتنی ہی دگرگوں تھی۔ کانگرسی حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کا حق دراصل میرا تھا جسے مسٹر محمد علی جناح نے پہلے ہی مجھ سے چھین لیا ہے۔

المختصر ۲۲ ردسمبر ۱۹۳۹ء کو "یوم نجات" پورے وقار اور حل طراف سے منایا گیا اچھوتوں اور پارسیوں وغیرہ نے بھی اس میں پورے جوش وخروش سے حصہ لیا اس دن کے

Marfat.com

منائے جانے پر ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار جن کی اشاعت ہندوؤں اور انگریزوں کے ہاتھ میں تھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ "مسٹر جناح نے نہایت جمہوری انداز میں اور پر وقار طور پر احتجاج کیا ہے"۔ اس سے ان کے بارے میں نہ صرف ہندوستان میں ان کی عظمت و رفعتِ ذہن کا اعتراف ہو گیا ہے۔ بلکہ انہوں نے پوری دنیا میں مسلم لیگ کے لیے رائے عامہ ہموار کر لی ہے۔

Marfat.com

قرار داد لاہور سنہ ۱۹۴۰ء

سوال:۔ وہ کون سے حالات تھے جن کے تحت ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ایک ہی پلیٹ فارم سے ایک علیحدہ ملک کے حصول کا نعرہ لگایا اور اسے باقاعدہ ایک قرارداد کی صورت میں برطانیہ کی حکومت کے سامنے پیش کیا یہ قرارداد کب اور کہاں پاس کی گئی۔ اس قرارداد کا مقصد بیان کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ مسلم لیگ کس حد تک اپنے مقاصد میں کامیاب رہی؟

جواب:۔ ہندوستان بھر میں کانگرس کی بے جا سرگرمیوں اور کانگرس کی دو سالہ زیادتیوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ہندو ایک متعصب قوم ہے اور یہ اپنی مطلب برآری کے لیے مسلمانوں کو اپناماڈٹ بنا رہی ہے۔ کیونکہ جب اسے ابھی حکومت نہ ملی تھی۔ اس وقت اس کا نعرہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی حکومت کی تشکیل کرنا ہے جو کسی بھی مذہبی فرقے میں مداخلت نہ کرے گی اور کسی کی دل آزاری کی کوئی کارروائی نہ کرے گی۔ مسلمان اپنی انتہائی سادگی اور نیک نیتی کی بنا پر ہندو کی بنائی ہوئی کانگرس کے جال میں وافر تعداد میں پھنس گئے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ انہیں بندے ماترم کا نغمہ الاپنا پڑے گا دیا مندر کا شکار ہونا پڑے گا۔ گاؤکشی پر سزا کاٹنا پڑے گی۔ اور شدھی کی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں بھسم ہونا پڑے گا تو انہیں احساس ہوا کہ انہیں واقعی ایک علیحدہ ملک کی ضرورت ہے ایسا ملک جس میں مسلمانوں کی حکومت ہو۔ جس میں مسلمان آسانی اور آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکیں۔ ہندو نے اس دو سال کے عرصہ میں اپنے کردار کی جو صورت پیش کی اس کی سزا اسے جلد ہی مل گئی اور خود اس کو اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا پڑی۔ اس قدر فریب کاریوں سے حاصل کیے ہوئے اقتدار کو محض اس لیے چھوڑ دیا کہ انگریز نے ان کی زیادہ دیر تک ناز برداری کرنے سے

Marfat.com

انکار کر دیا۔ کانگرس کا خیال تھا کہ جنگ کے دنوں میں اپنے مطالبات کو زیادہ موثر انداز سے منوا سکے گی لیکن سوچا تھا کیا، کیا ہو گیا۔

جنگ عظیم دوم کا آغاز دراصل انگریزی سلطنت کے زوال کا آغاز تھا۔ اگرچہ انگریز نے اس جنگ میں زبردست حوصلہ مندی، جرأت اور بے باکی کا ثبوت دیا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریز کی عالمی سطح پر برتری کا سورج اپنے نکتہ عروج سے ڈھلوان کی طرف مائل ہو گیا تھا اس جنگ کے شروع ہو جانے سے ہندوستان میں انگریز کو دو تین سیاسی محاذوں پر بھی لڑنا پڑا۔ جنگ کے بارے میں کانگرس نے تو پہلے ہی اعلانیہ نفرت کا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے بھی کچھ شرطیں رکھ دی تھیں۔ لیکن مسلم لیگ کی شرطیں انگریز کی ڈھارس بندھانے کے لیے کافی تھیں۔ اور اس کے برعکس کانگرس نے زبردست طوطا چشمی کا ثبوت دیا تھا۔ ان حالات کی بنا پر انگریز کا مان خاک میں ملتا جا رہا تھا۔ تاہم اس نے دونوں جماعتوں سے مذاکرات جاری رکھے۔

ہندو کا تکبر تب ٹوٹنا شروع ہوا جب کانگرس سے نکل کر لاتعداد مسلمان ہندوستان کی واحد مسلم جماعت مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ ہندو کا طلسم اس وقت ٹوٹ گیا جب مسلم لیگ نے ہندوستان بھر میں یوم نجات منا کر پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اگرچہ کانگرس کی وزارتیں قائم ہو گئی تھیں۔ اور ان کے قیام نے مسلم لیگ کو ضرب پہنچانے کی بے شمار مختلف اندازوں میں سعی نا تمام کی لیکن اس سے مسلم لیگ کو زیادہ تقویت و وسعت ہی حاصل رہی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کے درمیانی سالوں میں مسلم لیگ بلوغت تک پہنچ گئی تھی اور اس کا اعتراف خود انگریز کو کرنا پڑا جب کہ جنگ عظیم دوم کے شروع ہوتے ہی لارڈ لنلتھگو نے مہاتما گاندھی اور قائداعظم محمد علی جناح کو اکٹھا بلا کر ملکی سیاست کے بارے میں گفت و شنید کی۔ ان دو سالوں میں مسلم لیگ نے انگریزوں کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ کانگرس متعصب ہندوؤں کی ایک جماعت ہے جس میں چند ایک سادہ لوح مسلمان بھی پھانس لیے گئے ہیں۔ انگریز خوب جان گیا تھا کہ گاندھی کی زبان پر مسلمانوں جیسی شیرینی اور کردار میں متعصب ہندو کی منافقت پائی جاتی ہے۔ یہی چیز اس شخص کی کامیابی کا راز بنتی جا رہی تھی لیکن انگریز بھی یہ جانتا تھا کہ قول سے زیادہ خطرناک فعل ہوتا ہے۔ قول ایک بھبوری ہے اور فعل ایک عمل ہے۔ انگریز کے خیال میں ہندو کے اعمال خطرناک تھے۔ اقوال اگرچہ شیریں تھے یہ بات مسلمانوں پر بھی عیاں تھی۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ کانگرس کی وزارتوں کی تشکیل کے بعد مسلم

Marfat.com

لیگ اور زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ سیاسی میدان میں اپنی راہ ہموار کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوئی۔ ۲۷ر اگست ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ تمام مسلمانوں کو یکجا ہو کر ہندوستان میں اپنے لیے ایک علیحدہ مقام پیدا کرنا چاہیئے اس کے بعد ۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جب کہ انگریز جرمنی کے مقابلے میں میدان جنگ میں کود پڑا تھا۔ اور اس نے مسلمانوں کے لیڈر قائداعظم سے ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں کی اعانت طلب کی تھی تو مسٹر جناح نے نہایت شان دار انداز میں امداد دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولیشن پاس کیا جس کا مقصد یہ تھا۔

"آزاد ہندوستان میں ایک آزاد اور خود مختار مملکت ہونی چاہیئے جس میں اپنے مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق و مفاد کی کامل حفاظت کے اطمینان کے ساتھ فرقہ اکثریت کے دوش بدوش مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں مساویانہ شرکت کر سکیں"

۱۸ ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے گورنمنٹ کی پالیسی کا اعلان کیا جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

" ملک معظم کی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ جب مستقبل کے لیے ہندوستان کی وفاقی حکومت کے منصوبے پر غور شروع کرنے کا وقت آئے گا اور نیز اس منصوبے پر غور کرنے کا جس سے سابق وزیر ہند کی ان یقین دہانیوں کی تعمیل ہونے والی ہے۔ جو انہوں نے پارلیمنٹ میں کی تھی تو یہ ضروری ہوگا کہ اس وقت تک کے حالات کی روشنی میں اس پر دوبارہ غور کیا جائے کہ ۱۹۳۵ء کے قانون کا جو منصوبہ ہے اس کی تفصیلات کسی حد تک باقی رہتی ہیں اور مجھ کو ملک معظم کی طرف سے یہ کہنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ اختتام جنگ پر ہندوستان کے مختلف فرقوں پارٹیوں اور مفاد کے نمائندوں سے اور والیان ریاست سے اس نظریئے کے تحت مشورہ کرنے کے لیے وہ تیار ہوگی کہ ایسی ترمیمات وضع کرنے میں ان کی مدد اور ان کا تعاون حاصل کرلے جو مناسب ہوں۔ مجھے اعتماد ہے کہ میں نے ابھی جو کچھ کہا اس میں نے یہ واضح کیا ہے کہ گورنر جنرل کے انسٹرومنٹ آف انسٹرکشنز (Instrument of Instructions) میں جیسا کہ درج ہے ملک

Marfat.com

معظم کی حکومت کا یہ ارادہ ہے اور اس کو یہ فکر ہے کہ سلطنت کے اندر ہندوستان اور حکومت متحدہ کے درمیان اس شرکت کو اس مقصد کے لیے بڑھائے کہ عظیم نو آبادیات کے درمیان ہندوستان کو ایک واجبی مقام حاصل ہو جائے وہ سکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ہے اس راہ میں ایک منزل کے طور پر وضع کی گئی ہے۔ لیکن میں نے جو کچھ ابھی کہا ہے اس میں یہ واضح کر دیا ہے کہ کہ اختتام جنگ پر ملک معظم کی حکومت اس کے لیے تیار ہوگی کہ قانون مذکورہ کی سکیم کو ہندوستانیوں کی رائے کی روشنی میں ترمیم کے لیے کھلی ہوئی قرار دے اور میں یہ بھی واضح کر دیتا ہوں کہ جیسا ہمیشہ رہا ہے ملک معظم کی حکومت کا یہ نصب العین ہوگا کہ اس مقصد کے لیے ہندوستان اپنے مطمح نظر کی طرف ترقی کرے۔ جس طریقے سے بھی ممکن ہوگا۔ وہ مختلف جماعتوں کے درمیان باہمی اتفاق کو بڑھانے کی کوشش کرے گی۔"

...... یہ ناقابلِ تصور ہے کہ ہم از سرِ نو دستور وضع کرنے کا منصوبہ بنائیں یا ہندوستان کے آئندہ دستور کے کسی اہم حصے میں ترمیم کریں اور ان سے مشورہ نہ کریں جو اس قسم کے کام میں ملک معظم کی حکومت اور پارلیمنٹ کے ساتھ ماضی قریب میں شریک تھے۔"

لارڈ لنلتھگو کا یہ بیان بالکل مبہم تھا۔ اس میں ایک طرف تو وہ اعلان کر گئے کہ آزادی کی بات اور دستور کی بات اب جنگ کے بعد ہی کی جائے اور دوسرے یہ کہ اگر جنگ کے بعد دستور کے بارے میں بات چیت ہوئی بھی تو وہ اسی دستور یعنی ۱۹۳۵ کے ایکٹ پر ہوگی۔ اس ایکٹ میں ترمیم کی گنجائش تو ہوگی لیکن ایک بالکل نیا دستور مرتب نہیں کیا جائے گا۔ یہ اعلان مسلم لیگ کے تقاضوں کے عین خلاف تھا۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کے اس اعلان پر تبادلہ خیالات کرنے اور اسی سلسلے میں ایک ریزولیوشن پاس کرنے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں ایک طرف تو ملک معظم کی اس بات کی تعریف کی گئی کہ انہوں نے کانگرس کے اس دعوے کو سرے سے ہی رد کر دیا کہ ہندوستان کی واحد سیاسی و منتخبہ جماعت صرف کانگرس ہے اور یہ کہ دوسری جماعتوں فرقوں اور مفاد کے گروہوں سے بھی بات چیت ہو سکے گی لیکن ساتھ ہی اس بات پر رنج

Marfat.com

کا اظہار کیا۔ کہ حکومت نے نئے دستور کی تشکیل کے بارے میں اچھے ارادے ظاہر نہیں کیے۔

ان تمام حالات کے پیش نظر ۳ فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ ماہ یعنی مارچ ۱۹۴۰ء کی ۲۲ تاریخ کو لاہور میں ایک عظیم الشان جلسے کا انتظام کیا جائے۔ جس میں ایک "علیحدہ مملکت" کا مطالبہ کیا جائے جو صرف مسلمانوں کے مختلف حقوق کے تحفظ کے پیش نظر تشکیل دی جائے۔ اس فیصلے نے نہ صرف ہندوؤں کو بلکہ انگریزوں کو بھی تشویش میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ انگریز، اور ہندو کی مشترکہ کوششیں شروع ہوئیں کہ مسلم لیگ کے اس اجلاس کو ناکام بنایا جائے۔ اس کے لیے انہیں کوئی مواد درکار تھا۔

انگریز عرصے سے "آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پہ گامزن تھا۔ اس کا سہارا لیتے ہوئے اس نے لاہور میں فساد کرانے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو خاکساروں نے ایک زبردست جلوس نکالا، اور انگریز دل نے یہ جان کر کہ خاکسار مسلمان ہیں، اور ان مسلمانوں پر اگر زیادتی کی جائے گی تو مسلم لیگی مسلمان بھی ان کی مدد کے لیے آگے بڑھیں گے۔ جب ایسا ہو گا۔ ہم حالات کو اس قدر ابتر کر دیں گے کہ خود مسلم لیگ اپنا تاریخی جلسہ کر ہی نہ سکے گی۔ چنانچہ اس پروگرام کے تحت انگریز نے جان بوجھ کر خاکساروں کے جلوس پر اندھا دھند گولی برسا دی جس سے لاتعداد خاکسار موت کی آغوش میں چلے گئے۔ یہ ناحق اجتماعی قتل مسلمان کی غیرت کے لیے ایک زبردست چیلنج تھا۔ اس وقت قائداعظم محمد علی جناح دہلی میں تھے اور لاہور میں مسلم لیگ کے جلسے میں شمولیت کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ تاہم بہت سے مسلم لیگی رہنما ہندوستان کے مختلف کونوں سے لاہور میں جمع تھے۔

انہوں نے متفقہ طور پر انگریز کے خلاف آواز بلند کرنے کا عزم کیا۔ چونکہ قائداعظم کو وہ سب اپنا لیڈر مانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے فوری طور پر ان سے دہلی میں رابطہ قائم کیا۔ قائداعظم نے کہا کہ کسی جلد بازی سے کام نہ لیں۔ انگریز کی چال ہے کہ وہ آپ کے جلسے کو تباہ و برباد کر دے اس لیے بے حد صبر و تحمل سے کام لیں اور خاکساروں سے تعزیت کے سوا اور کوئی قدم نہ بڑھائیں۔ مسلم لیگ کی اس خاموشی نے ایک اور خونی ڈرامے کے سین کو وقوع پذیر ہونے سے بچا لیا اور خاکساروں کے ساتھ زیادتی کی تمام تر ذمہ داری سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ پنجاب، کے سر لگا دی گئی۔

قائداعظم محمد علی جناح ۲۱ مارچ کو دہلی سے لاہور پہنچے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ کوئی مسلم

Marfat.com

لیگی جلوس وغیرہ میں استقبال کرنے کی زحمت نہ کرے۔ وہ نہایت متانت اور خاموشی سے لاہور پہنچے اور سیدھے زخمی خاکساروں کی عیادت کے لیے ہسپتال چلے گئے۔ اس طرح خاکساروں کی بدگمانیاں بھی دور ہو گئیں اور ہندوؤں اور انگریزوں کے عزائم پر اوس پڑ گئی۔

۲۲ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو نماز جمعہ کے بعد منٹو پارک لاہور (اقبال پارک) میں ایک لاکھ سے زائد افراد مجتمع ہوئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی جلسہ شروع ہوا۔ سر شاہنواز خاں آف ممدوٹ نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ قائداعظم نے جلسے کی صدارت کی اور ایک عالی شان اور مؤثر تقریر کی جس میں انہوں نے دوقومی نظریئے کی وضاحت کی اور لوگوں کو بتایا کہ اب وقت آگیا ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے لیے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ کریں۔ قائداعظم نے فرمایا کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی اس طرح چاہتے ہیں کہ وہ خود بھی اس میں آزاد ہوں۔ اگر ہندو آزاد ہوں اور مسلمان ان کے غلام بن کر رہ جائیں تو ایسی آزادی مسلمانوں کے لیے بے کار ہے۔ مسلمان ہندوستان میں ایک فرقے کی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ ایک قوم کی صورت میں آباد ہیں۔ اس لیے اس مسئلے کو بین الاقوامی نکتہ نظر سے حل کیا جانا چاہیئے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو جن کا مذہب تہذیب فلسفہ حیات معاشرت، نظام زندگی اور ادب بالکل منفرد ہے کبھی آپس میں مل کر نہیں رہ سکتے۔ تاریخ بتاتی ہے۔ کہ ایک قوم کا ہیرو دوسری قوم کا دشمن ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ ہم مذہبی روحانی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی اعتبار سے زیر کفالت کی سی زندگی گذاریں ہماری خواہش ہے کہ ہم دونوں آزاد ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ اس لیے ہمیں ایسا دستور قطعی طور پر منظور نہیں ہوگا جس میں مسلمانوں کی آزادی کی ضمانت نہ دی جائے گی۔

۲۳۔ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کا دن تاریخ پاکستان میں سب سے عظیم اور سنہرا دن تھا مسلم لیگ کے ایک نہایت معتمد لیڈر، قائداعظم کے چہیتے بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے ملک کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے مندوبین اور لاہور کے شیر دل مسلمانوں کے سامنے وہ تاریخی قرارداد پیش کی جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی (اس قرارداد کا متن آئندہ صفحات میں دیا گیا ہے)

اس اجلاس میں اگرچہ ایک لاکھ کے قریب افراد موجود تھے۔ لیکن ہندوستان مختلف صوبوں سے مسلم لیگ لیڈران کی حیثیت سے جو حضرات تشریف لائے تھے۔ ان میں سے چند ایک، کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں:۔

Marfat.com

۱۔ جناب خلیق الزمان	یو۔پی	
۲۔ مولانا عبدالحامد بدایونی	〃	
۳۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر	〃	
۴۔ سردار اورنگ زیب خان	ایم۔ایل۔اے	سرحد
۵۔ سر عبداللہ ہارون	〃 〃 〃	سندھ
۶۔ عبدالحمید خان	〃 〃 〃	مدارس
۷۔ ابراہیم اسمٰعیل چندریگر	〃 〃 〃	بمبئی
۸۔ سردار عبدالرؤف شاہ	〃 〃 〃	سی۔پی
۹۔ نواب محمد اسمٰعیل	〃 〃 〃	بہار
۱۰۔ قاضی محمد عیسیٰ	〃 〃 〃	بلوچستان
۱۱۔ مولانا ظفر علی خان	〃 〃 〃	پنجاب
۱۲۔ ڈاکٹر محمد عالم	〃 〃 〃	پنجاب

ان سب بزرگان نے قرارداد کی حمایت میں پر زور تقاریر کیں، اور یہ قرارداد اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ اس قرارداد کے پاس ہو جانے کے بعد مسلمانان ہند کے سامنے ایک واضح منزل تھی۔ ایک حقیقی جادہ عمل تھا۔ اور قدرت نے ایک اہل نظر اور ہوشمند لیڈر بھی دے دیا تھا۔

قرارداد کا متن حسب ذیل تھا۔

متن قرارداد لاہور یعنی قرارداد پاکستان:-

(منظور شدہ بہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ لاہور بتاریخ ۲۲-۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء)

۱۔ آئینی مسئلے پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کے اس اقدام کی تائید و توثیق کرتے ہوئے جو ان کی ۲۷ اگست، ۱۷، ۱۸ ستمبر، ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کی قراردادوں سے واضح ہوتا ہے، آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس بہ زور اعادہ کرتا ہے کہ وہ وفاقی منصوبہ جس کا اظہار گورنمنٹ

Marfat.com

آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں کیا گیا ہے۔۔۔قطعاً غیر موزوں اس ملک کے خاص حالات کے پیش نظر ناقابل عمل اور مسلم ہندوستان کے لیے یکسر ناقابل قبول ہے۔

۲۔ اس اجلاس کی یہ حتمی رائے ہے کہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو جو اعلان وائسرائے نے حکومت ملک معظم کی جانب سے کیا تھا وہ اس حد تک تو اطمینان بخش ہے کہ جس مسلک اور منصوبے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء مبنی ہے، اس پر ہندوستان کی مختلف جماعتوں، مفادات اور فرقوں کے مشورے سے دوبارہ غور کرنے کا یقین دلایا گیا ہے۔ لیکن مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا۔ جب تک کہ پورے آئینی منصوبے پر از سر نو غور نہ کیا جائے اور کوئی نیا منصوبہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا تاوقتیکہ وہ ان کی رضامندی اور منظوری سے مرتب نہ کیا جائے۔

۳۔ قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ مسلمہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔ تاوقتیکہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول پر وضع نہ کیا گیا ہو یعنی جغرافیائی طور پر وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے (مناسب علاقائی ردوبدل کے ساتھ) کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے ان کی تشکیل ایسی "آزاد ریاستوں" کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں۔

نیز ان وحدتوں اور خطوں میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب موثر اور حکمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے گا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے اور دیگر اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب و موثر اور حکمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے۔

مزید براں یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے۔ کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے

Marfat.com

مطابق آئین کا ایک ایسا منصوبہ مرتب کریں جس کی رو سے مذکورہ علاقوں کو بالآخر کلی اختیارات حاصل ہو جائیں مثلاً دفاع، اور امور خارجہ، مواصلات، محصولات اور دیگر ایسے امور جو ضروری سمجھے جائیں۔

قراردادِ پاکستان کی مزید تشریح مرکزی صوبائی مجالس قانون ساز کے منتخب ارکان کی اس لیگ کنونشن کی ایک قرارداد میں متفقہ طور پر کی گئی جو قائداعظم کی صدارت میں ۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں منعقد ہوئی جس میں منجملہ دیگر امور متعلقہ کے یہ واضح کیا گیا کہ

"ہندوستان کے شمال مشرق میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان یعنی پاکستان کے علاقے جہاں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہے۔ وہاں واحد مقتدر آزاد مملکت کی تشکیل کی جائے اور اس امر کا واضح اعلان کیا جائے کہ پاکستان کا قیام بلا تاخیر عمل میں لایا جائے گا۔"

قراردادِ لاہور کو اگرچہ قراردادِ پاکستان کا نام دیا جاتا ہے لیکن حقیقت ہے کہ اس قرارداد میں لفظ پاکستان کا ذکر کہیں بھی نہیں آیا۔ اس میں صرف ایسی سلطنت کے قیام کا ذکر ہے جو شمال مغربی ہندوستان کے چند پورے صوبے اور مشرقی ہندوستان کے دو پورے صوبوں پر مشتمل ایک مملکت کے تصور پر مبنی ہے۔ لفظ پاکستان دراصل ۱۹ اپریل ۱۹۴۶ء ہی کو دہلی قرارداد میں استعمال کیا جس کا متن اوپر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

سر سٹیفورڈ کرپس مشن
۱۹۴۲ء

سوال:۔ برطانوی حکومت نے کن حالات میں کرپس مشن قائم کیا، اس کے کیا مقاصد تھے؟ اور اس کی سفارشات کیا تھیں؟ کرپس مشن کی سفارشات کا رد عمل بھی بیان کیجیے۔

جواب:۔ ۱۹۴۲ء کے شروع میں جنگ اپنے پورے شباب پر تھی۔ انگریز جاپان اور جرمنی کے ہاتھوں مختلف محاذوں پر زبردست مار کھا بیٹھا تھا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ونسٹن چرچل (WINSTON CHURCHIL) جو ایک غیر معمولی شجاعت و ذہانت رکھنے والا شخص تھا، ہندوستان کے حالات پر مشوش تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان کی طرف سے سکون نصیب ہو اس نے وائسرائے ہند کو متعدد خطوط لکھے جن میں ہندوستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کو کسی ایک فارمولے پر متفق کرنے پر زور دیا گیا، لیکن کانگرس کی مسلسل ہٹ دھرمی کی بنا پر اس کی کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکیں۔

آخر کار فیصلہ کیا گیا کہ مسٹر چرچل کی وزارت میں سے چیدہ چیدہ وزراء کی ایک کمیٹی بنائی جائے جس کا نام انڈیا کمیٹی (INDIA COMMITTEE) رکھا جائے چنانچہ مسٹر اٹیلی جو بعد میں برطانیہ کے وزیر اعظم بھی بنے، کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، مسٹر اٹیلی اپنی فطرت کے اعتبار سے کانگرس نواز اور ہندو پرور تھے، انہوں نے سفارش کی کہ ایک مشن ہندوستان بھیجا جائے جو حالات کا جائزہ لے کر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو کسی ایک حل پر متفق الرائے کرے اور ہندوستان کے بحران کو ختم کرنے میں مدد دے۔ چنانچہ مسٹر چرچل نے ۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء کو مسٹر اٹیلی کی تجویز کو منظور کرتے ہوئے اعلان کیا کہ سر سٹیفورڈ کرپس (STAFORD CRIPS) کی قیادت میں ایک وفد ہندوستان بھیجا جائے گا جو مذکورہ مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرے گا۔ مسٹر سٹیفورڈ کرپس ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء

Marfat.com

کو ہندوستان پہنچے۔

مسٹر کرپس نے آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ والسرائے اور انیگزیکٹو کونسل کے ارکان سے پہلے دو تین روز تفصیلاً بات چیت کی اور ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے مسائل اور نکتہ ہائے نظر کو سمجھا۔ اس کے بعد مسٹر کرپس نے کانگرس لیڈروں اور مسلم لیگی رہنماؤں سے بھی براہ راست ملاقاتیں کیں، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگرس کی نمائندگی کی، مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم نے اپنا نکتہ نظر پیش کیا۔ اس کے علاوہ جن سیاسی لیڈروں سے مسٹر کرپس نے تبادلہ خیالات کیا ان میں سے سر سکندر حیات خان، مسٹر فضل حق۔ اچھوتوں کے مسٹر امبیدکر اور رائم۔ ایس راجا ہندو مہاسبھا کے ساورکر لبرل پارٹی کے سر تیج بہادر سپرو اور جیکو وغیرہ شامل تھے۔

۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو مسٹر کرپس نے اخباری کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ان تمام ملاقاتوں کے تاثرات بیان کیے جو انہوں نے گذشتہ سات روز میں ہندوستان کے مختلف حکام اور سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ملاقات کے بعد اپنے ذہن میں قائم کیے تھے۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ۔

۱۔ آئین ساز اسمبلی کامل اعلان آزادی کے ساتھ شروع ہو سکتی ہے۔

۲۔ اس آئین ساز اسمبلی کو پوری آزادی ہوگی کہ چاہے۔ وہ یونائیٹیڈ کنگڈم میں رہے یا نہ رہے۔

۳۔ وہ برطانوی گورنر جنرل قبول کرنے یا نہ کرنے کی مجاز ہوگی۔

۴۔ ہندوستانی ریاستوں پر چونکہ برطانیہ کا براہ راست کنٹرول نہیں ہے اس لیے انہیں آئین ساز اسمبلی میں شرکت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ جہاں تک محکمہ دفاع کا تعلق ہے، جنگ کے دوران قائم ہونے والی عبوری حکومت INTERM GOVERNMENT کو یہ محکمہ نہیں دیا جائے گا کیونکہ اس کا تعلق عالمی امور سے ہے۔

۶۔ عبوری حکومت میں نئے سرے سے وزراء منتخب کرنے کی بجائے والسرائے کی انیگزیکٹو کونسل کے ارکان ہی کو کابینہ تصور کر لیا جائے گا۔

۷۔ ان تمام امور پر یا تو پوری طرح عمل ہوگا، یا ان کو پوری طرح مسترد کر دیا جائے گا۔ اس کی

Marfat.com

جزوی قبولیت بے معنی ہوگی۔

کرپس تجاویز :-

اس سلسلہ میں کرپس مشن نے ایک نئی انڈین ڈومینین کے قیام کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں جن کا اعلان ۲۹ مارچ ہی کو کر دیا گیا۔

۱۔ جنگ ختم ہوتے ہی ہندوستان کا دستور بنانے کے لیے ایک مجلس منتخبہ قائم کی جائے گی جس میں ہندوستان کی ریاستوں کے نمائندے بھی شامل ہوں گے اس طرح متفقہ طور پر جو آئین مرتب کیا جائے گا اس کو برطانوی حکومت فی الفور نافذ العمل کرے گی۔ اس اقدام کے لیے یہ شرط لگائی گئی کہ

(و)۔ اگر برطانوی ہند کا کوئی صوبہ نیا دستور منظور کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کو یہ حق ہوگا کہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت قائم رکھے۔ اس بات کا بھی انتظام ہوگا کہ اگر وہ صوبہ نئے دستور میں شامل ہونا پسند کرے تو وہ بلاشک ہو جائے۔ ایسے صوبے جو الحاق قبول نہ کریں اور وہ چاہیں تو ملک معظم کی حکومت اس کے لیے تیار ہوگی کہ ان کو نیا دستور دینے پر رضامند ہو جائے اور ان کو وہی پورا مرتبہ دے جو انڈین یونین کا ہو۔

۲۔ جنگ کے بعد ملک معظم کی حکومت اور ہندوستانی سیاسی جماعتوں کے نمائندے ایک معاہدے پر دستخط ثبت کریں گے کہ واضح دستور گفت و شنید کے درمیان طے ہوگا۔ اس میں نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کا واضح انتظام کیا جائے گا۔ برطانوی دولت مشترکہ کی دوسری رکن حکومتوں سے تعلقات کے متعلق فیصلہ کرنے کے معاملے میں انڈین یونین کے اختیارات پر کوئی قید عائد نہیں کی جائے گی۔

۳۔ صوبوں کے انتخابات کے بعد (جو جنگ کے بعد ہوں گے) ایوانہائے زیریں کے تمام ارکان فی الفور متناسب نمائندگی کے اصول کے تحت ایک انتخابی ادارہ قائم کریں گے یہ نئی مجلس تعداد ارکان کے لحاظ سے انتخابی ادارے کا ۱/۱۰ ہوگی۔

۴۔ جنگ کے اہم دور میں نیا دستور رہنے تک ملک معظم کی حکومت ہی ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری سنبھالے گی۔ ہندوستان کی فوجی، اخلاقی اور مادی تنظیم کے کام میں حکومت ہندوستانیوں کے تعاون سے کام کرے گی۔ ملک معظم کی خواہش ہے کہ ہندوستانی عوام کے اہم طبقوں اور جماعتوں کے رہنما اپنے ملک کی کونسلوں۔ دولت مشترکہ اور اتحادی تومو

Marfat.com

کے کاموں میں پورا پورا حصہ لیں کیونکہ اس کام کی تکمیل جلدی اور آسانی سے ہوسکتی ہے جس پر ہندوستان کے روشن مستقبل کا انحصار ہے۔

ان تمام تجاویز کے مطالعے سے ہندوستان کے باشندوں پر یہ حقیقت بالکل عیاں ہو ہوگئی کہ برطانیہ جنگ کے دوران اقتدار منتقل کرنے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہے۔ اس کے بعد جب جنگ ختم ہو جائے گی تو ہندوستان میں انتخابات کرائے جائیں گے۔ دستور بنایا جائے گا۔ اور ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ الحاق حل کیا جائے گا۔ ان تجاویز سے اس بات کا بھی پتہ چلتا تھا کہ ہندوستان کے بارے میں برطانوی حکومت ہندوستانیوں کے جذبات کو مدنظر رکھنے کی بجائے اپنے معلومات کو سامنے رکھ کر فیصلے صادر کرنا چاہتی ہے اور برطانوی حکومت کے ذہن میں صرف ایک بات گردش کر رہی ہے کہ کس طرح ہندوستان والوں کو آزادی کی منزل تک پہنچنے سے تاخیر کا شکار کیا جا سکتا ہے اور وہ کون سے امور ہیں جو مختلف جماعتوں میں تنازعہ کا باعث بن سکتے ہیں : تاکہ ان کی بحث وتمحیث میں زیادہ وقت حاصل کیا جا سکے ۔

تجاویز مسترد :- یہ ایسی تجاویز تھیں جو نہ تو کلی طور پر کانگرس کو منظور تھیں اور نہ ہی مسلم لیگ کو ۔ کیونکہ دونوں جماعتوں کے مفادات ان تجاویز کے قبول کر لینے سے مضروب ہونے تھے اور مسٹر کرپس کی طرف سے یہ شرط بھی تھی کہ ان تجاویز کو جزوی طور پر نہیں کلی طور پر قبول کیا جائے یا مسترد۔ ان تجاویز کے بارے میں مسٹر گاندھی نے کہا۔

"یہ وہ چیک ہے جو جنگ کے بعد کیش ہو سکے گا"

قائداعظم نے فرمایا کہ۔

"ان تجاویز سے جو انتخابات کرانے مقصود ہوں گے وہ تو سراسر کانگرس کو ۵ ۷ ٪ نشستیں بلا چوں وچرا دے دینے کے مترادف ہوگا اور مسلمانوں کی کبھی اکثریت کے سامنے بن نہ پڑے گی"

ہندو مہاسبھا کا خیال تھا کہ ان تجاویز میں صوبوں کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ انڈین یونین سے الگ رہنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور اس سے تو ہندوستان کی وحدت کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے۔ اس طرح یہ تجاویز ہر ایک جماعت کے لیے کسی نہ کسی وجہ سے ناقابل قبول تھیں۔ اس لیے ان تجاویز کو مسترد کر دیا گیا۔

مسٹر کرپس کو جب اپنی تجاویز کے مسترد ہونے کی اطلاع ملی تو وہ فی الفور برطانیہ روانہ

Marfat.com

ہو گئے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۲ء کو انہوں نے ہاؤس آف کامنز (HOUSE OF COMMONS) برطانوی دار العوام میں بیان دیا کہ ان کی تجاویز کو محض اس لیے ناکامی ہوئی ہے کہ ان میں حق خود ارادیت اور عبوری انتظام حکومت کے بارے میں مختلف جماعتوں کے نظریات میں خلیج بہت وسیع تھی۔ ان کے خیال میں کانگرس نہیں چاہتی تھی کہ صوبوں کو علیحدہ کر دیا جائے اور ایک ایسی انڈین یونین تشکیل پذیر ہو جس کا شیرازہ بکھر سکتا ہو۔ اس کے علاوہ کانگرس کا پر زور مطالبہ تھا کہ محکمہ دفاع بھی انہیں فوراً منتقل کر دیا جائے۔ یعنی عبوری حکومت کے دوران ہی لیکن برطانوی نکتہ نظر اور افادیت یہی ہے کہ اسے مستقبل میں ہی جب جنگ ختم ہو جائے منتقل طور پر منتقل کیا جائے حالانکہ دوسری جماعتیں مثلاً مسلم لیگ اور پست اقوام برطانوی نکتہ نظر کی ہم خیال تھیں۔

کرپس مشن کے ناکام ہو جانے کے بعد ہندوستان کی سیاست کو ایک اور ضرب لگی۔ اس کا براہ راست اثر کانگرس پر اور بالواسطہ دیگر سیاسی جماعتوں پہ ہوا۔ کانگرس تو اس قدر مضطرب ہو گئی کہ اس نے محسوس کر لیا کہ انگریز جلد جان نہیں چھوڑے گا۔ اسے کسی اور طرح پریشان کرنے کی تیاری کی جائے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگرس کی طرف سے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی گئی جو پوری طرح ناکام بنا دی گئی۔ اس کا حال اگلے صفحات میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

"ہندوستان چھوڑدو" تحریک

۱۹۴۲ء

سوال: ہندوستان سے انگریز کے پاؤں اکھیڑنے کے لیے اگرچہ ہندوستان کے عوام کی طرف سے کافی دباؤ پہلے ہی دیا جارہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ پریشان کن تحریک انگریز کے لیے "ہندوستان چھوڑدو" کی تھی۔ اس تحریک کے اسباب کارنامے اور نتائج پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے؟

جواب: جنگِ عظیم دوم میں شروع شروع میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو سخت پریشان کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ادھر جرمنی مختلف مقامات پر بڑھتا چلا گیا ادھر ۱۹۴۲ء کے درمیانی حصّہ تک جاپان اتنی تیزی سے مغرب کی طرف بڑھنے لگا جس کی برطانیہ کو کبھی توقع نہ تھی۔ جاپان کی انتہائی تیز پیش قدمی سے یوں ظاہر ہوتا تھا کہ چند دنوں میں جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا اور انگریز کو زبردست ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جاپان دراصل دسمبر ۱۹۴۱ء میں برطانیہ کے خلاف جنگ میں کودا تھا۔ اس نے پرل ہاربر (PEARL HARBOUR) جس میں امریکی بحری جہازوں پر اس قدر شدید حملے کیے کہ بمباری سے اس بحری قوت کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ پرل ہاربر کو نیچا دکھانے کے بعد جاپانی فوجیں بلا کی تیزی سے شنگھائی کی بندرگاہ کی طرف بڑھیں اور اس پر قبضہ کرتے ہوئے اسی رفتار کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔ یہاں تک کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ان فوجوں نے سیام اور برطانوی ملایا پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ان کا رخ سنگاپور کی طرف ہو گیا۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۲ء کو جاپانی افواج نے سنگاپور بھی فتح کر لیا۔ ان کی پیش قدمی جاری رہی۔ جاپان کی اس فوجی قوت کی ضربِ شدید نے پورے ایشیا کو تو کیا پوری دنیا کو سراسیمہ و پریشان کر دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب جاپان کی راہ میں کوئی بھی قوت حائل نہیں ہو سکتی انگریز کے حوصلے قریب شکست تھے۔ انگریز کے تمام اندازے غلط ثابت ہوتے جو اس نے جاپان کے

Marfat.com

بارے میں لگا رکھے تھے۔ اسے جنگ کے دوران عملی طور پر علم ہوا کہ جاپان اس قدر ترقی یافتہ ہو گیا ہے کہ وہ دنیا کی کسی بھی قوت سے ٹکر لے سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود انگریز ان کا مقابلہ پوری جانفشانی سے کرتا جا رہا تھا۔ مار پر مار کھا کر بھی حوصلہ نہ ہارتا تھا۔ زبردست دفاعی کارروائیوں کے باوجود جاپانی فوجیں ۱۵ فروری سنہ ۱۹۴۲ء کو رنگون میں داخل ہو گئیں۔ رنگون برما کا دارالحکومت تھا۔ یہاں سے ان فوجوں نے جزائر انڈیمان کا رخ کیا اور اس پر قبضہ کر کے ہندوستان کے ایک عظیم شہر کلکتہ پر بمباری شروع کر دی۔

کانگرس اس صورت حال کا خاموشی سے جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے لیڈر خوش تھے کہ انگریز کو مشرقی محاذ پر زبردست شکست کا سامنا ہے۔ جونہی کلکتہ پر بمباری شروع ہوئی اسی وقت کانگرسی لیڈروں نے عوام کو یہ تصور دینا شروع کر دیا کہ اب انگریز کے پاؤں بالکل اکھڑ گئے ہیں۔ اس لئے اس کو ہندوستان سے فی الفور نکل جانا چاہیئے کیونکہ اگر جاپان ہندوستان میں داخل ہو گیا تو ہندو عوام انگریز کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ کانگرس نے اپنی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا جس میں کانگرس کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ چونکہ انگریز مشرق میں اپنا وقار کھو بیٹھا ہے۔ اس کے جائز وارث یعنی ہندوؤں کے حوالے کر دے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو انڈین نیشنل کانگرس حکومت کے خلاف مناسب قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے گی۔ کانگرس کی طرف سے اس قسم کے بیان نے ہندوستان کے ہندوؤں پر جو اثر ڈالنا تھا۔ وہ ظاہر تھا۔ اس بیان سے کانگرسی زعما بھی اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے۔

سبھاش چندر بوس جو کبھی کانگرس کے صدر بھی رہ چکے تھے اس بات کا جائزہ لے رہے تھے کہ انگریز کو مشرقی محاذ پر کس قدر مار پڑ رہی ہے۔ جب انہوں نے جاپان کا پلہ بھاری دیکھا تو وہ ہندوستان سے بھاگ کر جاپانی فوج کے ساتھ اس خیال سے شامل ہو گئے کہ وہ جاپانیوں سے مل کر ہندوستان کو انگریز کے چنگل سے آزاد کرائیں گے لیکن سبھاش چندر بوس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور جلد ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا اور جاپانی فوجوں کی پیش قدمی پسپائی میں تبدیل ہونے لگی۔

کانگرس نے جب انگریز کو زبردست جنگی مشکلات میں پھنسا ہوا دیکھا تو اس نے سیاسی طور پر اس کو بلیک میل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کانگرس کا خیال تھا کہ انگریز کے لیے ان بدترین حالات میں ہم سیاسی دباؤ شدت سے ڈال لیں گے کہ پورے ہندوستان میں کانگرس راج یا ہندو راج قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس طرح مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کا گلہ خود بخود دب جائے گا۔ چنانچہ ۲ مئی سنہ ۱۹۴۲ء کو مسٹر گاندھی نے کہا کہ وہ جاپانیوں کے

Marfat.com

حملے کا "عدم تعاون" اور "عدم تشدد" سے مقابلہ کریں گے۔ یہ قرارداد صرف مگرمچھ کے آنسو بہانے کے مترادف تھی لیکن ۱۴ جولائی کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے واردھا کے مقام پر ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ انڈین نیشنل کانگرس نے پوری تندہی سے اس امر کی کوشش کر کے دیکھ لیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد ہو جائے لیکن ہم بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب تک بیرونی طاقت یعنی انگریز اس خطہ زمین پر موجود ہیں، ان دونوں فرقوں میں مصالحت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب چونکہ جاپان ہندوستان کے اس قدر قریب آ چکا ہے کہ پورے برصغیر کے لیے خطرے کا باعث بن گیا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ انگریز جس قدر جلدی ہو ہندوستان سے نکل جائے اور اسے اس کے اصلی مالکوں کے حوالے کر جائے۔ اگر انگریز نے ایسا نہ کیا تو ہندوستان بھر کی کانگرس مناسب اقدام کرے گی یعنی ایک تحریک چلائے گی جس کی بنا پر انگریز سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دے۔ اس ریزولیوشن کی اشاعت نے پورے ہندوستان کے ہندوؤں میں ایک برقی لہر دوڑا دی اور وہ سب انگریز کے خلاف عدم تعاون اور عدم تشدد کے اصولوں کے تحت عمل پیرا ہونے پر تیار ہو گئے۔ واردھا کے اجلاس میں کی جانے والی کارروائی کا علم جب انگریز حاکم کو ہوا تو ظاہر ہے۔ اس سے اس میں کسی قدر شدید غصے کے ردعمل کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ جاپانیوں کی مار سے ستائے گئے انگریز نے فیصلہ کیا کہ کانگرس کی اس تحریک کو جو اسے محض بلیک میل کرانے کے لیے چلائی جا رہی ہے۔ سختی سے کچل دے۔

ادھر مسٹر گاندھی کا خیال تھا کہ چونکہ اب انگریز ایسے حالات سے خوف زدہ ہو کر ان سے اپنی جان بچانا دشوار ہو گیا ہے۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس کی اس قرارداد سے خوف زدہ ہو کر ان کے مطالبات ماننے ہی میں مصلحت جانے گا اور ہندوستان چھوڑ جائے گا۔ جس کے بعد پورے ہندوستان میں ہندو راج قائم کر کے اسے اکھنڈ بھارت کی شکل دے دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ابوالکلام آزاد نے مسٹر گاندھی سے کہا کہ انگریز اس تحریک سے برہم بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی برہمی کی پرواہ نہیں۔ ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو انگریز کی طرف سے سرد مہری کو دیکھ کر انڈین نیشنل کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کو باقاعدہ شروع کر دیا جائے۔ اور انگریز فی الفور اس کی آزادی کا اعلان کر دے۔

کانگرس کا یہ اعلان سنتے ہی ہندو تخریب کار ہندوستان ہی میں تخریب کاری میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ مسٹر گاندھی نے عدم تشدد کا زبانی اعلان کیا تھا لیکن وہ تو صرف اعلان تک محدود

Marfat.com

ہونے کا اصول تھا کانگریسی غنڈوں نے وسطی اور جنوبی ہندوستان میں بالخصوص اور ربانی تمام ہندوستان میں بالعموم پوری سنجیدگی سے امن عامہ کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ انگریز کے کاموں میں دشواریاں ڈالنی شروع کر دیں۔ جگہ جگہ بے جا ہنگامے کھڑے کر دیئے۔ بنکوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ریلوے سٹیشنوں کو جلا دیا اور ریلوں کی پٹریوں کو اکھیڑنا شروع کر دیا۔ تار اور ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور دیگر ذرائع مواصلات کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ کانگریسی لیڈروں کی ایما پر کی جانے والی ان تخریب کاریوں کی شدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان تشدد آمیز کارروائیوں میں ۹۴۰ افراد ہلاک اور ایک کروڑہ ۳۵ لاکھ روپے کی املاک کا نقصان ہوا۔

اس ریزولیشن کے پاس ہوتے ہی انگریز حاکم نے نہ صرف مسٹر گاندھی بلکہ تمام کانگریسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا جن میں ابوالکلام آزاد۔ پنڈت جواہر لال نہرو مسز سروجنی نائیڈو کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور ان کو قلعہ احمد نگر جیل میں نظر بند کر دیا بلکہ کانگرس کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد "انڈیا ونز فریڈم" میں لکھتے ہیں کہ گاندھی جی اس گرفتاری سے بہت افسردہ ہوئے۔ کیونکہ انہیں توقع نہیں تھی کہ اس معاملے میں انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے کانگرس کے اس فیصلے کو نہایت احمقانہ قرار دیا اور قائداعظم نے ۳۱ جولائی ۱۹۴۲ء کو اعلان کیا کہ کانگرس کا یہ ریزولیشن نہایت مکروہ نوعیت کا ہے۔ اور اس نے دوسرے لفظوں میں انگریزوں کو بدترین حالات میں بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے۔

انہوں نے واضح طور پر کہا کہ ہندو کا اس اعلان سے مطلب دراصل ہندوستان میں خالص ہندو راج قائم کرنا ہے۔ اور اس راج کے تحت مسلمانوں کے علاوہ دوسری ہندوستانی اقوام کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانا مقصود ہے۔ اس لیے مسلم لیگ کانگرس کے اس ریزولیشن کی شدید مذمت کرتی ہے۔ قائداعظم کے بیان کے فوراً بعد اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیدکر، لبرل لیڈر سپرو اور ہندو مہاسبھا کے لیڈر رپر مانند نے بھی قائداعظم کی تقلید میں کانگرس کے فیصلے پر شدید نکتہ چینی کی۔

برطانوی حکومت نے اس تحریک کو پوری قوت سے سختی کر کے کچل دیا۔ دو مہینے کے عرصے میں یہ تحریک پورے ہندوستان میں شعلے کی طرح چمک کر خاکستر ہو گئی۔ اسی دوران میں برطانوی کامیابیوں کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ حالات اس قدر پلٹ گئے کہ جنگ کا نقشہ اور کا اور ہی ہو گیا۔ جو علاقے جاپان نے فتح کئے تھے وہ اسے ایک ایک کر کے چھوڑنا

Marfat.com

پڑے۔ اور برطانوی برتری ایک بار پھر تسلیم کی جانے لگی۔

کانگرسی ہندوستانی لیڈروں کو اس تحریک کے ناکام ہونے کا نہ صرف شدید صدمہ ہوا بلکہ انہیں شرمندگی سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ سبھاش چندر بوش جو حالات کے پلٹنے کے ساتھ ہی پلٹ گیا۔ کس تیزی سے جاپانیوں سے جا ملنے کے لیے بھاگا۔ لیکن جب جاپانیوں کو شکست ہوگئی تو وہ کس منہ سے ہندوستان آسکتا تھا۔ آخر پردیس ہی میں بے سروسامانی کی موت سے دوچار ہوا۔

کانگرس نے یہ تحریک غلط موقع پر شروع کر کے نہ صرف اپنی آزادی کے راستے میں دیوار کھڑی کر لی بلکہ اس نے دوسروں کی راہوں کو بھی مسدود کر دیا۔ کانگرسی ہندو راج لینے لینے اپنے وقار کو بھی کھو بیٹھے اور ان کے اس کردار سے ملک کا سیاسی تعطل اور طویل ہو گیا۔ بہت ممکن ہے۔ کہ انگریز ہندوستان سے ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی نکل جاتا جب کہ جنگ عظیم دوم اصولی طور پر ۱۹۴۴ء میں ہی ختم ہو گئی تھی۔

Marfat.com

جناح گاندھی بات چیت

سوال :۔ ۱۹۴۲ء تک مہاتما گاندھی یہی شور کرتے رہے کہ ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت کانگرس ہی ہے اور حکومت برطانیہ کو ملک کے سیاسی مسائل مشورے سے حل کرنے چاہئیں لیکن انگریز اس حقیقت سے کیسے آنکھیں بند کر سکتا تھا کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے دلوں میں مسلم لیگ کے لیے ہمدردیاں موجود ہیں۔ انگریز کے رویے مسلم لیگ کی مقبولیت اور کانگرس کی سیاسی قلابازیوں میں ناکامی کے بعد مسٹر گاندھی، قائداعظم سے بات چیت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بات چیت بہت طویل رہی اس قول کی روشنی میں جناح گاندھی بات چیت پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے؟

جواب :۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہاتما گاندھی کی ہمیشہ کوشش یہ رہی کہ پورے ہندوستان میں کانگرس کو کلی اکثریت حاصل رہے اور اس کی حکومت پر نہ تو ناقدانہ نظر رکھنے والا ہو اور نہ ہی اس کے ہتھکنڈوں کو عیاں کرنے والا کوئی موجود ہو۔ گاندھی سے جو بن پڑی اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے کیا۔ مسٹر گاندھی کانگرس کی کامیابی چاہتے تھے۔ چاہے وہ براہ راست ملے یا بالواسطہ چاہے۔ اس کے لیے انہیں بھیس بدلنا پڑے یا قول۔ ویسے بھی مہاتما کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ گریز کے دوراہے پر بیٹھے رہتے تھے۔ جب کبھی کوئی الجھن ہوتی یا کسی پرسش کا اندیشہ ہوتا یا مسلمانوں کے سامنے کسی وضاحت کی ضرورت ہوتی تو ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ وہ کانگرس میں چونی کا حصہ دار بھی نہ ظاہر ہوتے دیتے۔ لیکن جہاں کہیں کانگرس کا پلہ بھاری ہوتا دکھائی دیتا وہ فی الفور کانگرس کا سب کچھ بن کر منظر میں آ ٹپکتے اور ایک نہایت ہی بھرپور دار کر کے تماشا

Marfat.com

دیکھتے۔ مہاتما گاندھی کا تن اگر پاک صاف تھا تو من کے اندر ہیں "مسلمانوں کے لیے زبردست تعفن تھا۔ ان کا ظاہر اور باطن دو مختلف چیزیں تھیں۔ ان کے بارے میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں۔ اس میں کس حد تک صداقت کے عناصر موجود ہیں۔

یہی دستور گاندھی نے انگریز کے ساتھ روا رکھا پہلے تو یہ کوشش کی کہ انگریز کو اپنی اکثریت کا خوف دلا کر ہراساں کیا جائے۔ پھر مسلمانوں کو فرقہ وارانہ مصائب میں مبتلا کرے اگرچہ زبان پر عدم تشدد تھا، پھر انگریز پر مصیبت پڑنے پر اس کو جنگ کے دنوں میں بلیک میل کرنے کی سعی نا تمام کر کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے الجھانے کی طرف زیادہ سوچ کر اور مسلمانوں کو کمال تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے۔ انگریز کو ہندوستان چھوڑ دینے کی تحریک کا آغاز کیا۔ لیکن جب اسے معلوم ہو گیا کہ کانگرس کا اکثریتی جماعت ہونے کے باوجود انگریز اس کی کلی عظمت کا معترف نہیں تو اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو بدلے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کے سلسلے میں ۱۹۴۲ء کے ماہ اگست میں انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ اور اس مرتبہ ایسا بند کیا گیا کہ اس کو اپنا ذہن تبدیل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو اپنے عہدے سے دست بردار ہو کر واپس انگلینڈ چلے گئے۔ لارڈ لنلتھگو اپنے عہد حکومت میں ہندوستان کو نہایت احسن انداز میں سمجھ گئے تھے۔ اور وہ کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے مسلسل اور متعدد ملاقاتوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ کہ جو متانت، صداقت، ہمت اور راست بازی قائداعظم محمد علی جناح میں ہے وہ کسی بھی ہندو لیڈر میں نہیں۔ گاندھی کو انڈین نیشنل کانگرس کی اگرچہ زبردست حمایت حاصل تھی۔ لیکن جس انداز سے مسلم قوم نے قائداعظم پر اعتماد کیا تھا۔ اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اپنے ساڑھے سات سالہ قیام میں لارڈ لنلتھگو صرف قائداعظم کی ذات سے متاثر ہوئے کیونکہ وائسرائے کے خیال میں جس نفاست اور کشادہ دلی کے ساتھ ان کے سامنے سیاسی مسائل پر بحثیں ہوتی رہی وہ انداز کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ قائداعظم کی شخصیت ہی نے لارڈ لنلتھگو کو مجبور کیا کہ وہ بیک وقت دونوں لیڈروں کو بلا کر مسائل ہندوستان پر گفتگو کرے۔ وائسرائے کی اس توجہ کی بنا پر گاندھی میں حاسدانہ عناصر پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن صداقت کو وہ کہاں چھپا سکتے تھے۔ گاندھی نے لارڈ لنلتھگو کی رائے کو قائداعظم کے خلاف کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن خجالت کے سوا اور کچھ نصیب نہ ہوا۔ وائسرائے کو پتہ چل چکا تھا کہ کانگرس اچھا دوست ثابت نہیں ہوتی جو مصیبت کے وقت دستگیری کرے اس کے برعکس

Marfat.com

کانگرس نے انگریز کو جنگ کے زمانے میں ہی بلیک میل ہی کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس نے کانگرس کے اس اقدام کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور کانگرس کے تمام سربرآوردہ لوگوں کو لمبی قید کاٹنے کے لیے جیلوں میں ٹھونس دیا۔ خود مسٹر گاندھی کو دو سال تک جیل میں رکھا گیا۔ ان کی اس زندانی زندگی میں دنیا کی سیاست اور جنگ کی پوزیشن کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اتحادی فوجیں نہ صرف نازیوں کے حملوں کو روکنے میں کامیاب ہوگئیں تھیں۔ بلکہ اپنے کھوئے ہوئے علاقوں اور وقار کو تیزی سے حاصل کر رہی تھیں۔

ہندوستان میں لارڈ لنلتھگو کی جگہ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں فیلڈ مارشل لارڈ ویول کو وائسرائے ہند مقرر کر کے بھیجا گیا۔ لارڈ ویول ہندوستان کی سیاست سے بخوبی آگاہ تھے۔ ایک فوجی ہونے کی حیثیت سے انہیں یہ خوب اندازہ تھا کہ متحدہ ہندوستان انگریزوں کی کس قدر زیادہ مدد کر سکتا ہے بہ نسبت ایک منقسم ملک کے انہوں نے ۱۷ ار فروری ۱۹۴۴ء کو مرکزی مجلس قانون ساز کو خطاب کرتے ہوئے کہا "آپ جغرافیہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ ہندوستان ایک قدرتی وحدت ہے"۔

مسٹر ویول کا یہ بیان بظاہر کانگرس کی پوری پوری حمایت پر مبنی تھا اور یہ احساس ہونے لگا کہ نئے وائسرائے اپنے مطلب کے حصول کے لیے اب یکطرفہ ہو کر اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ قائداعظم نے اس کے جواب میں کہہ دیا۔

"لارڈ ویول کانگرس کے سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہے ہیں"۔

قائداعظم کے یہ الفاظ لارڈ ویول کے کان کھولنے کے لئے کافی تھے۔ لارڈ ویول کو پتہ چل گیا کہ مسٹر جناح بدلے ہوئے حالات میں بھی اپنے موقف پر اچھی طرح قائم ہیں۔

اس دوران کانگرس کے بیشتر لیڈر جیل میں تھے۔ مسٹر گاندھی نے جیل سے نکلنے کے لیے بہت سے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ کبھی اپنی گرفتاری کے خلاف مظاہرے کرائے۔ کبھی دوسرے لیڈروں کو انگریزوں کے پیچھے ڈالا کہ مہاتما جی کو رہا کر دیا جائے اور کبھی خود مہاتما نے جیل کے اندر بھوک ہڑتال کی دھمکیاں دیں۔ بلکہ ۱۰ ار فروری ۱۹۴۳ء کو انہوں نے اکیس روزہ برت شروع کر ہی دیا۔ بھلا ان باتوں سے حکومت پر کیا اثر ہوتا تھا۔ حکومت کو پرامن مذاکرات کے لیے صاف ستھری فضا کی ضرورت تھی جسے کانگرس نے بے حد مکدر کر دیا ہوا تھا۔ حکومت نے جیل میں گاندھی جی کی ملاقات پر سختی سے پابندی لگا دی ہوئی تھی۔ اور احکام جاری کیے تھے کہ وائسرائے کی اجازت کے بغیر

Marfat.com

کوئی شخص ان سے مل نہیں سکتا۔

مدراس کی برطرف شدہ اسمبلی کے رکن مسٹر راجگوپال اچاریہ جن کا شمار کانگرس کے نیتاؤں میں ہوتا تھا، حالات کو سمجھ گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وائسرائے سے اجازت حاصل کر کے مسٹر گاندھی کے ساتھ جیل میں بات چیت کر کے ان پر یہ حقیقت واضح کریں گے کہ آپ کے جیل میں رہنے کے دوران مسلم لیگ اس قدر آگے فاصلہ طے کر گئی ہے کہ اب اس سے مذاکرات کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس سے مذاکرات شروع کر دینے چاہئیں۔ تاکہ سیاسی مسائل کا حل جلد ہو جائے گاندھی سے ملاقات کے بعد راجگوپال اچاریہ نے قائد اعظم کو خط لکھا کہ مسٹر گاندھی آپ سے مل کر مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر قائد اعظم نے جواب دیا کہ اگر ان کی یہی خواہش ہے تو وہ براہ راست کیوں مجھے خط نہیں لکھتے۔ اس پر براہ راست جو مراسلہ قائد اعظم کے نام ارسال کیا اس میں صرف اتنا لکھ بھیجا۔

" میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں "

خط کا یہ مضمون بہت مختصر اور مبہم تھا۔ کب ملنا چاہتے ہیں۔ کس لئے ملنا چاہتے ہیں۔ موضوع گفتگو کیا ہوگا۔ قائد اعظم نے انہیں پیغام بھیجوا دیا کہ مل لیجیے۔ لیکن یہ کوئی تسلی بخش بات نہیں تھی۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ نے قائد اعظم سے مل کر بتایا تھا کہ ایک فارمولا تیار کیا گیا ہے جس پر دونوں جماعتوں کو غور کرنا ہوگا۔ قائد اعظم نے کہا کہ اگر یہ فارمولا مسٹر گاندھی کی وساطت سے مجھے پہنچے گا تو میں اس کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے منظوری کے لئے پیش کر دوں گا اور اگر اس میں کوئی ایسی بات نہ ہوئی تو اس کو منظور کر لینے میں کیا ہرج ہوگا۔

۶ مئی ۱۹۴۴ء کو مسٹر گاندھی کو صحت کی خرابی کی بنا پر جیل سے رہا کر دیا گیا۔ باہر آکر اس نے آسمان کا رنگ بھی بدلا بدلا پایا۔ اپنا راستہ ہموار کرنے کے لیے اسی منافقانہ عجز و نیاز کے ساتھ وائسرائے سے مراسلت شروع کر دی۔ ۱۷ جون کو مسٹر گاندھی نے لارڈ ویول کو لکھا کہ اسے ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے ملنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ مستقبل کا پروگرام مرتب کر سکیں۔ لیکن وائسرائے نے انکار کر دیا۔ پھر ۲۷ جولائی کو مسٹر گاندھی نے ایک اور مراسلے میں مسٹر ویول کو تحریر کیا۔

" اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان فوری طور پر کر دیا جائے اور مرکزی حکومت جواب دہ قومی حکومت قائم کر دی جائے اس شرط کے ساتھ کہ دفاعی اختیارات وائسرائے اور کمانڈر

Marfat.com

ایجیف کے پاس حسب سابق حاصل رہیں، تو وہ کانگرس کو سول نافرمانی کی تحریک سے باز رکھ سکتے ہیں اور اسے حکومت کے ساتھ تعاون کی ہدایت کر سکتے ہیں۔"

گاندھی کا یہ خط ایک سیاسی قلابازی کے مترادف تھا۔ تحریک سول نافرمانی کو تو حکومت پہلے ہی کچل چکی تھی۔ اور جنگ کا پانسہ اتحادیوں کے حق میں پلٹ چکا تھا۔ انگریز اپنے پاؤں پر اچھی طرح سنبھل چکا تھا۔ چنانچہ لارڈ ویول نے ۱۵ راگست ۱۹۴۴ء کو مہاتما جی کو بڑے واضح الفاظ میں جواب دیا جس میں اس نے کہا۔

"یہ وہی تجاویز ہیں۔ جو اپریل ۱۹۴۲ء میں کانگرس نے کرپس مشن کے سامنے پیش کی تھیں۔ اور حکومت نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔ چونکہ ان میں کوئی نئی بات نہیں لکھی گئی۔ اس لیے حکومت اس تجویز کو مسترد کرتی ہے اس کے علاوہ یہ تجویز نئے دستور کی متقاضی ہے۔ اور نیا دستور اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک ہندوستان کی ریاستیں بھی تمام اہم مسائل پر سمجھوتہ نہ کر لیں اور نئے دستور کی تشکیل بدوران جنگ ناممکن ہے"

وائسرائے کا یہ جواب مسٹر گاندھی کی بالا بالا چالوں کو فیل کرنے میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ کیونکہ مسٹر گاندھی کا خیال تھا کہ جیل سے نکل کر وہ پھر اپنے لیے ایسی فضا تیار کریں گے جس سے نہ صرف عوام بلکہ خواص میں ان کی ہاں میں ہاں ملائی جائے گی۔ لیکن اسے معلوم ہو گیا کہ شیر ہندوستان اب اپنی پوری جولانی کے ساتھ میدان سیاست میں سینہ تانے ہر قسم کے مقابلے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ کیونکہ قائد اعظم راجگوپال اچاریہ کے ساتھ گفتگو کے دوران اس حقیقت کو پا گئے تھے۔ کہ کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ ہمگام ہوئے بغیر ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ قائد اعظم نے مسٹر گاندھی کے سامنے اس فارمولے پر تفصیل سے بات چیت کی۔ جو راجگوپال اچاریہ نے تیار کیا تھا۔ مسلمانوں کو فریب دینے والا یہ فارمولا اگرچہ بظاہر بہت سے مسلمانوں کی افادیت کا حصہ ملا تھا۔ لیکن اس میں خلوص عمل کا ایک ذرہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو کانگرس کی ایک چال تھی۔ جس کے تحت وہ مسلم لیگ کو انگلی لگانا چاہتے تھے۔
کانگرس نے یہ فارمولا بڑی محنت سے تیار کیا تھا جس پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ اس فارمولے کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کے مطالعے سے پتہ چل سکے کہ کانگرس کس قدر کشادہ دلی اور عجز و انکسار کے ساتھ مسلم لیگ کے دوش بدوش چلنا چاہتی ہے۔

Marfat.com

انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتے کی شرائط کی یہ وہ بنیاد ہے جس پر گاندھی جی اور مسٹر جناح نے اتفاق کیا۔ اور اس کے لیے کوشش کریں گے کہ کانگرس اور مسلم لیگ اس کو منظور کرائیں۔

۱۔ آزاد ہندوستان کے دستور کے مطابق مندرجہ ذیل شرائط کے تحت مسلم لیگ ہندوستان کے مطالبہ کامل آزادی کی تصدیق کرتی ہے۔ اور عبوری دور کے لئے عبوری حکومت قائم کرنے میں کانگرس کے ساتھ تعاون کرے گی۔

۲۔ جنگ ختم ہونے کے بعد شمالی اور مشرقی ہند میں ان متصلہ اضلاع کے تعین اور حد بندی کے لئے جن میں مسلمانوں کو مطلق اکثریت ہے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ ان علاقوں میں جن کی اس طرح حد بندی ہو جائے گی۔ تمام بالغوں کی رائے سے یا کسی دوسرے قابل عمل طریقہ رائے دہندگی کی بنا پر استصواب رائے کرایا جائے گا۔ جس سے اس کا آخری فیصلہ ہو گا۔ کہ ہندوستان سے الگ ہو جائیں۔ اگر اکثریت یہ فیصلہ کرے کہ با اختیار ریاست ہندوستان الگ قائم ہو۔ تو یہ فیصلہ نافذ کیا جائے گا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ سرحدی اضلاع کو یہ حق حاصل رہے گا کہ دونوں میں سے جس ریاست کے ساتھ چاہیں الحاق کریں۔

۳۔ تمام پارٹیوں کو اس کی اجازت ہوگی کہ استصواب رائے عامہ سے قبل اپنے خیال کی تائید میں تبلیغ و اشاعت کریں۔

۴۔ جدائی کی صورت میں (دونوں ریاستوں کے درمیان) اس کے لئے باہمی معاہدہ ہو گا کہ دفاع، تجارت، مواصلات اور دوسرے مقاصد کا تحفظ ہو جائے۔

۵۔ آبادیوں کا انتقال بالکل برضا و رغبت ہو گا۔

۶۔ یہ شرائط صرف اس صورت میں قابل پابندی ہوں گی۔ کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کی حکومت کا اختیار اور ذمہ داری پورے طور پر منتقل کر دے۔

(منقول از پاکستان ناگزیر تھا)

یہ فارمولا بظاہر بہت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ لیکن قانونی نکتہ نظر سے اس سے زیادہ مبہم اور بعد میں مصائب میں مبتلا کرنے والے فارمولے سے بڑھ کر کوئی فارمولا تھا ہی نہیں۔ اس لئے کہ

۱۔ آزاد ہندوستان میں مسلم لیگ کو کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کہہ دیا گیا لیکن یہ نہ بتایا گیا کہ تعاون کی صورت میں کس تناسب سے مسلم لیگ کو نمائندگی حاصل ہوگی یہ بات

Marfat.com

بیں جھگڑا ڈالنے والی بات تھی۔

۲ - جنگ بند ہو جانے کے بعد حد بندی کمیشن مقرر ہو جانے کے بعد بھی یہ نرمی روا رکھی گئی کہ سرحدی اضلاع جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ اتنے بڑے ملک کی اتنی بڑی سرحد کے اتنے زیادہ اضلاع کو اپنی مرضی پر چھوڑنا دراصل کانگرس کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے مترادف تھا۔

۳ - جب حد بندی ہی کر دینا مطلوب تھا تو پھر استصواب کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر استصواب ہی کو ضروری خیال کرنا تھا تو حد بندی بھی استصواب سے ہو جانا چاہیئے تھی۔ پھر استصواب کرانے کے لیے بند و بست کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ وقت کا تعین نہ تھا اور اصول استصواب ذریب نہیں تھے یہ محض اس لیئے تھا کہ "استصواب کرائے جائیں گے" کہتے کرتے وقت گذار دیا جائے گا اور اسی اثنا میں کانگرس فضا کو اپنے موافق ہموار کرے گی (کشمیر کے معاملہ میں ہندوستان نے واقعی ایسا کر کے بھی دکھا دیا)

۴ - جب دو خود مختار ریاستیں تشکیل پذیر ہو ہی جائیں گی اور وہ محض اس بنیاد پر ہوں گی کہ وہ ایک دوسرے سے مکمل علیحدگی چاہتی ہیں۔ تو پھر دفاع۔ تجارت۔ مواصلات اور دوسرے مقاصد کے تحفظ کے لیے باہمی معاہدے کی پابندی کیوں؟

چنانچہ یہ سب باتیں تھیں جو قائداعظم کے ذہن میں آئیں اور انہوں نے اس فارمولے سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۴۴ء کو مسٹر گاندھی نے قائداعظم کو گجراتی زبان میں ایک خط لکھا اس خط کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلے گا کہ گاندھی نے کس قدر جلدی ایک نیا روپ دھارا یہ دشمنِ اسلام اور قاتل مسلمین کس قدر انکساری کے ساتھ تحریر کرتا ہے۔

از پنچگنی

۱۷ر جولائی ۱۹۴۴ء

بھائی جناح!

کبھی وہ دن تھا کہ میں آپ کو اس بات پر آمادہ کر سکتا تھا کہ مادری زبان (گجراتی) میں باتیں کریں۔ آج میں اسی زبان میں خط لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کو اس وقت ملنے کی دعوت دی تھی۔ جب میں جیل میں تھا۔ جب سے میں رہا ہوا ہوں، میں نے آپ کو خط نہیں لکھا لیکن آج میرا دل کہتا ہے کہ مجھے چاہیئے کہ آپ کو لکھوں۔ آپ جب چاہیں ہم ملیں گے۔ مجھے آپ اسلام

Marfat.com

اور اس ملک کے مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھئے۔ صرف آپ کا نہیں بلکہ میں ساری دنیا کا دوست اور خادم ہوں۔ ساتھ ہی میں اس خط کا اردو ترجمہ بھی ملفوف کر رہا ہوں۔

آپ کا بھائی

گاندھی

کیا یہ خط منافقت کی اعلیٰ ترین مثال نہیں جو مسٹر گاندھی نے قائداعظم کے سامنے پیش کی؟

بہرحال اس خط نے براہِ راست اور بالمشافہ گفتگو کا ایک سلسلہ پیدا کر دیا۔ قائداعظم اور مسٹر گاندھی کے درمیان ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ شروع شروع میں اس قدر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی کہ گفتگو کے منقطع ہو جانے کا اندیشہ بھی محسوس ہونے لگا۔ قائداعظم ایک قانون دان تھے۔ اور کوئی کام قومی سطح پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کئے بغیر یا آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی اجازت کے بغیر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ۳۰ جولائی کو قائداعظم نے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے باقاعدہ اجازت لی کہ وہ مسٹر گاندھی سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء سے لے کر ۲۷ ستمبر ۱۹۴۴ء تک قائداعظم اور مسٹر گاندھی کے درمیان متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی مسٹر گاندھی قائداعظم کے پاس آ جاتے کبھی قائداعظم مسٹر گاندھی کے پاس چلے جاتے۔ اس ساری گفتگو کی بنیاد دراصل وہ فارمولا تھا جو راجگوپال اچاریہ نے تیار کیا تھا۔

نتیجہ :-

اس طویل گفتگو کا ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ مسٹر گاندھی تقسیم ہند کے لیے راضی ہو گئے اور مسلم لیگ کے مطالبے کی وہ مخصوص شکل ظاہر ہو گئی۔ جس پر مسلم لیگ ابھی تک تعریف کئے بغیر اصرار کر رہی تھی۔ دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مسلم لیگ ایک نمائندہ جماعت ہے اور قائداعظم اس کے مسلمہ لیڈر ہیں مسلم لیگ کے وقار کو چار چاند لگ گئے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ سیاست ہندوستان میں جو تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ اس میں پھر سے جولانی پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے پورے زور شور سے اپنے اپنے مطالبات منوانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔

Marfat.com

شملہ کانفرنس

۱۹۴۵ء

سوال :۔ لارڈ ویول کی آمد کے بعد ہندوستان کی سیاست ایک نئے دور میں داخل ہوئی ۔ مسٹر گاندھی اور قائداعظم کے درمیان تفصیلی گفتگو کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ شانہ بشانہ چلنے کے لیے تیار ہو گیئں۔

بعد ازاں شملہ میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مختلف مسائل پر تفصیلی بحث کی گئی۔ اس کانفرنس کا جائزہ پیش کریں ؟

جواب :۔ کانگرس ہمیشہ سے مسلم لیگ کو ایک نہایت معمولی اہمیت اور کم اہلیت والی جماعت خیال کرتی رہی ۔ مسٹر گاندھی کی اس کے ساتھ ہمہ تن یہ کوشش رہی کہ اس جماعت کو جس طرح ہو سکے اور جس قدر جلدی ہو سکے ، بالکل فیل کر دیا جائے اور اس کے لیے اس نے کانگرس میں مسلمانوں کی کثرت سے شمولیت کو دلیل بھی بنایا ۔ لیکن ان کی چال زیادہ دیر تک کامیاب نہ ہو سکی اور قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر مسلم لیگی رہنماؤں کی تگ و دو کے پیش نظر انگریز کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ مسلمانوں کی اس روز افزوں تقویت یافتہ جماعت کو اس طرح تقسیم کرے کہ ملک کی تقسیم کے لیے اس کو ایک فعال حد تک شامل کیا جائے۔

لارڈ ویول نے اس حقیقت کو بانداز احسن جان لیا تھا کہ اس کو تسلیم بھی کر لیا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کی آزادی کی صورت میں پیش آنے والے مسائل کا جائزہ لیتے اور اس سلسلے

Marfat.com

میں اہم فیصلے کرنے کے لیے شملہ میں ایک کانفرنس بلائی۔ جس میں حکماً مسلم لیگ اور کانگرس کو دو یکساں اہمیت کی جماعتوں کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس سے پیشتر لارڈ ویول نے مسٹر گاندھی پر واضح کر دیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کو اسی احترام سے دیکھیں جس احترام کے قابل ایک، مخالفت جماعت ہوتی ہے۔ اور اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے ذرہ بھر انحراف نہ کریں۔

چنانچہ مسٹر گاندھی نے اس صورت حال کو با دلِ ناخواستہ قبول کر لیا اور قائداعظم سے بات چیت کرنے اور معاملات سلجھانے کے لیے افہام و تفہیم کے لیے تیار ہو گئے۔

۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول نے ایک تقریر شملہ کانفرنس کے لیے ۲۵/۶/۴۵ کا تعین کرتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی۔ جس میں ہندوستان کی آزادی کے لیے چند اہم تجاویز پیش کیں اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ ان تجاویز کی پیشکش سے فائدہ اٹھائیں۔ وائسرائے نے اعلان کیا کہ اگر یہ کانفرنس کامیاب ہو گئی تو مرکز میں ایک نئی کونسل مرتب کی جائے گی اور جن صوبوں میں دفعہ ۹۳ پر عمل ہو رہا ہے وہاں بھی وزارتیں دوبارہ بنا دی جائیں گی۔ اور حکومت کا کام صوبوں کے نمائندوں کو سونپ دیا جائے گا، اور یہ وزارتیں مخلوط نوعیت کی ہوں گی۔ اگر یہ کانفرنس ناکام ہوئی تو انگریزوں کو مجبوراً اسی طرح نظام حکومت چلانا پڑے گا۔ جس طرح اس وقت چلایا جا رہا ہے۔ تاوقتیکہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں ہمیں اس پر مطمئن نہ کر دیں کہ وہ مل جل کر کام کر کے مخصوص نتیجے پر پہنچ گئی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کے عوام کے امن کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

اس نشری تقریر کے بعد کانگرس کی صفوں میں زبردست بے چینی پیدا ہو گئی۔ مسٹر گاندھی نے لارڈ ویول کو اس تقریر کے سننے کے بعد اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بذریعہ تار کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ذاتی طور پر وائسرائے سے ملنے کی درخواست کی۔ مینور ولا (راج کماری امرت کور کا گھر) میں مسٹر گاندھی نے کانگرسی کارندوں کا اجلاس بلایا۔ ہندوستان کے ہندو اخبارات نے مسلم لیگ کے خلاف زبردست پراپیگنڈے شروع کر دیے اور جس مساوات کا تصور انگریز نے پیش کیا، اس کے خلاف ہندو پریس نے ایک فعال کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ شملہ کانفرنس میں چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ کو مساوات کے اصول پر مدعو کیا گیا ہے۔ اس لیے اس نظریہ مساوات کو ہر صورت میں ناکام بنا دیا جانا چاہیے۔

اس کانفرنس میں لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے اکیس لیڈروں کو

Marfat.com

دعوت دی جائے گی۔ جن میں صوبوں کی حکومتوں کے وزرائے اعلیٰ (ایسے وزرائے اعلیٰ بھی جو کانگرس کی وزارتوں کے مستعفی ہونے سے پہلے ان صوبوں کے وزرائے اعلیٰ تھے) مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کا لیڈر۔ مسلم لیگ پارٹی کا ڈپٹی لیڈر۔ نیشنلسٹ پارٹی اور یورپین گروپ کے لیڈر۔ قائد اعظم محمد علی جناح اور مسٹر گاندھی اور سکھوں اور پسماندہ اقوام کا ایک ایک نمائندہ شامل تھے۔

۲۴ جون کو وائسرائے لارڈ ویول نے قائد اعظم مسٹر گاندھی اور ابوالکلام آزاد سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی۔ قائد اعظم کو ہندوستان میں کانگرس کی سیاست اور حالات حاضرہ کے بارے میں جو شبہات تھے وہ انہوں نے وائسرائے سے بالتفصیل بیان کیے بالخصوص خضر حیات خاں ٹوانہ کی مسلم لیگ سے علیحدگی اور یونینسٹ پارٹی کی قیادت اور انہیں کانگرس اور انگریز کی محض اس لیے حمایت کا حاصل ہوتا کہ وہ سب مل کر نظریۂ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے انہیں آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے مسائل تھے جن کا علم وائسرائے کو ہونا لازمی تھا۔ قائد اعظم نے یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ چھوٹی اقلیتیں چونکہ ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ ووٹ دیں گی۔ اور اس وجہ سے مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے، اس لیے جب بھی ایک علیحدہ مسلم حکومت کے بارے میں ووٹنگ کی ضرورت محسوس ہو تو اس صورت میں مسئلے کو ووٹنگ کے ذریعے حل نہ کیا جائے۔

کانفرنس کا انعقاد :- یہ کانفرنس ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو صبح گیارہ بجے شملہ وائسرائیگل لاج میں شروع ہوئی۔ وائسرائے نے ایک طویل تقریر کی۔ اس تقریر کے ساتھ ہی کانفرنس کا پہلا اجلاس ختم ہو گیا۔ اسی روز دن کے اڑھائی بجے پھر اجلاس شروع ہوا۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بطور صدر کانگرس شرکت کی۔

کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ "میں اس سے واقف ہوں کہ موجودہ تجاویز عبوری تصفیے کے لیے ہیں۔ مگر کانگرس کے لئے نشوونما کے لیے مضر ثابت ہو، یا جو براہ راست یا بالواسطہ اس کو اگر فرقہ وارانہ انجمن کی سطح پر لے آئے۔ قائد اعظم نے بھی ایک جامع تقریر فرمائی اور ابوالکلام آزاد کی تقریر پر وائسرائے سے تشریحات طلب کیں۔ انہوں نے واضح الفاظ میں فرمایا۔ کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی نیابت کرتی ہے۔"

اس تقریر نے ڈاکٹر خانصاحب کو جو اس وقت مدعوین میں شامل تھے۔ زبردست

Marfat.com

سپنچ پاکر دیا، اور بولے کہ ہم مسلمان ہیں لیکن ہم کانگرس میں ہیں۔ وائسرائے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کانگرس اپنے ارکان کی نیابت کرتی ہے۔

۲۷ رجون کو اس کانفرنس کا پھر ایک اجلاس ہوا، جو صرف ایک گھنٹے تک جاری رہنے کے بعد اس غرض سے ملتوی ہو گیا کہ قائد اعظم محمد علی جناح اور پنڈت گووندولبھ پنت مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان سمجھوتے کرنے کے لیے باہم گفتگو کر کے راہ ہموار کریں۔ اسی دن شام کے وقت قائد اعظم نے وائسرائے سے ملاقات کی اور اسے واضح طور پر بتا دیا کہ وہ اس پر رضامند نہیں ہیں کہ ایگزیکٹو کونسل میں کوئی ایسا مسلمان نامزد کیا جائے جو مسلم لیگ کی طرف سے نہ ہو البتہ وہ اس بات کا خیر مقدم کریں گے۔ کہ خود وائسرائے جو فارمولا مناسب خیال کریں اسے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کر دیا جائے۔

۲۷ رجون کے اجلاس کے بعد قائد اعظم اور گووندولبھ پنتھ کے درمیان ہونے والی بات چیت ناکام ہو گئی۔ اور ۲۹ رجون کو اس امر کی اطلاع وائسرائے کو بھی دی گئی۔

کانفرنس کا چوتھا اجلاس ۲۹ رجون ۱۹۴۵ء کو ہوا۔ جس میں وائسرائے نے طے کیا کہ تمام پارٹیوں سے ایگزیکٹو کونسل کے لیے نام طلب کیے جائیں، جن کا ایک پینل بنایا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ کانفرنس ملتوی ہو گئی اور پارٹیز ایگزیکٹو کونسل میں نامزدگی کے لیے تمام سیاسی راہنما سرگرم عمل ہوئے۔

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت ۳ رجولائی کو منعقد ہوا جس میں وائسرائے کو بھیجنے کے لیے مطلوبہ ناموں کی فہرست تیار کرنے پر غور کیا گیا ۵ رجولائی کو مولانا آزاد نے سہ پہر کے وقت ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ مطلوبہ ناموں کی فہرست تیار کر لی گئی ہے اور وہ کل وائسرائے کو ارسال کر دی جائے گی۔ چنانچہ ۶ رجولائی کو کانگرس نے وائسرائے کو ناموں کا پینل روانہ کر دیا۔

۷ رجولائی تک مسلم لیگ کے سوا تمام مدعو سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے پینل وائسرائے کو ارسال کر دیئے اور مسلم لیگ کی طرف سے ناموں کی فہرست بھیجے جانے کی بجائے وائسرائے کو قائد اعظم نے ایک خط لکھا۔ جس میں مندرجہ ذیل دو امور کی طرف وائسرائے کی توجہ مبذول کرائی گئی۔

۱۔ کیا وائسرائے تمام مسلم ارکان کے تقرر کے بارے میں مسلم لیگ کے حق کو تسلیم کرتے کے

Marfat.com

لیے تیار رہیں؟

۲۔ دوسری اقلیتوں کو جو نمائندگی دی جائے گی اس کی نوعیت کیا ہوگی۔

۹۔ جولائی ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے قائد اعظم کو تحریری طور پر آگاہ کیا کہ انہیں یہ منظور نہیں کہ ایگزیکٹو کونسل کے تمام ارکان مسلم لیگ سے ہی لیے جائیں گے جس پر قائد اعظم نے اسی روز وائسرائے کو لکھ بھیجا کہ ایسی صورت میں مسلم لیگ کی طرف سے مجوزہ ایگزیکٹو کونسل میں شرکت کے لیے ناموں کی فہرست ارسال کرنا فضول ہے۔ کیونکہ ہم اپنے بنیادی اصولوں کو ہرگز ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔

قائد اعظم کے اس خط کے بعد وائسرائے نے انہیں اطلاع دی کہ پانچ مسلم ارکان میں سے مسلم لیگ کے چار ارکان کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور پانچواں رکن اگرچہ ہوگا مسلمان ہی لیکن اس کا تعلق مسلم لیگ سے نہیں بلکہ کسی اور جماعت سے ہوگا۔

لیکن قائد اعظم دو باتوں پر مُصر تھے:۔

۱۔ کونسل کے تمام پانچواں ارکان مسلم لیگ سے ہی لئے جائیں۔

۲۔ گورنر جنرل کے اختیار امتناع کو کونسل کے اندر مسلمانوں کے لیے خاص تحفظ کے ذریعے سے قوت دی جائے۔

کانفرنس کی ناکامی:۔

وائسرائے نے ان شرائط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ ۱۴ر جولائی ۱۹۴۵ء کو ملتوی شدہ کانفرنس کا آخری اجلاس طلب کیا گیا۔ جس میں لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ!

"مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کانفرنس کامیاب نہیں ہوسکی اس کانفرنس کے انعقاد کا خیال ہی میرے ذہن میں ہی پیدا ہوا تھا۔ اور مجھے امید تھی کہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو کسی ایک مناسب لائحہ عمل کے لیے تیار کر لیا جائے گا لیکن میں اس میں کامیاب نہیں ہوسکا، اس لیے اس کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری بھی مجھ ہی پر عائد ہوتی ہے۔

کانفرنس کی ناکامی کے اعلان کے ساتھ یہ کانفرنس ختم ہوگئی۔

Marfat.com

اس کانفرنس کی ناکامی کے اعلان کے بعد متعدد سیاسی لیڈروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، جن میں قائداعظم محمد علی جناح کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد ـ راجہ جی ـ اور ملک خضر حیات ٹوانہ جیسے لیڈروں کے اسماء قابل ذکر ہیں ـ

مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر میں انگریز کے رویے پر اطمینان ـ راجہ جی کے بیان میں مسلم لیگ کی واضح مخالفت ـ اور ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کے بیان میں انگریز کی خوشامد کے اثرات واضح طور پر پائے جاتے تھے ـ

اس کے برعکس قائداعظم محمد علی جناحؒ نے وہاں بھی اپنے اصول کو بلا خوف و خطر ڈٹ کر پیش کیا ـ

Marfat.com

عام انتخابات

سوال:۔ ہندوستان کے عام انتخابات کن حالات میں ہوئے اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ تفصیل سے بیان کیجیے؟

جواب:۔ ہندوستان بھر میں کانگرس کے شر انگیز پروپیگنڈا کے باوجود مسلم لیگ دن بدن ترقی کی راہوں پر گامزن تھی اور روز بروز اس کی منزل نزدیک تر آتی جا رہی تھی۔ شملہ کانفرنس میں قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا، اور جس جرأت، اور استقلال سے اس پر ڈٹے رہے اس سے مسلمانانِ ہند میں جذبہ وعزم کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی کانگرس جو خود کو پورے ہندوستان کی نمائندہ جماعت قرار دیتی تھی کے تمام پول کھل چکے تھے اور انگریز کو ہمت نہ پڑی کہ قائداعظم کے بے باکانہ جوابات پر خود اپنا فیصلہ مسلط کر سکے۔

اگرچہ بعد کی تفصیلات میں اس امر کا انکشاف ہوا تھا کہ لارڈ ویول نے قائداعظم کے انکار کی صورت میں اپنا فیصلہ مسلط کرنے کے لیے پانچ مسلمان ارکان کی فہرست تیار کی ہوئی تھی لیکن مسلم لیگ کی مقبولیت کو دیکھ کر وہ اپنے فیصلے کا بروقت اظہار بھی نہ کر سکے۔

جنگِ عظیم دوم مئی ۱۹۴۵ء میں اتحادیوں کے حق میں فتح کی صورت میں ختم ہو گئی تھی۔ اور انگریز کو اب ان وعدوں کا پاس بھی تھا جو اس نے جنگ شروع ہوتے ہی مسلمانانِ ہند کے ساتھ کیے تھے۔ علاوہ ازیں انگلستان میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی تھی، جو پہلے ہی ہندوستان کے مسائل کو یہاں کے باشندوں کی استصواب رائے کے تحت حل کرنے کے حق میں تھی۔ ان حالات کے پیش نظر مسلم لیگ نے شملہ ہی میں اپنی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جو ماہ جولائی میں ہوا۔ عام انتخابات کرانے کا مطالبہ حکومت کے سامنے پیش کر دیا۔ ورکنگ کمیٹی نے اعلان کیا کہ یہ انتخابات اس لیے بھی ضروری ہیں کہ ہندوستان میں کانگرس کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ انگریز کو مسلم لیگ کی ماہیت کا اندازہ بخوبی ہو چکا تھا۔ ادھر بین الاقوامی جنگ میں جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ کیونکہ وہ ۱۵ راگست ۱۹۴۵ء جیسی ایٹمی تباہی

Marfat.com

کے دوبارہ تماشا کرنے کا متحمل نہ تھا۔ جاپان کی تباہی اور جرمنی کی بدحالی ان کی ایسی شکست پر منتج ہوئی کہ اب اتحادیوں کو آئندہ عرصہ دراز تک کسی قسم کے فوجی حملے کا خطرہ نہ رہا۔

اب انگریز چاروں طرف سے مطمئن تھا۔ چنانچہ ۲۱ راگست ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ آئندہ موسم سرما میں عام انتخابات ہوں گے۔ ایک نئی مجلس دستور ساز قائم کی جائے گی اور نئی ایگزیکٹو کونسل وجود میں آئے گی۔

وائسرائے کے اس اعلان نے پورے ہندوستان میں تلاطم برپا کر دیا۔ کانگرس نے ایک بار پھر مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کے لیے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں اور مسلم لیگ کے خلاف زبردست پروپیگنڈا ہر محاذ پر شروع کر دیا۔ خود ان جماعتوں میں افتراق پیدا کرنے کی کوشش کی جنہوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ ان میں سے ہندوستان میں متعدد رہنماؤں نے واضح طور پر مسلم لیگ کے حق میں اعلان کر دیا۔ اب کانگرس کے افراد شرمندگی کا جامہ پھاڑ کر دوسرے ہتھیاروں پر اتر آئے تاہم مسلم لیگ نے تو پروان چڑھنا ہی تھا۔ وہ دن بدن ترقی کے راستوں پر گامزن رہی۔

قائد اعظم کو بھی اس مرتبہ احساس تھا کہ ان انتخابات میں مسلم لیگ کا اکثریت سے کامیاب ہونا اتنا ہی لازم ہے۔ جس قدر ان کی زندگی کے لیے روح کا موجود ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلم اکثریت رکھنے والے صوبوں میں مسلم لیگ کو ہر صورت میں کامیاب کرائیں گے۔ انتخابی مہم پر روپیہ تو پانی کی طرح بہتا ہے لیکن بدقسمتی سے اس جماعت کے پاس اخراجات برداشت کرنے کے لیے رقم نہ تھی اور نہ ہی کوئی ایسے واضح ذرائع تھے جن سے اس رقم کا حصول ہو سکتا تاہم جواں ہمت قائد اعظم نے اپنے عزم واستقلال کو متزلزل نہ ہونے دیا۔ انہوں نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ "برادران اسلام! آپ مجھے چاندی کی گولیاں دیں میں آپ کے لیے جنگ لڑوں گا۔ اور اس طرح مسلم لیگ کے لیے چندے کا آغاز ہوا۔

مرکزی انتخابات:۔ سب سے پہلے مرکزی انتخابات ہوئے جو دسمبر ۱۹۴۵ء میں منعقد ہوئے اس کے لیے مسلم نشستوں کی تعداد ۳۰ تھی جو سب کی سب مسلم لیگ نے ہی جیت لیں۔ کانگرس کے لیے مسلم لیگ کی سو فیصد کامیابی زبردست حسد و حزن کا باعث تھی۔ مرکزی انتخابات میں مسلم لیگ کو ۳۰ میں سے ۳۰ اور کانگرس کو ۶۲ میں سے ۵۷ نشستیں ملیں۔ بقیہ ۵ نشستوں کو مندرجہ ذیل جماعتوں نے جیتا: (۱) آزاد امیدوار = ۵ (۲) اکالی سکھ = ۲ (۳) یورپین = ۸

صوبائی انتخابات:- صوبائی انتخابات جنوری ۱۹۴۲ء میں انعقاد پذیر ہوئے۔ ان انتخابات میں صوبہ سرحد کے علاوہ ہر صوبہ میں مسلم لیگ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کو ۹۰ فیصدی نشستیں حاصل ہو گیئں۔ صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں کے نتائج کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

صوبہ	کل مسلم حلقے	مسلم لیگی امیدوار
سرحد	۳۸	۱۷
پنجاب	۸۶	۷۵
سندھ	۳۵	۲۸
بنگال	۱۱۹	۱۱۳
آسام	۳۴	۳۱
یوپی	۶۶	۵۵
بمبئی	۳۰	۳۰
مدارس	۲۹	۲۹
سی پی	۱۴	۱۴
بہار	۴۰	۳۴
اڑیسہ	۴	۴
کل	۴۹۵	۴۳۰

اس طرح پورے ہندوستان میں ۴۹۵ مسلم نشستوں کے لیے ۴۳۰ مسلم لیگی امیدواروں کی کامیابی ایک بڑی زبردست جیت تھی۔ کانگرس کو آٹھ صوبوں جن میں آسام اور صوبہ سرحد بھی شامل تھا۔ نمایاں کامیابی نصیب ہوئی صوبہ آسام اور صوبہ سرحد میں چونکہ کچھ مسلم نشستیں کانگرس کو چلی گئی تھیں۔ اس لئے کانگرس نے وہاں مخلوط وزارت کی پیش کش کی جسے مسلم لیگ نے ٹھکرا دیا اور وہاں خالص کانگرسی حکومتیں ہی وجود میں آئیں۔

وزارتوں کی تشکیل:- عام انتخابات مکمل ہونے کے بعد مختلف صوبوں میں وزارتوں کی تشکیل ایک لازمی امر تھا۔ جن صوبوں میں کانگرس کو واضح اکثریت حاصل ہوئی

Marfat.com

تھی۔ وہاں کانگرس نے اور جہاں مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل ہوئی وہاں مسلم لیگ کو وزارت بنانا تھی۔ لیکن کانگرس کی مکاری اور انگریز کی چالبازی نے اپنا کام کر دکھایا اور اس انداز سے چکر چلایا۔ کہ پنجاب جیسے واضح مسلم لیگی اکثریت حاصل کرنے والے صوبے میں یونینسٹ حکومت کرنل خضر حیات ٹوانہ کی وزارت اعلیٰ میں قائم ہوگئی۔ سندھ میں ۳۵ مسلم نشستوں میں سے ۲۸ پر مسلم لیگ کا قبضہ تھا۔ لیکن جی۔ ایم۔ سید جو مسلم لیگ کی ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے اپنے چار ساتھیوں سمیت مسلم لیگ سے الگ ہوگئے۔ مسٹر جی۔ ایم۔ سید نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کرکے کانگرس کے ساتھ جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ ادھر وائسرائے نے مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دی لیکن سات نشستیں کانگرس کے پاس تھیں۔ اس لیے کانگرس کا ایک آدھ نمائندہ وزارت میں لیا جانا تھا۔ چنانچہ نامزد وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے کانگرس کو دو وزارتیں دینے کی پیشکش کی۔ لیکن جی۔ ایم۔ سید کے کہنے پر کانگرس نے عذر پیش کر دیا کہ تاوقتیکہ جی۔ ایم۔ سید کے ساتھ سیاسی سمجھوتہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک کانگرس سندھ کی حکومت کی تشکیل میں شامل نہیں ہوگی۔ مسلم لیگ اس بات پر رضامند نہ ہوئی۔ اس لیے وزارت سازی کا کام ملتوی ہوگیا۔ آئندہ دسمبر میں جب دوبارہ انتخابات ہوئے تو کانگرس کی رہی سہی نشستیں بھی جاتی رہیں اور سندھ کی تمام نشستوں پر مسلم لیگ کا قبضہ ہوگیا۔

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اس کی ۸۶ مسلم نشستوں میں سے ۷۵ مسلم لیگ کے پاس آگئی تھیں۔ جس سے مسلم نشستوں میں مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن پنجاب کی کل نشستیں ۱۷۵ تھیں۔ ان نشستوں کی جیت حسب ذیل تھی۔

مسلم لیگ	۷۵
کانگرس	۵۱
اکالی	۲۲
یونینسٹ پارٹی	۲۰
آزاد امیدوار	۷
کل	۱۷۵

یونینسٹ کے ۲۰ امیدواروں میں سے ۴ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور ۶ آزاد ہوگئے اب یونینسٹ کے پاس صرف دس نشستیں رہ گئیں۔ جن کی قیادت ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کر رہے تھے۔ گورنر پنجاب مسٹر گلینسی مسلم دشمن اور ہندو نواز شخص تھا۔ انتخابی اصول کے تحت اور نئے بنائے رویہ

Marfat.com

کے مطابق اس کا فرض تھا۔ کہ وہ اکثریتی جماعت کے لیڈر کو وزارت بنانے کی دعوت دیتا۔ لیکن گلینسی تعصب کی بنا پر برداشت نہ کرسکا۔ کہ پنجاب میں مسلم لیگ کا وزیرِ اعلیٰ ہو۔ چنانچہ اس نے نہایت فریب کاری سے کانگرس۔ اکالی۔ اور یونینسٹ پارٹی کو جوڑ کر ملک خضر حیات ٹوانہ کو وزارت بنانے کی دعوت دے دی۔ ملک خضر حیات ٹوانہ کو وزارت بنانے کی دعوت دے دی ملک خضر حیات خان ٹوانہ نے گورنر گلینسی کی خاص مہربانی کی بنا پر وزارت تو بنائی لیکن اس کا سُرور لینے کا وقت نصیب نہ ہوا۔ اس کی وزارت بنتے ہی پورا پنجاب ایک ہیجان انگیز تحریک کے زور شور میں گونج اٹھا اور یونینسٹ پارٹی کے خلاف زبردست مظاہرے شروع ہو گئے۔ خضر حیات خان اپنی پوزیشن کو خواہی نخواہی نکتہ نظر کے سامنے سمجھ گئے۔ اس لیے انہوں نے انگریز کی توقعات کے خلاف اور کانگرس کی تھپکی کے باوجود ایک ہی سال کے بعد اچانک وزارت عظمےٰ سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء کے انتخابات نے تحریک پاکستان کو جو تقویت دی اس کی مثال نہیں ملتی ان انتخابات نے ثابت کر دیا کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے لیے ایک الگ ملک حاصل کریں اور مسلمانوں ہند کو بار بار ہندوؤں کے ہتھکنڈوں اور انگریز کی مکاریوں کا بدہ اور نجربہ ہو چکا تھا۔ وہ مسٹر گاندھی کے ان الفاظ کو جو انہوں نے شملہ کانفرنس کے دوران لارڈ ولول کو مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے کے سلسلے میں کہے تھے کہ "مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کبھی کوئی سمجھوتہ ہو ہی نہیں سکتا"، کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اسی بنا پر مسلمانانِ ہند میں کوئی مسلم لیگی حصول پاکستان کے مطالبے کو تقویت دینے اور چراغ آزادی میں روغن ڈالے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

انتخابات کے نتائج مرتب و مکمل ہو جانے کے بعد اپریل ۱۹۴۶ء میں وزارتوں میں شامل ارکان نے حلف وفاداری اٹھائے۔ اور اسمبلیوں (مرکزی و صوبائی) کی کارروائیاں شروع ہوئیں۔ مسلم لیگی عہدہ داران ارکان اسمبلی نے جہاں اسمبلی کے رکن ہونے کا حلف اٹھایا۔ وہاں تحریک پاکستان کو تیز تر کرنے کا عزم صمیم کیا۔ اور قسم کھائی کہ وہ مسلم لیگ کے سب سے اہم منشور تشکیل پاکستان سے ذرہ بھر بھی ادھر سے ادھر نہ ہوں گے۔ اور پاکستان کے حصول کے لیے بھرپور کوشش کریں گے۔

Marfat.com

کابینہ مشن

۱۹۴۶ء

سوال: کابینہ مشن کی تشکیل کا مقصد کیا تھا۔ یہ کب ہندوستان میں آیا اور اس نے کیا تجاویز پیش کیں۔ یہ مشن کس حد تک کامیاب رہا۔ تفصیل سے تبصرہ کیجئے؟۔

جواب: ہندوستان میں انتخابات ہو چکے تھے۔ انگریز کو ہندو کے عوام کے خیالات اور رجحانات کا بخوبی علم تھا۔ انگریز کو جسے پہلے جنگ کرنے کے لیے مسائل درپیش تھے۔ اب جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ فوج کی ایک بھاری تعداد فاضل ہو گئی تھی۔ جسے واپس کر کے برطرف کرنا مقصود تھا۔ اور اس کے ساتھ اس فوج کے لیے متبادل وسائل روزگار مہیا کرنے تھے جنگ شروع ہوتے وقت ہندوستان سے کیے گئے وعدوں کے ایفاء کا بھی خیال تھا۔ یہ تمام باتیں انگریز کے لیے گہری فکر کا موجب تھیں۔ برطانیہ میں لارڈ اٹیلی وزارت عظمےٰ پر فائز ہو گئے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لیے تجاویز تیار کرنے اور ہندوستان کے سیاسی حالات کا قریب ترین جائزہ لینے کے لیے لارڈ اٹیلی نے برطانوی مرکزی سطح پر وزراء کا ایک مشن متعین کیا جس کا نام "کیبنٹ مشن" رکھا گیا۔ اس مشن کے تین ارکان تھے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ لارڈ پیتھیک لارنس وزیر ہند

۲۔ سر سٹیفورڈ کرپس صدر تجارت بورڈ

۳۔ اے۔ وی۔ الگزینڈر فرسٹ لارڈ آف نیوی۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو لارڈ اٹیلی نے برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں اقلیتوں کے حقوق کا پورا پورا احساس ہے اور اقلیتوں کو واقعی

Marfat.com

بلا خوف و خطر اور آزاد زندگی بسر کرنا چاہئے۔ لیکن کسی اقلیت کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اکثریت کی راہ ترقی میں حق استرداد کے روڑے اٹکائے۔"

اس تقریر کا جواب دو ہی روز کے بعد قائداعظم نے ہندوستان میں دیا۔ اور فرمایا کہ انگریز کا یہ خیال کہ اس برصغیر میں مسلمان ایسی اقلیت میں ہیں جو ان کی نظر میں سیاسی آزادی کے حصول کے لیے اکثریت کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ تو یہ انگریز کی بھول ہے۔ مسلمان قوم ایک ایسے ملک کے حصول کا مطالبہ کر رہی ہے۔ جس میں وہ بھاری اکثریت رکھتی ہے۔ اس کے برعکس کانگرس کے ارکان میں لارڈ اٹیلی کے اس بیان سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور کانگرس اس امر کو بھانپنے لگی کہ کابینہ کمیشن کو پہلے سے ہی احساس ہے کہ مسلم لیگ بے جا طور پر ہندوستان کی سیاست کو گدلا کر رہی ہے۔ لیکن انگریز کا قائم کیا ہوا توضیع اوقات کے لیے مشن اور کانگرس کے لیے نوید جانفزا ع لانے والا یہ ارکان فرنگی بعد میں خود بخود اس امر پر قائل ہوا کہ مسلمانان ہند کو ایک علیحدہ حکومت ملنا چاہیئے

کابینہ کمیشن کے ارکان ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچے اس وفد نے سب سے پہلے لارڈ ویول وائسرائے ہند سے ملاقات کی۔ بعد ازاں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ارکان اور پھر تمام صوبائی گورنروں سے بات چیت کی۔ اس کے بعد ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں صوبوں کے وزیراعلیٰ اور حزب اختلاف کے لیڈروں کے نظریات معلوم کئے۔ سرکاری سطح پر ان تمام حلقوں میں پھر کر مشن نے اب عملی طور پر ہندوستان کی دو عظیم سیاسی جماعتوں کانگرس اور مسلم لیگ کے ساتھ کسی نکتہ مفاہمت کو پہنچنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس حقیقت میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ انگریز کانگرس کے نکتہ نظر کو ہمیشہ اہمیت دیتا رہا تھا۔ اور اسی جذبے کے تحت اس وقت کے حکام نے بھی کانگرس کے ہم خیال ہونے کا عملی ثبوت دیا۔ وائسرائے اور صوبائی گورنروں سے ملاقات کے دوران اس مشن کا یہ تاثر پورے زور اور مدلل انداز کے ساتھ دیا گیا۔ کہ ہندوستان میں ایک واحد حکومت قائم ہونا ازبس ضروری ہے اور ملک کے ٹکڑے کرنا کسی بھی صورت میں بجا نہیں۔ ملک کے ٹکڑے کرنے کا مطلب نہ صرف ایک کثیر آبادی کو بے گھر کر دینا ہوگا۔ بلکہ ایک عظیم ملک کو بخروں میں تقسیم کر کے اس کی اہمیت و ماہیت کو تباہ کر دینے کے مترادف ہوگا۔ وفد کے ارکان کے دلوں میں یہ بات پوری جامعیت کے ساتھ جاگزیں ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنا انداز فکر انہی خطوط کے تحت اختیار کیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیے گئے مطالبات

Marfat.com

کو پہلے تو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ لیکن بعدازاں قائداعظم محمد علی جناح نے مشن کو حقائق سے آگاہ کر کے اور کانگرس کی دروغ گوئی اور انگریز کے ورغلائے جانے کو واضح کرتے ہوئے اسے مسلم لیگی نکتۂ نظر سمجھنے پر قائل کر لیا۔ اور یہ وفد ایک بار پھر سوچ بچار کرنے پر مجبور ہوا۔

۳ ر اپریل ۱۹۴۶ء کو مشن نے مسٹر گاندھی سے ملاقات کی۔ مسٹر گاندھی نے کوشش کی کہ وہ ثابت کریں، کہ ہندوستان میں ایک ہی سیاسی جماعت ہے اور وہ کانگرس ہے۔ جس میں ہندوستان کی تمام اقوام کے نمائندے فعال انداز میں شامل ہیں۔ اور یہی جماعت پورے ہندوستان کے عوام کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس طرح انہوں نے "قومی وحدت" کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ قومی وحدت کے اس راگ کی سروں سے وہ وفد کو اس بات پر قائل کرنا چاہتے تھے کہ ملک کی تقسیم کی قطعی طور پر کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی حکومت تشکیل کی ہی جانے والی ہے۔ تو اس میں تمام اقوام و مذاہب کو متناسب نمائندگی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح مسلمانوں کو بھی اپنی تعداد کے لحاظ سے بالکل جائز حصہ مل جائے گا۔ انہوں نے وفد کو یقین دلایا کہ وحدانی حکومت میں مسلمانوں کو ان کی ثقافت کے تحفظ اور سیاسی برتری کے مواقع ضروری طور پر مہیا کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ملک کی تقسیم اس لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے افراد، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے متعلق ہوں تاریخ شاہد ہے کہ وہ خون اور نسل کے رشتوں کو غیر فطری طور پر توڑنا ہوگا۔ جس کو قدرت نے جوڑا ہوا ہے۔ اس سے مسٹر گاندھی کے ان رشتوں کی طرف اشارہ تھا۔ جو ماضی میں مسلمانوں نے ہندو عورتوں سے کئے۔ اور ہندو عورتوں کے بطنوں سے مسلمان جوان پیدا ہوئے۔ انگریز کے لیے یہ دلیل کافی زوردار تھی۔ کانگرس کے خیالات سے آگاہ ہونے کے بعد کابینہ نے ۱۴ ر اپریل ۱۹۴۶ء کو قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران قائداعظم نے مشن پر تشکیل پاکستان کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو نہایت واضح اور جامع انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ چندر گپت کے زمانے سے لے کر آج تک ہندوستان بھر میں ایک حکومت قائم نہیں ہوئی۔ ہندو خود ایک مخصوص حصے پر قابض رہے۔ مسلمان آئے تو انہوں نے بھی ہندوستان کے ایک مخصوص حصے پر حکومت کی۔ اگرچہ وہ مخصوص حصہ بہت بڑا تھا۔ انگریز آئے تو انہوں نے ہندوستان کی آزاد ریاستوں کی خودمختاری کو قطعی طور پر نہ چھوا۔ یہاں تک کہ اس برصغیر میں لاتعداد ریاستوں میں راجے۔ مہاراجے اور نواب حکومت کرتے رہے۔ اور ان مہاراجوں اور نوابوں کا سکہ بھی اپنے اپنے علاقے میں چلتا رہا۔ اگرچہ ہندوستان میں وہ سب ریاستیں انگریز کے خلاف نبرد آزما نہیں تھیں۔ لیکن وہ تھیں جداگانہ حیثیت کی دوسرے لفظوں میں "ہندوستان"

Marfat.com

فی الحقیقت بہت تھے۔ لیکن انگریز نے ان سب "ہندوستانیوں" کو ایک کر کے رکھا ہوا ہے اس کے علاوہ خود انگریز نے اپنے دور حکومت میں اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ کہ ہندوستان میں مختلف اقوام بستی ہیں۔ اور ہر قوم سیاسی نکتہ نظر سے اہم ہے۔ کمیونل ایوارڈ اسی بات کی تصدیق ہے۔ پھر ہندوؤں کے ساتھ اچھوتوں اور دوسری غیر مسلم اقوام نے اتحاد کر لیا ہوا ہے۔ لیکن مسلمان قوم اپنی انفرادی حیثیت سے ایسی قوم ہے جو کسی میں مدغم ہونے سے بالکل قاصر ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں کچھ اختیارات کو جب عوام کے نمائندوں میں منتقل کیا گیا۔ تو ان نمائندوں میں ہندوؤں کو ہی عملی طور پر اقتدار کے کچھ حصے منتقل ہوئے۔ اور مسلمان سیاسی حقوق سے بالکل محروم رہے۔ اس سے ان دونوں قوموں میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ اس کشیدگی کو دور کرنے کے لیے برطانیہ نے ہندوستان میں جداگانہ انتخاب کا طریقہ پیش کیا سنہ ۱۹۱۹ء میں بھی قانونی اصلاحات کی صورت میں مسلمان قوم کی انفرادیت کو تسلیم کیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں فرقہ وارانہ مسائل پر جب کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ تو حکومت برطانیہ نے ایک اپنا فیصلہ مسلط کر دینا منظور کیا۔ مسلمانوں کی خواہش کے مطابق سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ کی تشکیل کی گئی۔ اور سرحد میں ایک الگ گورنر مقرر کیا گیا۔ دونوں صوبے ایسے تھے جہاں ہندوؤں کی زبردست مخالفت کے باوجود مسلمانوں کی مسلم لیگ زوروں پر جا رہی تھی۔ نظام حکومت چلانے کے لیے انتظامیہ اور سول سروس کے ایک فولادی ڈھانچے کی صورت ہوتی ہے اور اس وقت تک ہندوستان کا نظم و نسق چلانے کے لیے انگریز بذات خود ان کلیدی عہدوں کے لیے اپنے افراد کا تعین کرتا چلا آرہا تھا۔ چونکہ ان کلیدی عہدوں پر تقرر حکومت کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں کلیدی عہدوں کی تقسیم میں مسلمان مار کھاتے رہیں اور انہیں صرف منہ بند کرنے کے لیے چند ایک جابر قسم کے ہاتھ میں انتظامیہ دی جاتی رہے۔ اس سے عوام بالخصوص مسلمانوں کے دلوں کا اطمینان ہر وقت غارت ہوتا رہے گا۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ ہندوستان میں اس وقت دو تہذیبیں موجود ہیں اور دونوں اپنی اپنی اقدار کے مطابق قدیم ترین نوعیت کی حامل ہیں ان دونوں تہذیبوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے ان کا آپس میں مل جُل کر رہنا اسی طرح ہے جیسے سفید و سیاہ ایک جگہ ہو جائیں۔ جس کی بنا پر نہ تو سفید اپنی سفیدی قائم رکھ سکے اور نہ سیاہ اپنی سیاہی کو پوری طرح قائم رکھ سکے۔ یہ ایک گدلی سی صورت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک علیحدہ انتظامی ڈھانچے اور ایک علیحدہ تہذیب مملکت کی اشد ضرورت ہے۔

دو صورتیں :- وفد کے ارکان نے قائداعظم کی ٹھوس دلائل سن کر کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم

Marfat.com

لیگ میں کوئی سمجھوتہ ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔ لیکن کانگرس تو اپنی ہٹ پر قائم تھی۔ ۱۶ اپریل کو اس وفد سے قائدِ اعظم نے ایک بار پھر ملاقات کی جس میں انہوں نے پاکستان کی مندرجہ ذیل دو متبادل صورتوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

۱۔ ہندوستان کے ایک مخصوص حصے کو الگ کر کے ایک علیحدہ مملکت کی تشکیل کی جائے جس کا نام پاکستان ہوگا۔

یا

۲۔ مسلم اکثریتی صوبوں کی اور دوسرے باقی صوبوں کی الگ الگ دو فیڈریشنیں بنائی جائیں ان دونوں فیڈریشنوں کو ایک ہی مرکز کے ماتحت رکھا جائے جس کے پاس دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کا مشترکہ نظام ہو۔ دونوں حکومتوں کو مساوی حقوق نمائندگی حاصل ہوں۔

شملہ بات چیت: یہ دونوں تجاویز ایسی تھیں، جن سے انگریز کو متفق ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہیئے تھی۔ جن کے باوجود وفد نے کانگرس سے دوبارہ بات چیت کرنے اور اس کو قائداعظم کا نکتہ نظر سمجھانے کی کوشش کرنے کے لیے کانگری نمائندوں سے ملاقات کرنا پسند کی۔ اس ملاقات میں مسلم لیگی رہنماؤں کو شریک کیا جانا بھی تجویز کیا گیا۔ ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس نے قائداعظم اور ابوالکلام آزاد کو ایک خط لکھا۔ اور اس باہمی ملاقات میں ایک دوسرے کو افہام و تفہیم کا موقع بہم پہنچانے کے لیے تحریر کیا۔ وزیر موصوف نے اس گفتگو کی بنیاد کے طور پر دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو ایک سکیم کے بنیادی اصول تحریر کر کے بھیجے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اپنے اپنے چار چار نمائندوں کے ہمراہ شملہ میں اکٹھے بیٹھ کر کوئی قابل قبول حل تلاش کیا جائے۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے نمائندگی کرنے کے لیے بھی چار ہی نمائندے ہوں گے جن میں یہ سہ رکنی کابینہ وفد اور ایک وائسرائے ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان کے دستور کی تیاری کے لیے ایک وائسرائے ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان کے دستور کی تیاری کے لیے ایک فریم ورک بھی لکھ بھیجا۔

لارڈ پینتھک لارنس کی اس تجویز کے جواب میں دونوں جماعتوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے وفود کے شرکاء کے نام گورنمنٹ کو لکھ بھیجے۔ وہ حسب ذیل تھے۔

کانگرس

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد

۲۔ پنڈت جواہر لال نہرو

۳۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔

Marfat.com

مسلم لیگ

۴ ۔ خان عبدالغفار خان

۱ ۔ قائد اعظم محمد علی جناح

۲ ۔ خان لیاقت علی خان

۳ ۔ نواب محمد اسمٰعیل خان

۴ ۔ سردار عبدالرب نشتر

کانگرسی وفد کے نمائندوں میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی بالکل مساوی رکھی گئی۔ شملہ بات چیت کا آغاز ۵ رمئی ۱۹۴۶ء کو ہوا۔ دو دن کی گفتگو کے بعد صدر کانگرس نے وزیر ہند کو تحریری طور پر بیان دیا کہ اس بات چیت میں تمام گفتگو مبہم نوعیت کی ہو رہی ہے اور تمام تر موضوعات مفروضات پر مبنی ہیں اس لیے کانفرنس کا کوئی خاص ایجنڈا ہونا چاہیئے۔ جو ان کے خیال میں مندرجہ ذیل نکات پر مبنی ہونا چاہیئے۔

۱۔ ہندوستان کی مکمل آزادی۔

۲ ۔ ہندوستان سے برطانوی افواج کی واپسی۔

۳ ۔ عبوری دور کے لیے برطانوی حکومت کے انتظامات۔

۴ ۔ تقسیم ہند کی تجویز پر غور نہ ہو۔

۵ ۔ اگر تقسیم ہند کی کوئی تجویز ہو تو اس کو آئین ساز اسمبلی کی وساطت سے آنا چاہیئے۔

اس کے باوجود کانفرنس کی کارروائی جاری رہی۔ اس کانفرنس نے ثابت کر دیا کہ ہندوستان میں جہاں لاتعداد اقوام و مذاہب کے لوگ بستے ہیں ان میں صرف دو اقوام ایسی ہیں جو آپس میں متنازعہ نوعیت کی حامل ہیں۔ ایک مسلمان قوم اور دوسری ہندو قوم۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ ہندو قوم کی نمائندگی کرنے کے لیے جو وفد اس بات چیت میں شامل ہوا، اس میں بھی نصف تعداد میں مسلمان ہی تھے۔ اس طرح پورے ہندوستان کی نمائندگی صرف دو ہندو اور چھ مسلمان کر رہے تھے۔

۹ رمئی ۱۹۴۶ء کو پھر ایک اجلاس ہوا جس میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے تجویز پیش کی کہ مختلف نکات پر اتفاق رائے کرنے کے لیے حکومت ایک ایمپائر مقرر کرے۔ جو پہلے تو دونوں فریقوں کی بات چیت سنتا رہے۔ اور اگر وہ فریق کسی نکتہ پر متفق ہو جائیں تو ٹھیک ورنہ ایک خاص بحث مباحثہ کے بعد وہ اپنا فیصلہ صادر کرے جو دونوں فریقوں کے لیے قابل پابندی

Marfat.com

ہو گا۔ یعنی وہ فیصلہ ناطق ہو گا۔ یہ ایک نہایت لغو تجویز تھی اور بے کار وقت ضائع کرنے کے لیے ایک بہانہ تھا۔ ۹ مئی کو ایمپائر کے تقرر کی تجویز پر پارٹی کی بنیاد پر جائزہ لینے کے لیے اجلاس ملتوی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں جماعتیں اگر کوئی اور تجویز پیش کرنا چاہیں تو انہیں الگ الگ تحریر کر کے مشن کو روانہ کر دی جائیں۔

"پاکستان ناگزیر تھا" کے مصنف جناب سید حسن ریاض اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "مسلم لیگ نے باہمی سمجھوتے کے لیے ایک پیش کش کی جو ذیل میں درج ہے۔

۱۔ صوبہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ بلوچستان۔ سندھ۔ بنگال اور آسام۔ یہ چھ صوبے ایک مجموعے کی حیثیت سے یکجا کیے جائیں۔ اور امور خارجہ، دفاع اور اس حد تک مواصلات کے علاوہ جو دفاع کے لیے ضروری ہو تمام دوسرے شعبوں کا یہ اہتمام و انصرام کریں گے امور خارجہ اور دفاع وغیرہ کا اہتمام و انصرام ہندیونین اور پاکستان مجموعے کی مجالس وانعقان قانون ایک جگہ مجتمع ہو کر کریں گے۔

۲۔ مذکورہ بالا چھ صوبوں کی ایک جداگانہ مجلس واضع دستور ہو گی۔ جو اس مجموعے کے لیے اور مجموعے کے صوبوں کے لیے دستور وضع کرے گی۔ اور اس کا تعین کرے گی پاکستان صوبوں اور پاکستانی مرکز میں کون کون سے شعبے رہیں گے مگر اس شرط کے ساتھ کہ حاکمانہ اختیارات ماباقی صوبوں کو حاصل رہیں گے۔

۳۔ کانسٹی ٹیونیٹ اسمبلی کے لیے نمائندوں کے انتخاب کا طریقہ ایسا ہو گا جس سے پاکستانی مجموعہ صوبجات کے تمام فرقوں کی نمائندگی ہر صوبے میں ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہو گی۔

۴۔ اس کے بعد کہ مجلس واضع دستور پاکستان کی وفاقی گورنمنٹ اور صوبوں کا دستور وضع کر چکے اس مجموعے کے ہر صوبے کو یہ آزادی حاصل ہو گی کہ استصواب رائے عامہ کے ذریعے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ ہر صوبے کے لوگ مجموعے سے الگ ہونا چاہتے ہیں وہ گروپ سے الگ ہو سکے گا۔

۵۔ مشترکہ مجلس واضع دستور میں یہ مسئلہ بحث کے لیے کھلا رہے گا کہ پاکستانی اور ہندوستانی صوبوں کے مجموعے کی مشترکہ یونین کی کوئی مجلس واضعانِ قانون ہو گی۔ یا نہیں۔ یہ مسئلہ دونوں صوبوں کی مجالس واضع دستور کے فیصلے کے لیے چھوڑ دیا جائے کہ (مشترکہ)

Marfat.com

یونین کے لیے مالیے کا انتظام کیوں کر کیا جائے۔ لیکن کسی حالت میں یہ مالیہ ٹیکس کے ذریعے مہیا نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ یونین کی عاملہ میں اگر اس کی کوئی مجلس واضعانِ قانون ہو تو اس میں پاکستانی اور ہندوستانی صوبوں کے مجموعوں کے درمیان نیابت میں مساوات رہے گی۔

۷۔ یونین کے دستور کا کوئی بڑا نکتہ جو فرقہ وارانہ مسئلے پر اثر انداز ہو۔ اس وقت تک مشترکہ مجلس واضع دستور میں منظوری کے قابل نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ ہندو صوبوں کی مجلس واضع دستور اور پاکستان مجموعے کی مجلس واضع دستور اور ووٹ دینے والے ارکان کی اکثریت الگ الگ ان کی تائید میں رائے نہ دیں۔

۸ کسی نزاعی مسئلے کے متعلق، خواہ وہ قانون وضع کرنے کے متعلق ہو یا عاملانہ ہو یا انتظامی ہو۔ یونین سوائے اس صورت کے اور کسی طرح فیصلہ نہ کرے گی۔ کہ اس کی تائید میں تین چوتھائی آراء کی اکثریت ہو۔

۹۔ مجموعوں اور صوبوں کے دستوروں میں بنیادی حقوق اور مذہب، کلچر اور ایسے دوسرے امور کے لیے جو مختلف فرقوں پر اثر انداز ہوں۔ انتظام کیا جائے گا۔

۱۰۔ یونین کے دستور میں ایک دفعہ ہو گی جس کی رُو سے کوئی صوبہ اپنی مجلس واضع قانون کے اکثریت کے فیصلے کی بنا پر یہ مطالبہ کر سکے گی کہ دستور کی ابتدائی میعاد منقضی ہونے کے بعد جب چاہے یونین سے الگ ہو جائے۔

انڈین نیشنل کانگرس نے سمجھوتے کے لیے ۱۹ مئی ۱۹۴۶ء کو جو اصول پیش کئے وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ (الف) کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کی تشکیل مندرجہ ذیل طریقے پر کی جائے۔

(الف) ہر صوبے کی مجلس واضعانِ قانون (اسمبلی) نیابت متناسبہ (سنگل ٹرانسفر ایبل ووٹ) کے ذریعے نمائندے منتخب کرے گی۔ اس طریقے پر جو تعداد منتخب ہو گی۔ وہ اسمبلی کے ارکان کی کل تعداد کا پانچواں حصہ ہو گی، اور وہ اسمبلی کے ارکان بھی ہو سکتے ہیں اور غیر بھی۔

(ب) ریاستوں کے نمائندے اپنی آبادی کی بنیاد پر اسی تناسب سے لیے جائیں گے جس تناسب سے کہ برطانوی ہند میں۔ ۔ یہ نمائندے کیونکر منتخب کیے جائیں گے اس پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

Marfat.com

۲۔ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی وفاقی یونین کے لئے دستور وضع کرے گی۔ یہ کل ہند یونین وفاقی گورنمنٹ مجلس واضعان قانون پر مشتمل ہوگا۔ جو امور خارجہ۔ دفاع۔ مواصلات۔ بنیادی حقوق۔ سکہ۔ کسٹم۔ منصوبہ بندی اور ایسے دوسرے شعبوں کا انصرام کرے گا جو زیادہ غور سے معائنہ کرنے کے بعد مذکورہ بالا شعبوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہوں۔ وفاقی یونین کو اس کے لیے ضروری اختیارات حاصل ہوں گے۔ کہ ان شعبوں کے انتظام و انصرام کے لیے اس کو جس قدر مالیے کی ضرورت ہو وہ حاصل کرے۔ اور نیز اس کو یہ اختیار حاصل ہوگا، کہ اپنے حق کے طور پر مالیہ وصول کرے۔ یونین کو یہ اختیار بھی ہونا چاہیئے کہ اگر دستور درہم برہم ہو جائے گا یا ناگہانی طور پر عوامی ضرورت لاحق ہو جائے تو وہ چارۂ کار کے طور پر اقدامی عمل کر سکے۔

۳۔ بقیہ تمام اختیارات صوبوں یا واحدوں کو حاصل ہوں گے۔

۴۔ صوبوں کے مجموعے قائم کئے جا سکتے ہیں اور یہ مجموعے ایسے صوبائی شعبے متعین کر سکتے ہیں، جن کو وہ مشترکہ اہتمام و انتظام کے لیے لینا چاہیں۔

۵ اس کے بعد کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کل ہند وفاقی یونین کے لیے اس طرح فیصلے کر چکے جس طرح کہ مذکورہ بالا پیرہ نمبر ۲ میں درج ہے تب صوبوں کے نمائندے اپنے مجموعے کے لیے دستور کا فیصلہ کرنے کی غرض سے مجموعہ قائم کر سکتے ہیں۔ اور اگر وہ چاہیں تو مجموعے کے دستور کا بھی۔

۶۔ کل ہند وفاق کے دستور میں کوئی ایسا بڑا مسئلہ جو فرقہ وارانہ معاملات پر اثر انداز ہو۔ بغیر اس کے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں منظور ہونے کے قابل نہیں سمجھا جائے گا کہ متعلقہ فرقے یا فرقوں کے ان ارکان کی اکثریت جو حاضر ہوں اور رائے دیں۔ جدا گانہ طور پر تائید میں نہ ہوں۔ ایسی صورت میں کہ کسی ایسے مسئلے پر اتفاق نہ ہو۔ وہ ثالثی میں بھیج دیا جائے گا۔ اس شبہے کی صورت میں کہ کوئی خاص نکتہ بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے یا نہیں اس کا فیصلہ اسپیکر کرے گا۔ یا وہ مسئلہ وفاقی عدالت میں بھیج دیا جائے گا۔

۷۔ دستور وضع ہونے کے دوران میں اگر کوئی نزاع پیدا ہو۔ تو وہ مسئلہ فیصلے کے لئے عدالت میں بھیج دیا جائے گا۔

۸۔ ایسی قیود و موانع کے ساتھ جو مطلوب ہوں۔ دستور میں اس کا انتظام ہونا چاہیئے کہ کسی

Marfat.com

وقت بھی اس کی نظرثانی ہو سکے اگر یہ خواہش کی جائے تو معین طریقے پر دستور کے اندر یہ درج کر دیا جائے گا کہ دس سال کے بعد دستور کی نظرثانی ہو سکتی ہے۔"

دونوں جماعتوں کی ان تجاویز کو اس وفد نے تسلیم نہ کیا۔ اس طرح دونوں پارٹیوں کی بات چیت نہ صرف ناکام ہوئی۔ بلکہ اس وفد کو ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کو کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کرنا پڑا لیکن ساتھ ہی مشن نے کہا کہ اس کے بعد خود مشن اپنی طرف سے ایک ایسا منصوبہ تیار کر کے پیش کرے گا جو فریقین کے لیے لازماً "قابل قبول ہو گا۔

کیبنٹ مشن پلان:۔ ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو کابینہ مشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا اس منصوبے کو "کیبنٹ مشن پلان" کا نام دیا گیا۔ منصوبے کی تمہید میں بیان کیا گیا کہ مشن نے مسلم لیگ کے نکتہ نظر اور مطالبہ پاکستان کو مختلف پہلوؤں سے جانچا ہے۔ اس وفد کو مسلمانوں کے مسائل کا پورا پورا خیال ہے۔ اور وفد جانتا ہے کہ مسلمانان ہند ہندو کی اکثریت کے غلبے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ صرف دستاویزی تحفظات ان کے خوف و خطر کو دور نہیں کر سکتے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس حقیقت کے باوجود ملک کو تقسیم کرنا مشکل بات ہے، کیونکہ پنجاب اور بنگال کے غیر مسلم اکثریت والے علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اور اگر ان اکثریت والے علاقوں کو پاکستان سے الگ کر دیا جائے تو پاکستان ایک بہت چھوٹا اور کمزور ملک رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ان حقائق کا جائزہ لینے کے بعد کابینہ مشن نے خود اپنی تجاویز پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان تجاویز کے بنیادی نکات حسب ذیل تھے۔

۱۔ ہندوستان کے تمام صوبوں کو تین گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

i۔ پنجاب۔ سرحد۔ سندھ۔ بلوچستان

ii۔ بنگال اور آسام

iii۔ باقی ماندہ تمام ہندوستانی صوبے

۲۔ ہر گروہ کو اپنی مرضی کے مطابق اپنی اپنی فیڈریشن قائم کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔ لیکن تینوں فیڈریشنوں کے اوپر ایک آل انڈیا یونین ہو گی۔ جس کے پاس مرکزی سطح پر دفاع۔ امور خارجہ۔ اور مواصلات کے شعبے ہوں گے۔

۳۔ تمام فیڈریشنوں کی دستور ساز اسمبلی ایک ہی ہو گی جس کے نمائندوں کا انتخاب

Marfat.com

۳۔ صوبائی اسمبلیوں کے منتخب شدہ ارکان کریں گے۔ مسلمان اور سکھ اپنے اپنے نمائندے اپنے علیحدہ ووٹ سے منتخب کریں گے۔ ہندو اور باقی تمام فرقے اپنے نمائندوں کا انتخاب علیحدہ ووٹ سے کریں گے۔ دستور ساز اسمبلی میں ہر صوبے کا فرقہ وارانہ کوٹہ ان کی آبادی کے تناسب سے مقرر کیا جائے گا۔

۴۔ تمام صوبوں کے منتخب شدہ نمائندے پہلے روز مشترکہ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں گے۔ لیکن صدر کے انتخاب اور دوسری رسمی کارروائیوں کے بعد یہ نمائندے مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ اور ہر گروہ اپنے صوبے کا آئین تیار کرے گا جب آئین کا حصہ مکمل ہو جائے گا۔ تو اس کے بعد مختلف گروہوں کے نمائندے دوبارہ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں گے۔ اور مل جل کر آل انڈیا یونین کا آئین ترتیب دیں گے

۵۔ یونین کی مجلس قانون ساز کے آئین میں یہ شرط رکھی جائے گی کہ فرقہ وارانہ نوعیت کے امور کے متعلق یا آئین میں ترمیم کے لیے نہ صرف پورے ایوان کی تائید بلکہ ہندو اور مسلم ارکان کی اکثریت کی الگ تائید بھی ضروری ہوگی۔ یونین کی حکومت کو اپنے اخراجات کے لئے براہ راست ٹیکس عائد کرنے یا وصول کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

۶۔ آئین سازی کے دوران وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو از سر نو تشکیل دے کر اس میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو شامل کیا جائے گا۔ اور ہر ممکن حد تک اس عبوری حکومت کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کے مواقع مہیا کیے جائیں گے۔ عبوری حکومت میں نشستوں کی تقسیم کے سوال پر گفت وشنید کے مواقع بھی فراہم کیے جائیں گے۔

۷۔ دس سال کے بعد ہر گروپ (صوبائی گروپ جس کا ذکر اوپر پیرا نمبر ۱ میں کیا گیا ہے۔ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ مرکز سے علیحدہ ہو جائے۔

۸۔ نئی دستور ساز اسمبلی کے لیے ارکان منتخب کرنے کے لیے ہر دس لاکھ افراد پر ایک نمائندہ قرار پایا۔

اس طرح یہ نظام حکومت

۱۔ پہلا صوبائی مرحلہ

۲۔ دوسرا گروپ کا مرحلہ

۳۔ تیسرا مرکزی مرحلہ

Marfat.com

مندرجہ بالا تجاویز سے دو باتیں واضح ہوتی تھیں۔

۱۔ مشن اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض صوبے علیحدگی چاہتے ہیں۔ وہ دس سال کے بعد علیحدہ ہو کر نئی حکومت تشکیل کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس مشن نے تشکیل پاکستان کو اپنی طرف سے دس سال کے لیے اور آگے کر دیا ہے۔ دبی زبان میں تشکیل پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا۔

۲۔ مشن نے مرکزی سطح پر کانگرس کے مطالبے "اکھنڈ بھارت" کو بھی مان لیا کیونکہ تمام صوبوں کی جداگانہ حیثیت کے باوجود مضبوط ہندو مرکز قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

کانگرس کا ردِ عمل اور سٹیفورڈ کرپس کی وضاحت :۔

کابینہ پلان میں چونکہ فوری طور پر پاکستان کی تشکیل کی نفی کی گئی تھی۔ اس لیے کانگرس نے ان تجاویز کو فوراً تسلیم کر لیا۔ ۲۴ مئی کو کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں گاندھی جی کی گائیڈ لائن کے مطابق اس منصوبے پر تبصرہ کیا گیا۔ اور کہا گیا کہ صوبوں کو شروع ہی سے کسی گروپ میں شامل ہونے کا اختیار حاصل ہے دراصل کانگرس سرحد اور آسام کو متعلقہ گروپوں سے نکالنا چاہتی تھی۔ علاوہ ازیں آئین ساز اسمبلی کے اس طرح مرکزی دستور یہ میں ہندو کو اکثریت حاصل ہوتی تھی۔ اور وہ جیسے چاہتے فیصلہ کر لیتے۔ چنانچہ کانگرس کے اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ صوبوں کی لازمی گروہ بندی ان کی آزادی اور خود مختاری کی نفی کرتی ہے۔ اور اپنی طرف سے یہ تاویل پیش کی گئی۔ کہ گروہ بندی کا مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ سے متعلقہ صوبے ابتدائی مرحلہ میں ہی یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے کہ جس گروہ میں انہیں شامل کیا گیا ہے اس میں وہ رہنا چاہتے ہیں کہ نہیں۔ اس قرارداد کے منظر عام پر آنے سے کمیشن میں ایک بار پھر کچھ تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ وفد کے سرکردہ رکن سر سٹیفورڈ کرپس نے ایک وضاحتی بیان جاری کیا۔ جس میں انہوں نے کمیشن کی تجاویز کی مزید صراحت و وضاحت کی انہوں نے کہا کہ ہر صوبے کے لیے گروہ بندی کی پابندی لازمی ہے۔ البتہ بعد میں مختلف جماعتوں کی باہمی رضامندی سے ایک ضابطے کے تحت صوبوں کو اپنے مرکز سے الگ ہونے کا اختیار ہو گا۔

مسلم لیگ کا ردِ عمل :۔ وزارتی مشن کی تجاویز میں پاکستان کی تشکیل کو پس پشت ڈال

Marfat.com

دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ تجاویز کسی بھی صورت میں مسلمانانِ ہند کے لیے بالعموم اور مسلم لیگ کے لیے بالخصوص قابلِ قبول اور مستحسن نہیں تھیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے ان تجاویز کے بارے میں ایک اعلامیہ میں فرمایا کہ چونکہ وفد نے پاکستان کے منصوبے کو ناقابلِ عمل قرار دیا ہے۔ اس لیے مسلم لیگ اس کی تجاویز کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ۶ جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی کونسل کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے تحت قرار پایا کہ قیامِ پاکستان کے خلاف کابینہ مشن نے جو دلائل پیش کئے ہیں۔ وہ نہایت غیر منطقی اور ناپسندیدہ ہیں۔ اس کے باوجود مشن کا منصوبہ چھ مسلمان صوبوں کی لازمی گروہ بندی کی شرط کو تسلیم کرتا ہے۔ اور مشن کا یہ تسلیم کرلینا اصل میں پاکستان کی تشکیل کی ضرورت کو محسوس کرلینے کے مترادف ہے۔ لیکن عملی طور پر مشن نے اس حقیقت سے انکار کر دیا ہے۔

مسلم لیگ کی اس قرارداد نے کانگرس میں سراسیمگی اور تحیر برپا کر دیا۔ کیونکہ ہندوؤں کی توقعات کے خلاف اس مشن نے مسلمانوں کو علیحدہ حکومت بنانے کی اجازت دے دی چاہے اس حکومت کا قیام کچھ تاخیر سے ہی کیوں نہ ہوتا تھا۔ بالآخر یہ مشن ۲۹ جون ۱۹۴۶ء کو واپس برطانیہ چلا گیا۔

Marfat.com

ڈائریکٹ ایکشن اور عبوری حکومت

سوال:۔ وزارتی مشن کے ارکان کی تجاویز نے کانگرس اور مسلم لیگ کے سیاسی حلقوں میں ایک کھلبلی مچادی تھی۔ انگریز سے آزادی حاصل کرنے کا اب اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ کوئی راست قدم اٹھایا جائے تاکہ عوام کی خواہش کے مطابق حکومت قائم کی جائے ان حالات میں جو ڈائریکٹ ایکشن ہوا، اور جو عبوری حکومت بنی، اس کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیل سے بیان کیجئے؟

جواب:۔ کیبنٹ مشن کی تجاویز کے منظر عام پر آجانے کے بعد ہندوستان کی دونوں سیاسی جماعتوں میں ایک زبردست مدوجزر شروع ہوا۔ کانگرس کا خیال تھا کہ وزارتی مشن نے مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کو رد کر دیا ہے اور ہندوستان میں ایک مشترکہ حکومت کی تشکیل کی سفارش کی ہے اور ادھر مسلم لیگ نے یہ سمجھا کہ کابینہ مشن نے دراصل نظریۂ پاکستان کو تسلیم کر لیا ہے لیکن اس کی تشکیل کا کام آگے ڈال دیا ہے۔ تاہم دونوں سیاسی جماعتیں اس منصوبے کو کسی نہ کسی صورت میں مان لینے کو تیار ہو گئیں۔

کابینہ پلان کے قبول کر لینے کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے لارڈ ویول سے عارضی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں گفت وشنید شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی پارٹی کو حالات سے آگاہ بھی کرتے رہے۔ ہندوؤں کی زبردست کوشش رہی کہ آخری وقت تک مسلمانوں کو نیچا دکھایا جائے۔ لیکن حکومت برطانیہ کی طرف سے وائسرائے ہند کو ہندوستان میں نئی حکومت بنانے کی ہدایات مل چکی ہوئی تھیں۔ اس لئے ہندوؤں کی کوئی بدانديشی

Marfat.com

اس وقت کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ لارڈ ویول نے قائد اعظم کو ملاقات کے دوران بتایا کہ عارضی حکومت ۱۲ ارکان حکومت پر مشتمل ہو گی۔ جس میں مندرجہ ذیل تعداد نمائندوں کی ہو گی۔

کانگرس	=	۵	نمائندے
مسلم لیگ	=	۵	"
اقلیتیں	=	۲	"
کل	=	۱۲	"

یہ تجویز بہت اچھی تھی۔ قائد اعظم نے اس تجویز کی توثیق تحریری طور پر چاہی لیکن وائسرائے نے اس کا تحریری اقرار کرنے سے انکار کر دیا۔

ادھر پنڈت جواہر لال نہرو نے وائسرائے کو ایک خط لکھا جس میں حکومت کے اس فیصلے کو تبدیل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا جس میں حکومت کی تشکیل ۱۲ نمائندوں سے کی جانا مقصود تھی پنڈت جی کے خیال کے مطابق کل نمائندوں کی تعداد ۱۵ ہونی چاہیئے تھی۔ جس کی تقسیم حسب ذیل ہو۔

کانگرس	=	۵	نمائندے	(جو تمام تر ہندو ہوں)
غیر کانگرسی	=	۱	نمائندہ	(جو صرف ہندو ہو)
کانگرس	=	۱	"	(خاتون نمائندہ)
مسلم لیگ	=	۴	نمائندے	
غیر مسلم لیگی	=	۱	نمائندہ	(جو صرف مسلمان ہو)
پسماندہ اقوام	=	۱	"	
عیسائی	=	۱	"	
سکھ	=	۱	"	
کل	=	۱۵	نمائندے	

مولانا ابوالکلام آزاد نے پنڈت نہرو کی ان تجاویز کی تائید کی۔ وائسرائے پر ان تجاویز کے پہنچنے پر اتنا اثر ضرور ہوا، کہ وہ پہلے کیے گئے اعلان میں اگر تمام تر کانگرس ارادے کے مطابق نہیں، تو کچھ تبدیلی کرنے پر ضرور رضامند ہو گئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ عبوری حکومت میں

Marfat.com

ارکان کی تعداد ۱۲ سے بڑھا کر ۱۳ کی جا سکتی ہے اور نمائندوں کی تقسیم پہلے کی بجائے اب اس طرح ہو سکتی ہے۔

کانگرس	=	۶ نمائندے
مسلم لیگ	=	۵ "
اقلیتیں	=	۲ "

دوسرے لفظوں میں کانگرس کو ایک اور نمائندگی حاصل ہو گئی۔ لیکن کانگرس اس تجویز سے بھی متفق نہ ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ایک خاص سیاسی نوعیت کا تعطل پیدا ہو گیا۔ بگڑی ہوئی صورت حال کے پیش نظر وائسرائے نے اعلان کیا کہ عارضی حکومت ۱۴ ارکان پر مشتمل ہو گی جس میں مندرجہ ذیل تقسیم نمائندگان ہوں گے۔

کانگرس	=	۶ نمائندے			
مسلم لیگ	=	۵ "	عیسائی	=	۱ نمائندہ
سکھ	=	۱ نمائندہ	پارسی	=	۱ "

اس اعلان کے ساتھ وائسرائے نے مزید صراحت کر دی کہ اگر کانگرس اور مسلم لیگ کو اب بھی کوئی اعتراض ہو گا تو وائسرائے خود ایک مخلوط حکومت تشکیل دیں گے جس میں ان تمام جماعتوں کے نمائندے شامل کیے جائیں گے جن کو یہ تجویز منظور ہو گی۔ مسلم لیگ نے وائسرائے کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا لیکن اس کے برعکس کانگرس نے اس کو مسترد کر دیا۔

وائسرائے ہند لارڈ ویول کا مندرجہ بالا بیان ان کی سرکاری حیثیت کا تھا، اور وہ اسے سرکاری اختیارات کے تحت بروئے کار لا بھی سکتے تھے۔ لیکن ببر کی سی بھبکی مارنے والے اس بزدل شخص نے کانگرس کے انکار کی دھمکی کے سامنے اپنی دم دبالی اور اعلان کر دیا کہ میرے سابقہ اعلان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ کانگرس کے بغیر کوئی حکومت تشکیل دی جائے گی۔ حالانکہ اس ذمہ دار حاکم کو معلوم تھا کہ کانگرس یا لیگ کی طرف سے ایسا جواب مل سکتا ہے۔ بہر حال اگر مسلم لیگ کی طرف سے انکار ہوتا تو کانگرس وائسرائے کو مجبور کرتی کہ وہ مسلم لیگ کے نمائندوں کے بغیر ہی عارضی حکومت تشکیل کریں اور ان نمائندوں کی جگہ کانگرس کے ارکان کو موقع دیں اور لارڈ ویول ہندو نوازی کرتے ہوئے اس تجویز کو لازماً تسلیم کر لیتے۔

وائسرائے کی اس وعدہ خلافی پر نہ صرف قائداعظم نے احتجاج کیا بلکہ خود برطانوی حبارت

Marfat.com

نے لارڈ ویول کی سخت مذمت کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہندوؤں نے لارڈ ویول کو کسی خوفناک چیز سے ڈرا دیا تھا اور جس کے زیر اثر وہ ذمہ داری سے کئے ہوئے وعدے سے انحراف کر کے اخلاقی پستی کے گہرے گڑھے میں جا گرے۔ اس احتجاج پر اور پریس کی خبروں کی اشاعت کے باوجود وائسرائے پر کوئی اثر نہ ہوا جیسے انہوں نے سب کچھ برداشت کرنا تسلیم کر لیا تھا۔ تاکہ کانگرس کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔

وائسرائے کے رویے میں اس یکسر تبدیلی نے مسلم لیگی حلقوں میں زبردست مایوسی پیدا کر دی ظاہر ہے کہ اگر وائسرائے ہند کو مسلم لیگی مفادات کو نظر انداز کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہوگی تو اس کے بعد مسلم لیگ کے حلقوں میں وائسرائے کے لیے کتنا احترام باقی رہ جاتا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ نے اس تجویز کو ماننے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ جس سے عارضی حکومت کی تشکیل میں تعطل پیدا ہو گیا۔ جب مسلم لیگ کی طرف سے یہ جواب ملا تو وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس نے جو کابینہ مشن کا رکن بھی تھا۔ بالکل دیدہ دلیری کے ساتھ وائسرائے کو ہدایت جاری کی کہ اگر مسلم لیگ تعاون نہیں کرتی تو اس کے نمائندوں کے بغیر ہی عبوری حکومت تشکیل کر لی جائے۔ اور کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دے دی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ لارڈ ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے بھی وائسرائے ہند کو ہدایت جاری کی کہ ہندوستان میں عارضی حکومت بنانے کے سلسلے میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔ اس لیے مسلم لیگ کے عدم تعاون کے بعد صرف کانگرس کو ہی حکومت بنانے کی دعوت دے دی جائے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارے اور کانگرس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔

۲۴ اگست کو ایک سرکاری اعلان میں تاج برطانیہ کی منظوری کے بعد عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے ان ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا۔

وہ نام حسب ذیل تھے۔

۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو
۲۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل
۳۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد
۴۔ مسٹر آصف علی
۵۔ سی۔ راج گوپال اچاریہ
۶۔ سرت چندر بوس
۷۔ ڈاکٹر جان متھائی
۸۔ سردار بلدیو سنگھ
۹۔ سر شفاعت احمد
۱۰۔ جگ جیون رام
۱۱۔ سید علی ظہیر

Marfat.com

۱۲ ۔ کاؤس جی ہرمزجی بھابا

اس کے علاوہ دو مسلمان نمائندوں کے نام رہ گئے جن کے متعلق اعلان ہوا کہ ان کے نام بعد میں شائع کر دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ یہ عارضی حکومت ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو قائم ہو جائے گی۔

یوم راست اقدام:۔ مسلم لیگ نے کانگرس کی دھاندلی اور انگریزوں کی بدعنوانیوں کے خلاف ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو یوم راست اقدام "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" منانے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے اعلان کیا۔ کہ

"اب مسلم قوم کے لیے حصول پاکستان، تحصیل حقوق، تحفظ آبرو۔ انگریز کی غلامی اور ہندو کی بالادستی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ راست اقدام اٹھایا جائے"

راست اقدام اٹھانے کے لیے قائداعظم نے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کو اختیار دے دیا۔ انہوں نے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ انگریز کے دیئے ہوئے تمام خطابات و اعزازات اظہار نفرت اور احتجاج کے طور پر واپس کر دیں۔ چنانچہ اس فیصلے کے تحت پورے ہندوستان میں یوم راست اقدام یعنی ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا گیا۔ قائداعظم نے تلقین کی تھی کہ اس دن کو پورے آئینی وقار کے ساتھ نہایت امن و امان کے ساتھ منایا جائے اور پرامن جلسے منعقد کیے جائیں۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام شہروں میں یہ دن نہایت امن اور پروقار انداز میں منایا گیا۔ لیکن ہندوؤں نے کلکتہ میں زبردست اخلاقی پستی کا ثبوت دیتے ہوئے غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔ اور علاقے کے امن دامان کو خود اپنے ہاتھوں سے نذر آتش کر دیا کلکتہ میں یوم راست اقدام کے سلسلے میں ایک جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ اور شہر کے تقریباً تمام مسلمان اس جلسہ میں شرکت کے لیے جلسہ گاہ میں آئے ہوئے تھے۔ مسلمان نوجوانوں کی غیر حاضری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندو غنڈوں نے تعصب کی بنا پر مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگانا شروع کر دی لوٹ مار کا آغاز کیا اور عورتوں کی بے حرمتی اور آبروریزی کا بازار گرم کر دیا۔ اور اگر کوئی بوڑھا یا ادھیڑ عمر کا شخص سامنے مقابلے کے لیے آیا بھی تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہندو غنڈوں کی اس دہشت گری کی خبر فی الفور تمام طرف پھیل گئی۔ اور اس فرقہ دارانہ فساد کی آگ میں پورے کا پورا شہر جلنے لگا۔ قتل و غارت کا یہ بازار مسلسل چار دن گرم رہا۔ آخر کار فوج کی مداخلت پر امن قدرے بحال ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق صرف کلکتہ شہر کے علاقے میں چھ ہزار افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور اس سے دوگنا تعداد زخمی افراد کی تھی۔ تقریباً پچاس

Marfat.com

لاکھ کی املاک کو نذر آتش کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فسادات کی یہ آگ پورے بنگال، بہار، یوپی اور کئی دیگر شہروں میں پھیل گئی۔ اور ہندو مسلم فساد کی صورت میں ڈیڑھ سال سے بھی زائد عرصے تک جاری رہی۔ سب سے زیادہ تیزی پنجاب میں نمودار ہوئی جہاں تقسیم ہند کے بعد بھی اس قتل و غارت کو نہ روکا جاسکا مجموعی طور پر ستر لاکھ سے زائد افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پانچ کروڑ افراد بے گھر ہوئے یا کئی ارب روپے کی جائیداد کو یا جلا دیا گیا یا تباہ کر دیا گیا۔

ان فسادات کی ابتداء اگرچہ ہندو غنڈوں نے خود کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہندو پریس نے الٹا مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرایا اور اس قتل و غارت کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ہی ڈالی اور خود کو معصوم گردانتے کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے۔ ہندوؤں کا مقصد تو عوام کی نظر میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ قبیح صورت میں پیش کرنا تھا۔ اسی لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت خون کی اس ہولی کا کھیل رچایا گیا۔ کلکتہ کے فسادات کی تحقیقات کرنے کے لیے انڈین فیڈرل کورٹ کے ایک جج کا تعین کیا گیا۔ جو ابھی تحقیقات مکمل نہ کر پایا تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ اور کلکتہ ہندوستان میں بھارت کا جزو بن گیا

عبوری حکومت میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ملک معظم نے کورانہ انداز میں وائسرائے ہند کو اپنے وزیر اعظم لارڈ اٹیلی کی وساطت سے حکم جاری کر دیا کہ کانگریس کو فی الفور حکومت بنانے کے لیے پیش کش کی جائے لیکن لارڈ ویول کلکتہ کے حالات سے خوفزدہ ہو گئے انہیں اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر مسلم لیگ کو بجبر نظر انداز کیا گیا تو اس قسم کی آگ تمام ہندوستان میں پھیل سکتی ہے۔ اس طرح امن عامہ کا قائم رہنا نا ممکن بات ہے اس کے ساتھ ہی وائسرائے نے فساد زدہ علاقے کا دورہ کیا اور تمام واقعات کا موقع پر ہی آنکھوں سے جائزہ لیا۔ اس دوران وائسرائے کی ملاقات عظیم بنگالی رہنما خواجہ ناظم الدین سے ہوئی۔ بر سبیل تذکرہ وائسرائے نے خواجہ صاحب سے کہا کہ اگر آپ قائداعظم محمد علی جناح کو اس بات پر قائل کر لیں کہ وہ کابینہ میں مسلم لیگ کی شمولیت کے لیے تیار ہو جائیں تو کیا ہی اچھا ہو۔

ادھر مسٹر گاندھی کو اس ملاقات کا علم ہوا تو وہ جل بھن کر کباب ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی مکارانہ تگ و دو کو تیز تر کر دیا۔ ادھر وزیر اعظم ہند لارڈ اٹیلی کو براہ راست ایک خط لکھ ڈالا کہ لارڈ ویول حکومت برطانیہ کی ہدایت کے برخلاف مسٹر جناح کو رضامند کرنے کے لیے مختلف ذرائع اپنا رہے ہیں اور ادھر لندن میں مقیم کانگریسیوں کو بھی مطلع کر دیا کہ وہ یہاں کے حکام کو موزوں ترین ذرائع سے اس بات پر آمادہ کریں کہ کانگریس کی حکومت ہندوستان میں جلد از جلد تشکیل

Marfat.com

پذیر ہو۔ اس کے ساتھ ہی لارڈ ویول کو ایک خط لکھ مارا۔ کہ اگر آپ مسلم لیگ سے اتنے ہی خائف ہیں تو ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ کانگرس نتائج سے خود بخود عہدہ برآء ہو جائے گی۔ اس پر لارڈ ایٹلی نے والسرائے کو حکم لکھ بھیجا کہ قبل ازیں جاری شدہ پروگرام کے تحت وزارت سازی کا پروگرام جلد از جلد مکمل کیا جائے۔ چنانچہ لارڈ ویول کو اس حکم کی تعمیل کرنا پڑی اور مذکورہ بالا بارہ ارکان نے کانگرسی وزارت کے تحت ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو اپنے اپنے عہدوں کا حلف اٹھا لیا۔

مسلم لیگ کی شمولیت:۔ ہندوؤں کے مکارانہ داویلا کے زور پر لارڈ ویول کانگرسی لیڈروں کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ صرف ایک آدمی کے ضمیر کش ہو جانے سے صداقت کو دفن نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس سے تو غضب کی آگ اور بھڑکتی ہے۔ ۲ ستمبر کو کانگرس کی یک طرفہ حکومت کی تشکیل کے بعد قائداعظم نے ایک زوردار تنقیدی بیان انگریزوں کے رویے کے خلاف دیا۔ وہ جان گئے تھے کہ انگریز تشدد کی زبان جلد سمجھتا ہے چنانچہ انہوں نے تمام مسلمانوں ہند کو حالات کا مقابلہ کرنے اور قربانیاں دینے کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی۔ ادھر برطانیہ میں چرچل حزب مخالف پر تھا وہ ہندوستان کے حالات و کوائف سے بخوبی واقف تھا وہ فوجی ہونے کے ساتھ ایک اچھا سیاست دان اور دور اندیش مفکر بھی تھا۔ ملک معظم کے اس فیصلے پر اس نے زبردست تنقید کرتے ہوئے کہا کہ کیا انگریز کو ہندوستان میں بسنے والی ایک عظیم قوم کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں کوئی بھی ملک عقلمند کہہ سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اتنی کثیر تعداد کے لوگوں کو حکومت سے بالکل علیحدہ رکھا جائے۔ کیا مسلمانوں کی کروڑوں کی آبادی کو جھٹلایا جا سکتا ہے اور یہ توقع رکھی جا سکتی ہے۔ کہ اس قدر بڑی تعداد کے افراد کو حکومت میں نمائندگی نہ دے کر امن عامہ قائم رہ سکتا ہے۔ اور وہ قائم ہونے والی حکومت ترقی کا ایک زینہ بھی چڑھ سکتی ہے۔ اسی طرح برطانوی پریس نے بھی حکومت برطانیہ کے اس ناعاقبت اندیشانہ پر بس واقع کیا کہ اس سلسلے میں فیصلے کی زبردست مذمت کی اس سلسلے میں مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کیا جانا ازبس ضروری ہے۔

برطانوی حکومت کی اس پالیسی کے قبیح ردعمل کو دیکھ کر لارڈ ویول کی ضمیر میں خلش پیدا ہو گئی۔ اور اس نے بھی اب ایسی راہیں ٹٹولنا شروع کیں۔ جن کے ذریعے وہ مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ قائداعظم نے والسرائے کو اپنے اور مسلم لیگ کے غم و غصے سے تحریری طور پر آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ محض کانگرسی وزراء کے بل بوتے پر قائم ہونے والی

Marfat.com

وزارت کے متعلق کیۓ جانے والے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ چنانچہ والسرائے نے قائد اعظم کو لکھا کہ وہ مسلم لیگ کی طرف سے شامل کیۓ جانے کے لیے اپنے پانچ نمائندوں کے نام تحریر کر کے ارسال کریں۔ قائد اعظم نے مسلم لیگ کی طرف سے مندرجہ ذیل پانچ نام بھیجے۔

۱ ۔ خان لیاقت علی خاں

۲ ۔ ابراہیم اسمٰعیل چندریگر

۳ ۔ سردار عبدالرب نشتر

۴ ۔ راجہ غضنفر علی

۵ ۔ جوگندر ناتھ منڈل (اچھوت لیڈر)

وائسرائے نے ان ارکان کو فی الفور مرکزی وزارت میں شامل کر لیا۔ ان ارکان کو جگہ دینے کے لیے مسلم وزراء نے عہدے خالی کر دیئے۔ البتہ کانگرس نے اپنے حصے میں سے سرت چندر بوس کی جگہ خالی کر دا کر آصف علی کو دے دی لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد آصف علی کی جگہ ابوالکلام آزاد کو مرکزی وزارت میں لے لیا گیا۔

مسلم لیگی نمائندوں کی شمولیت کی بنا پر وزارت کے عہدوں اور محکموں کی تقسیم نئے سرے سے کرنا پڑی۔ اس نئی وزارت نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو حلف وفاداری اٹھایا۔

محکموں کی تقسیم:۔ ان وزراء میں مختلف محکموں کو حسب ذیل طریقے سے تقسیم کیا گیا۔

۱ ۔ پنڈت جواہر لال نہرو	امور خارجہ
۲ ۔ ولبھ بھائی پٹیل	امور داخلہ، اطلاعات و نشریات
۳ ۔ راجندر پرشاد	خوراک و زراعت
۴ ۔ سی۔ راجگوپال اچاریہ	تعلیم و آرٹ
۵ ۔ آصف علی	ٹرانسپورٹ اور ریلوے
۶ ۔ جگ جیون رام	لیبر
۷ ۔ لیاقت علی خاں	خزانہ
۸ ۔ اسمٰعیل ابراہیم چندریگر	تجارت
۹ ۔ عبدالرب نشتر	مواصلات

Marfat.com

۱۰ - راجہ غضنفر علی خان — صحت

۱۱ - جوگندر ناتھ منڈل — قانون

۱۲ - چیان منتھائی — صنعت و رسد۔ کانیں اور وسائل قدرت

۱۳ - سردار بلدیو سنگھ — دفاع

جب اس وزارت نے حلف اٹھا لیا تو کانگرس کے لیڈروں کے اندر احساس برتری نمودار ہوا۔ چنانچہ کانگرسی ارکان نے اس بات پر زور دیا کہ پنڈت نہرو کو کابینہ کا سب سے سینئر وزیر اور کابینہ کا لیڈر قرار دیا جائے۔ مسلم لیگی وزراء نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ خان لیاقت علی خان نے اس سلسلے میں ایک پریس کانفرنس طلب کی، جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ کی نظر میں کابینہ کے اندر کسی بھی وزیر کو افضلیت حاصل نہیں ہے اس لیے پنڈت نہرو کی حیثیت مسلم لیگی وزراء کے سامنے محض ایک وزیر خارجہ کی ہے وہ انہیں کسی بھی صورت میں اپنا لیڈر تسلیم نہیں کریں گے اور نہ اس کے لیے تیار ہیں، اگر وہ لیڈر ہیں تو محض اپنے کانگرسی وزراء کے ہوں گے مسلم لیگ کی نظر میں ان کو کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔

اس بیان سے پورے ہندوستان بھر کانگرسیوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ مسلم لیگی وزراء کے خلاف والسرائے کے سامنے شاکی ہوئے۔ ولبھ بھائی پٹیل نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

والسرائے کو چاہیئے کہ وہ مسلم لیگی وزراء کو عدم تعاون کی پاداش میں استعفیٰ دینے پر مجبور کرے۔ لیکن ویول بذاتِ خود مجروح ضمیر والا شخص تھا اس لیے اس نے پٹیل کی اس بات کی طرف قطعاً کوئی دھیان نہ دیا۔

فروری ۱۹۴۷ء میں خان لیاقت علی نے چودھری محمد علی جو ان دنوں مرکزی حکومت کے واحد مسلمان سنیئر افسر تھے، اور وزارتِ خزانہ کے سیکرٹری تھے۔ کی مدد سے نئے سال کا بجٹ تیار کیا۔ یہ بجٹ اپنی نوعیت کا سب سے زیادہ مقبولیت والا بجٹ تھا۔ اس کو بعد میں عوامی بجٹ کا نام دیا گیا۔ اس بجٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے تھوڑی آمدنی والے افراد کی آمدنی میں اضافہ کرنے اور سرمایہ داروں پر نئے ٹیکس لگانے کی سفارشات کی گئیں، اور نمک پر سے ٹیکس معاف کر دیا گیا۔

Marfat.com

انکم ٹیکس کے لئے کم از کم آمدنی کی حدود ۲ ہزار سے بڑھا کر ۲½ ہزار کر دی گئی۔ بڑی بڑی آمدنیوں پر ٹیکس عاید کیے گئے اور ساتھ ہی ایک لاکھ سے زاید کاروباری منافعوں پر ۲۵٪ سپیشل انکم ٹیکس لگا دیا گیا۔

جنگ کے دوران کالی دولت جمع کرنے والوں سے ٹیکس وصول کرنے کے لیے تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ شروع شروع میں اس بجٹ کو سب نے خوب پسند کیا لیکن جب اس کی زد میں موٹے موٹے لالے آ گئے۔ اور جب ان سب لالوں نے مل کر، دلبھ بھائی پٹیل کے پاس آ کر کہا: کہ آئندہ کانگرس کو چندہ نہیں دیا جائے گا کیونکہ وہی رقم اب سرکاری ٹیکسوں کی ادائگی میں چلی جائے گی، تو کانگرس کے حلقوں میں زبردست بے چینی محسوس کی جانے لگی اور وہی کانگرس جو شروع شروع میں اس بجٹ کی تعریف کر رہی تھی، یکایک اس کے مخالف ہو گئی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

کانگرس کے لیڈروں کو ابھی تک یہ گمان تھا کہ وزارت میں شامل ہونے کے بعد ان کی پوزیشن زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اس خیال کے گھمنڈ میں پنڈت نہرو نے صوبہ سرحد کا دورہ کرنا شروع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں ان کا استقبال نہایت گرم جوشی سے کیا جائے گا، لیکن جب وہ اس دورے کے لیے سرحد پہنچے تو ان کا سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ استقبال ہوا۔ اس سے ان کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ صوبہ سرحد کانگرس کی آغوش سے نکل چکا تھا۔

Marfat.com

ماؤنٹ بیٹن پلان
۱۹۴۷ء

سوال :۔ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے کن حالات میں آیا؟ اور ہندوستان کی سیاسی حالت کو درست کرنے کے لیے کیا پلان ساتھ لایا؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

جواب :۔ ہندوستان میں سیاسی حالات اب اس قدر نازک دور میں داخل ہو گئے تھے کہ ان کو سنبھالنا لارڈ ویول کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ کانگرس نے اس وائسرائے کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔

اوّل — یہ کہ لارڈ ویول اپنے ضمیر کے جاگ جانے پر مسلم لیگ کے لیڈر قائداعظم محمد علی جناح کا نقطۂ نظر آسانی سے سمجھنے لگے تھے۔ اور اس کو کسی حد تک اہم گرداننے لگے تھے۔

دوم۔ یہ کہ مسٹر گاندھی نے انگلستان میں مقیم کانگرسیوں کو خطوط لکھ دیئے تھے کہ وہ کانگرس کی حمایت اور لارڈ ویول کی مخالفت میں برطانوی کابینہ کی رائے ہموار کریں، اور اس سلسلے میں وہ وزیراعظم برطانیہ لارڈ اٹیلی پر زور دیں۔

مسٹر گاندھی کی چال کامیاب رہی۔ چنانچہ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو لارڈ اٹیلی نے اعلان کیا کہ بہت جلد لارڈ ویول کو واپس بلا لیا جائے گا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ برطانیہ اب یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اس کا ہندوستان میں زیادہ دیر تک اقتدار سنبھالے رکھنا کوئی مصلحت آمیز امر نہیں ہے اس لیے جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کے نمائندوں کو اقتدار منتقل کر کے برطانیہ ہندوستان خالی کر جائے گا۔

لارڈ اٹیلی کے اس بیان میں تحیر بھی تھا۔ اور تاسف بھی! اہل ہند کے لیے یہ بیان ہی مسرت کا موجب بنا۔

Marfat.com

لارڈ اٹیلی کے اس اعلان کو مارچ ۱۹۴۷ء میں عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لارڈ ویول کی جگہ نیا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو بحیثیت وائسرائے ہندوستان دہلی پہنچا لارڈ اٹیلی نے اس کو ہندوستان کے بارے میں ایک جامع منصوبہ دے کر روانہ کیا تھا لیکن اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے سے قبل اسے کہا گیا تھا کہ وہ بذات خود ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے تبادلہ خیالات کر کے ان کے نظریات سے آگاہ ہو جائے۔ اس ہدایت کے پیش نظر اس نے آتے ہی کانگرس کے لیڈر مسٹر جواہر لعل نہرو جو اس وقت برطانوی ہندوستان کی وزارت میں وزیر خارجہ کے عہدے پر متمکن تھا اسے ملاقات کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہرو سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس سے زیادہ اس کی جوان سال حسین بیٹی اندرا سے متاثر ہوا۔ جس کی گفتگو میں اسے غیر معمولی جاذبیت محسوس ہوئی۔ اندرا نے بچپن سیاسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور باپ کے ساتھ ساتھ بہت سے محاذوں پر سفر کی ختنت سے نظارہ ہی سے نظارہ کرتی رہی۔ اس سے اس کے سیاسی شعور کو جلا ملی۔ تاہم نہرو اور اندرا کی وجہ سے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بہت زیادہ سوچ بچار سے کام لینا پڑا۔ اس کے بعد اس نے دیگر کانگرسی لیڈروں سے تبادلہ خیالات کیا اور کانگرس کے نکتہ نظر سے بخوبی واقف ہوا۔ ویسے تو اس کو لارڈ اٹیلی نے پہلے ہی کانگرس کی ماہیت کو جتا کر اس کی حمایت کرنے کا سبق دے دیا تھا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن کو یہاں کے کانگرسیوں نے خود بھی ایسے جال میں جکڑ لیا کہ اس کا اس تانے بانے سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ اس کی نگاہ میں کانگرسیوں نے خود بھی ایسے سے صائب مشورے پنڈت نہرو اور اندرا کے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد ان کانگرسیوں سے بالکل بے تکلف ہو گیا۔ ادھر کانگرسی لیڈروں نے بھی وائسرائے کی اس بے تکلفی سے بہت فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ نہرو کی مرضی کے مطابق ماؤنٹ بیٹن دوروں کا پروگرام بنایا کرتا۔ اور ان دوروں میں نہرو کی مرضی کے مطابق مشیروں کو ہمراہ لیتا۔ ویسے سرکاری سطح پر اس نے مندرجہ ذیل مشیروں کا انتخاب کیا ہوا تھا۔

۱۔ لارڈ اسمے

۲۔ سر ایرک سیول

۳۔ جارج ششم کا اسسٹنٹ پرائیوٹ سیکرٹری

۴۔ وی۔ پی۔ مینن

۵۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔

۶۔ کیمبل جانسن (پریس اتاشی)

کانگرسی لیڈروں کی ملاقات کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگی رہنماؤں سے ملاقات

Marfat.com

کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے اس نے قائداعظم محمد علی جناح کو ملاقات کے لیے بلایا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ بھی کانگرسیوں کی طرح حصول مطلب کے لیے جائز و ناجائز اطوار خوشامد کا اظہار کریں گے اور فضول خوش گپیوں میں زیادہ وقت ضائع کریں گے لیکن قائداعظم کی سنجیدگی اور نفس مطلب کے موضوع پر بات چیت کرنے کے انداز سے وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا یہ لیڈر ہندوستانی ہندوؤں کی طرح وائسرائے کے مزاج کے اپنے مزاج میں سمونے کی کوشش کرے گا۔ لیکن ان کا خیال بالکل غلط ثابت ہوا اور اسے معلوم ہو گیا کہ مسلمان اپنے حصول مقصد کی جدوجہد میں واقعی سنجیدگی سے کوشاں ہیں۔ قائداعظم سے یہ ملاقات ۲۵ سنہ ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ دوران گفتگو لارڈ مونٹ نے قائداعظم سے سوال کیا کہ آپ کی پنڈت نہرو کے بارے میں کیا رائے ہے۔ لیکن قائداعظم نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ اب ان سے ملاقات کر چکے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ اب جیسا عظیم حاکم ان کے بارے میں کوئی مخصوص تاثر قائم کر چکا ہوگا۔ مونٹ بیٹن اس جواب سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے محسوس کر لیا کہ قائداعظم نے میری عانیت پر ضرب لگائی ہے تاہم وہ دل میں بغض و تعصب قائم کیے بغیر نہ رہ سکا۔

مرکزی کابینہ میں مسلم لیگ کے نمائندوں کی شمولیت سے ہندوؤں میں زبردست بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اور بالخصوص ان کی بے چینی میں اس وقت گوناگوں اضافہ ہو گیا جب خان لیاقت علی خان نے نئے سال کا بجٹ پیش کیا۔ ہندوؤں نے محسوس کر لیا کہ اب مسلمانوں کا ان کے اندر رہ کر کام کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے پٹیل کو برملا کہنا پڑا کہ اب وقت آگیا ہے کہ واقعی کانگرس اور مسلم لیگ مخلوط وزارت میں کام نہیں کر سکتیں۔ اب ملک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر ہی دینا مصلحت پر مبنی ہوگا۔

مونٹ بیٹن پہلے ہی تقسیم ہند کا منصوبہ لے کر انگلستان سے روانہ ہوا تھا۔ اور جب اس نے یہاں پہنچ کر کانگرسی لیڈروں کے خیالات کا جائزہ لیا۔ تو بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس کے خیال میں تقسیم ہند کا منصوبہ جو وہ برطانیہ سے لے کر روانہ ہوا تھا۔ کانگرس کے لیے مشکل ہی سے قابل قبول تھا تاہم اس میں اس نے اپنی زبردست کامیابی محسوس کی۔ کہ بغیر کسی دقت کے مسلم لیگ اور کانگرس کے مطالبات کو تسلیم کرنے کے مواقع از خود ہی میسر آگئے ہیں۔ اور زیادہ پیچیدگیوں اور دھندلکوں میں نہیں الجھنا پڑا۔

ادھر مسٹر گاندھی کو یہ بات بالکل ناگوار گذری کہ ہندوستان کے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ لیکن کانگرس چونکہ اس بات پر بہ اتفاق رائے کا اظہار کر چکی تھی اس لیے اس نے مسلم لیگ کو ناکام سیاسی جماعت ثابت کرنے کے لیے ایک اور سیاسی چال چلی اور حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا کہ مسلم لیگ کو اگر ہندوستان میں مسلم لیگی وزارت قائم کرے اور سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں

Marfat.com

لے لے۔ گاندھی کو معلوم تھا۔ کہ اول تو برطانوی حکومت اس مشورے پر عمل نہیں کرے گی۔ اور اگر اس نے ایسا کر بھی لیا۔ تو مسلم لیگی حکومت کو ناکام بنانے کے لیے ہندو اکثریت کی پورے ملک میں گڑبڑ ایک موثر ہتھیار ثابت ہوگی چنانچہ مسٹر گاندھی کا یہ مشورہ زبردست منافقت، شرارت اور مکروہ سیاست پر مبنی تھا۔ تاہم انگریزنے گاندھی کی اس تجویز کو ردی کے ٹوکرے میں ڈال دیا۔

لارڈ مونٹ بیٹن نے بات چیت کا پہلا دور بڑی کامیابی سے مکمل کیا۔ اس نے فوراً تقسیم ہند کے منصوبے جس میں صوبوں کی تقسیم، ضلع سلہٹ کے مشرقی بنگال سے ملنے اور سرحد میں نئے انتخابات کی شرائط درج تھیں۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۷ء تک مکمل کر لیا۔ اس کی رو سے صوبوں کو پہلے آزاد کیا جانا تھا پھر ہندو مسلم کی اکثریت کی بنا پر گروپ سازی کرتے۔ اور الگ الگ ڈومینین بنا لیتے۔ وائسرائے کے مشیر مسٹر دی پی مینن نے اس منصوبے کو ناقابل عمل قرار دے دیا۔ تاہم ۱۵ر ۱۶ر اپریل ۱۹۴۷ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے اس منصوبے کو صوبائی گورنروں کی ایک کانفرنس میں پیش کر دیا۔ تمام گورنروں نے اس منصوبے کے اس قدر جلدی تیار ہو جانے پر حیرت کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی منظوری بھی دے دی وائسرائے کے دوسرے سرکاری مشیر مسٹر اسمے اس منصوبے کو لے کر برطانوی کابینہ کی منظوری حاصل کرنے کے لیے ۲ مئی ۱۹۴۷ء کو انگلستان روانہ ہوئے۔ وائسرائے نے اس منصوبے کی ترسیل کے ساتھ ساتھ چٹھی میں یہ بھی تحریر کر دیا۔ کہ اس منصوبے کو دونوں جماعتوں یعنی کانگرس اور مسلم لیگ کی حمایت حاصل ہے نیز یہ بھی تحریر کر دیا کہ اس کی منظوری ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء تک یہاں موصول ہو جانی چاہیئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مونٹ بیٹن جس عجلت سے کام لے رہا تھا۔ اس پر دونوں فریقین حیران تھے۔ کیونکہ ۲۰ر فروری کے اعلان کے مطابق ہندوستان سے برطانوی اقتدار کی رخصتی جون ۱۹۴۸ء کو ہونے والی تھی۔

لارڈ اسمے کو لندن روانہ کر کے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن شملہ روانہ ہو گیا۔ اب کانگرس نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے ٹکڑے ہونے ہی لگے ہیں۔ کیوں نہ کوئی ایسی چال چلی جائے جس سے مسلمانوں کو ملنے والے علاقوں میں کمی ہو سکے۔ اس کے لیے سردار پٹیل بھائی پٹیل خود شملہ پہنچا جہاں اس کو وائسرائے سے تنہائی میں بات چیت کرنے کا وافر موقع مل گیا۔ اس ملاقات کے دوران اس نے لارڈ مونٹ بیٹن کو بتایا کہ جو منصوبہ منظوری کے لیے برطانیہ روانہ کیا گیا ہے وہ بالکل نامناسب ہے۔ کانگرس نے حالات کے تحت اس کو قبول تو کر لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔ اس پر عمل درآمد سے ہندوستان کا امن و سکون ہمیشہ کے لیے خطرے میں پڑ جائے

Marfat.com

گا۔ اور برطانوی مفادات کو عمومی سطح پر اور وائسرائے ہند کو خصوصی سطح پر سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پٹیل نے اس قسم کی لغو باتیں کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ کانگرس ہندوستان کے لئے نوآبادیات قبول کرنے کو تیار ہے۔ بشرطیکہ دو ماہ کے اندر اقتدار منتقل کر دیا جائے اس سے کانگرس کو یہ فائدہ تھا کہ مسلم لیگ کے لیے برطانیہ سے سودے بازی کرنے اور اپنے حصے حاصل کرنے کے لیے بہت کم وقت رہ جاتا۔ ہزاروں مسائل حل طلب سامنے آجاتے۔ اور ان کا اتنے تھوڑے عرصے میں حل کیا جانا ناممکن بات تھی۔ واضح ہے کہ ان حالات میں لوٹ کھسوٹ سے ہندوستان پاکستان کے حصے کی بے شمار چیزیں اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مونٹ بیٹن کو ذاتی سطح پر زبردست منفعت کا وعدہ کیا۔ جو کانگرس کی طرف سے پارٹی کی بنیادوں پر مہیا کی جاتی تھیں اس سلسلے میں نہرو سے بھی مذاکرات ہوئے اور کرشنا مینن سے بھی۔ اور اس نے بھی پٹیل کے اس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا۔ مونٹ بیٹن کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی ایک تو وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو رہا تھا جس کی تکمیل کے لیے اسے یہاں بھیجا گیا تھا اور دوسرے اس کو لارڈ اٹیلی کی خواہش کے مطابق کانگرس کی حمایت کا موقع مل رہا تھا۔ اور تیسرے یہ کہ اسے ذاتی سطح پر بہت سے مفادات کا حصول ہو رہا تھا۔ اب اس کو پاکستان سے کیا ہمدردی تھی۔ مسلم لیگ کے مفادات اس کی نظر میں ذاتی نقصان کا موجب تھے چنانچہ پاکستان کے وجود کو نقصان پہنچانے کے لیے کانگرس کا یہ وار خالی نہ گیا۔

لارڈ مونٹ بیٹن کے ذہن میں اب ملک کی تقسیم کے ساتھ ذاتی منفعت کا بھی خیال تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ لارڈ اسمے کی وساطت سے بھیجے ہوئے منصوبے کی برطانوی منظوری تھوڑی سی ترامیم کے ساتھ وصول ہو گئی۔ جسے ۱۷ مئی ۱۹۴۷ء کو دہلی میں مشترکہ جماعتوں کے ایک اجلاس میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح۔ اور لیاقت علی خاں نے شامل ہونا تھا۔ کانگرس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل نے شرکت کرنا تھی۔ سردار بلدیو سنگھ نے اقلیتوں کی نمائندگی کرنا تھی۔ کانگرس کے ارکان لارڈ مونٹ بیٹن کے پہلے ہی کان بھر چکے تھے۔ وہ اس منصوبے کی منظوری سے بہت ہی سیخ پا ہوئے۔ کانگرس کے اس رویے پر لارڈ مونٹ بیٹن نے مسٹر مینن کو کانگرس کا قابل قبول منصوبہ تیار کرنے کو کہا۔ ایسا منصوبہ جس کا تصور پہلے ہی اس کو شملہ میں دے دیا گیا تھا۔ مسٹر مینن کے پاس چونکہ پہلے ہی پلان تیار تھا اس لیے وہ چار گھنٹے کے اندر اندر اس کا مسودہ لے آیا۔ اس مسودے کی وصولی پر لارڈ مونٹ بیٹن نے وزیراعظم

Marfat.com

برطانیہ کو ایک تار بھیج دیا۔ کہ قبل ازیں ارسال کردہ دہ مسودہ جس میں ہندوستان کی تقسیم کا ذکر ہے کو منسوخ تصوّر کیا جائے۔ اس کی جگہ ایک نیا منصوبہ روانہ کیا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی والسرائے نے ۱۷ رمئی کو ہونے والے اجلاس کو ۲ رجون ۱۹۴۷ء تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ ۱۴ رمئی ۱۹۴۷ء کو والسرائے دہلی پہنچا تو اسے برطانوی وزیراعظم کی طرف سے حکم ملا کر فی الفور لندن پہنچو۔ کیونکہ اب کا ثانوی منصوبہ وضاحت طلب ہے۔ اب ماؤنٹ بیٹن مسلم لیگ کو تاریکی میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ انگلینڈ میں اس سے سب سے پہلا سوال یہ ہوگا کہ دوسرے منصوبے کی منظوری مسلم لیگ سے بھی حاصل کی گئی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ۱۷ رمئی ۱۹۴۷ء کو اس نے مسلم لیگ اور کانگرس کا ایک اجلاس طلب کیا۔ نہرو اور دیگر کانگرسی لیڈر اب بھانڈا پھوٹنے کی وجہ سے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک ایسا متبادل منصوبہ لے کر اجلاس میں پہنچے۔ جو مسلم لیگ کے لیے بھی قابلِ قبول نہ ہو سکتا تھا۔ یعنی وہی کانگرس کی حکومت سے مسلم لیگ کے حق میں دست برداری والا منصوبہ۔ اجلاس میں ایسا ہی ہوا۔ جب دوسرے منصوبے کو تسلیم کرنے سے مسلم لیگ نے انکار کر دیا۔ تو نہرو نے دست برداری والا منصوبہ پیش کر دیا۔ قائداعظم نے اس کو بصد مسرت قبول کر لیا۔ اس طرح کانگرس کا یہ وار خالی گیا۔ اسی اجلاس میں ماؤنٹ بیٹن کی جانبداری واضح ہو گئی۔ جب کہ اس نے مسلم لیگ کو اس فیصلے کو تسلیم کرنے کی حرکت کو غیر مستحسن قرار دیا۔ اور کہا کہ بات یہیں چھوڑ دی جائے۔ میں خود انگلینڈ جا کر ضروری ہدایات لے کر آتا ہوں۔ چنانچہ ۲۸ رمئی کو والسرائے اپنے ایک منیجر مینن کے ہمراہ انگلستان کے لیے روانہ ہو گیا۔ انگلستان پہنچ کر فی الفور کابینہ کا اجلاس طلب کروایا۔ اور کانگرس لیڈروں کے تیار کردہ منصوبے کی منظوری پانچ منٹ کی بحث کے بعد حاصل کر لی۔ کابینہ کے اس اجلاس میں لارڈ مونٹ بیٹن نے دھمکی دی۔ کہ اگر اس منصوبے کو منظور نہ کیا گیا۔ تو میں واپس ہندوستان نہیں جاؤں گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ شاہی خاندان کے اس لالچی شخص نے صرف چند منٹوں میں کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ کروا لیا۔ اور بصد خوشی واپس ہندوستان آیا۔

ماؤنٹ بیٹن کے اس پلان میں دو باتیں حیرت انگیز نوعیت کی تھیں۔ ایک یہ کہ جو صوبے مسلم لیگی اکثریت کے تھے صرف ان کو ایک علیحدہ مملکت بنانے کی تجویز پیش کی گئی۔ اور ایسے صوبے جہاں مسلم اکثریت ہے، ان کو آبادی کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا۔ اس طرح ایک اور مسئلہ درپیش ہوا کہ ملک کے کون کون سے جغرافیائی علاقے بھارت یا پاکستان میں شامل کیے جائیں۔ اس

Marfat.com

کے ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ ہوا کہ صوبہ سرحد کی حیثیت متعین کرنے کے لیے وہاں ریفرنڈم کرایا جائے۔ آیا وہاں کے لوگ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا مکمل آزادی کے طالب ہیں دوسرے لفظوں میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان کو ملنے والے علاقوں میں ایک تو خود ہی تخفیف کر آئے۔ اور دوسرے مزید کمی کرنے کے لیے مذکورہ بالا شرائط کو اس منصوبے میں شامل کروائے وہ برطانوی کابینہ کو اس بات پر رضامند کروا آئے کہ جون ۱۹۴۸ء کی بجائے برطانیہ اگست ۱۹۴۷ء ہی میں اقتدار کی منتقلی کا اعلان کردے۔ یاد رہے کہ اس عجلت میں کانگرس کی طرف سے دیا گیا لالچ شامل تھا۔ چنانچہ ملک کی تقسیم میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بندر بانٹ کروانے کے لیے ایک اور چال یہ چلی جس کو ریڈکلف ایوارڈ کے حصول کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔

Marfat.com

ہندوستان کی تقسیم کا اعلان

۳ جون ۱۹۴۷ء

سوال ۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستان کی تقسیم کی منظوری کا اعلان ۳ جون ۱۹۴۷ کو کیا ۔ اس اعلان میں کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے علاوہ سکھ نمائندے نے آل انڈیا ریڈیو سے تقریر نشر کی ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اس اعلامیہ کی چیدہ چیدہ باتوں پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے ۔

جواب ۔ یہ بات تو واضح تھی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ لے کر ہی ہندوستان کی سرزمین پر آیا تھا ۔ اب صرف دیکھنے کی بات یہ تھی کہ اس تقسیم کو کس انداز سے کارفرما کیا جاسکتا ہے اور کس طرح کانگرس کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے کر کم از کم سرزمین پاکستان کو دی جاسکتی ہے ۔

اس کی آمد کے ابتدائی دنوں ہی میں کانگرس کے لیڈروں نے اس سے ملاقاتیں کر کے کانگرس کا موقف وائسرائے پر اس طرح واضح کیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر کانگرس نواز بن چکا تھا ماؤنٹ بیٹن کو کچھ تو لارڈ ایٹلی کے نظریات نے ایک خاص فیصلہ کرنے کے لیے متاثر کیا ہوا تھا ۔ کچھ کانگرسی لیڈروں کی سحر کاری اور مکاری نے اس کو اور زور غلا دیا تھا ۔ تاہم اس نے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرنے کی تائید میں عمل کیا جو کانگرس نے اس کو سمجھائے تھے ۔

نہرو کی خوبصورت بیٹی نے سماجی اور اخلاقی محاذ پر انگریزی حکمران کے دل کو لبھایا اور بہت سے مسائل کو حل کرانے میں خاطر خواہ مدد کی ۔ انہی ملاقاتوں کے دوران خود پٹیل نے اپنی زبان سے ملک کو تقسیم کرنے کی پیش کش کر دی تھی جس سے ماؤنٹ بیٹن کی مشکل اپنے آپ حل ہو گئی تھی اور اس کو زیادہ دیر تک سیاسی میدان ہموار کرنے میں کوئی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا ۔ اب سوال یہ تھا کہ کس طرح ملک کی جغرافیائی حدود کو متعین کیا جائے اس کے لیے وائسرائے نے کانگرس کے لیڈروں کی مدد سے ایک منصوبہ تیار کیا جس کو اس نے ۱۹۴۷ سنہ کو ہونے والی سیاسی لیڈروں کی کانفرنس میں پیش کر دیا ۔

یاد رہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے خود جو منصوبہ تیار کیا تھا اس کو اس نے ۱۷ مئی کے اجلاس میں پیش کرنا تھا لیکن کانگرس کی بر وقت مداخلت کی بنا پر اس نے یہ میٹنگ ۲ جون تک ملتوی

Marfat.com

کر دی تھی اور ان پندرہ دنوں میں کانگرس کی خواہش کے مطابق ترمیم شدہ مسودے کا منصوبہ تیار کر لیا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن کو پٹی پڑھائی تھی کہ پاکستان کی تشکیل کو ناکام بنانے اس ملک کی انتظامیہ کو نقصان پہنچانے اس کے وجود کو کمزور کرنے اور تقسیم ملک کی صورت میں پاکستان کے حصے میں آنے والی ضروری چیزوں میں گڑبڑ کرنے اور انہیں ہندوستان میں روکے رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ ہندوستان کو دو ماہ کے اندر تقسیم کر دیا جائے اور پاکستان کو انتظامی امور حوالے کر دیئے جائیں۔ وسائل زندگی کی کمی۔ ذرائع آمدنی کے فقدان۔ فوج کی عدم موجودگی اور سول سروس کے نابید ہو جانے سے یہ ملک زیادہ دیر تک سانس نہیں لے سکے گا اور بہت جلد دم توڑ دے گا۔ جس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان خود بخود متحد ہو کر اکھنڈ بھارت کی صورت اختیار کر لے گا۔

ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان میں قدم رکھتے وقت اس امر کا احساس تھا کہ وہ برطانوی حکومت کی طرف سے اس برصغیر کے آخری حکمران ہیں لیکن دلی طور پر ان کو ہندوستان پر اور زیادہ دیر تک حکومت کرنے کی آرزو تھی۔ اس آرزو کا اظہار اس نے ایک دفعہ پنڈت نہرو کے سامنے ان الفاظ میں کیا۔

> "مسٹر نہرو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ آخری وائسرائے نہ سمجھیں جو برطانوی راج کو ختم کرنے آیا ہے۔ بلکہ وہ پہلا وائسرائے سمجھیں جو نئے ہندوستان کو راستہ دکھانے آیا ہے۔"

ان الفاظ سے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ نئے ہندوستان میں بھی گورنر جنرل بننا چاہتا ہے پنڈت نہرو وائسرائے کے اس اشارے کو سمجھ گئے اور اسی وقت وائسرائے سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں نئے ہندوستان کا سربراہ تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ نئے ہندوستان کا سربراہ بننے کی رشوت ماؤنٹ بیٹن کے لیے اس رشوت کے علاوہ تھی جس کا وعدہ مسٹر پٹیل۔ مسٹر کرشنا مینن اور اندرا نہرو نے اس کو دینے کا کیا تھا۔

۲ جون ۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے جو اجلاس طلب کیا۔ اس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح اور خان لیاقت علی خاں نے شرکت کی اور کانگرس کی طرف سے پنڈت نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل شامل ہوئے جبکہ دوسری اقلیتوں کی نمائندگی کرنے کے لیے

Marfat.com

سردار بلدیو سنگھ اجلاس میں شرکت کے لیے آئے۔

ان پانچ نمائندوں میں سے چار مرکزی وزارتی کابینہ کے رکن تھے اور صرف قائداعظم کابینہ سے باہر تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے ایک طویل تقریر کی جس میں اس نے اپنے ماضی کے تجربات اور تقسیم ہند کے فیصلے کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

اس طویل تقریر کے بعد اس نے تمام موجود ارکان سے منصوبے کے اطلاق کے لیے اظہار رائے کو کہا۔ کانگریسی لیڈروں نے تو اس کو تالیوں کی گونج میں منظور کیا جبکہ قائداعظم نے نہایت سنجیدگی اور تاسف سے اس کو قبول کیا، قائداعظم کو اس وقت کیا معلوم تھا کہ جس علاقے کا تعین پاکستان کی تشکیل کے لیے کیا گیا ہے، اس کے بارے میں بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگریسی لیڈروں کی نیت خراب ہے اور خود ساختہ اصولوں کی قینچی سے اس پاک سرزمین کے بہت سے حصے کو مزید کاٹ لیا جائے گا۔

تاہم ۲ر جون کو اس اجلاس میں منظوری حاصل ہو جانے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے خواہش ظاہر کی کہ تمام لیڈر اپنے اپنے نظریات کو اسی فیصلے کی روشنی میں بذاتِ خود نشری طریقے سے واضح کریں۔

چنانچہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کی شام کو سب سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے آل انڈیا ریڈیو سے ملک کو تقسیم کر دینے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ یہ تقسیم جون ۱۹۴۸ء کی بجائے اسی سال کر دی جائے گی اور دو نئی حکومتوں کی تشکیل تقریباً ڈھائی ماہ تک کر دی جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ اس کمیشن کی طرف سے دیئے گئے ایوارڈ میں واقعی وہی خطوط وحدود ہوں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں اس میں کچھ نہ کچھ تغیر و تبدل کا امکان ہے تاہم یہ فیصلہ کمیشن کارروائی کے بعد منظر عام پر آئے گا۔

وائسرائے کے ان الفاظ میں بدنیتی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ تاہم اس وقت اس پر تنقید کرنا قبل از وقت بات تھی اس لیے تمام نمائندگانِ مسلم لیگ خاموش رہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا۔

"اعلان میں ایک طرف اس کا امکان ہے کہ بعض علاقے ہندوستان سے الگ ہو جائیں گے اور دوسری طرف کامل آزادی کی راہ میں بہت بڑی ترقی ہے"

Marfat.com

قائداعظم نے فرمایا:

''جو وزنی اور مشکل کام ہمیں انجام دینا ہے اس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی خصوصاً ہندوستانی لیڈروں پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس لیے ہمیں چاہیئے کہ اپنی تمام قوتیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ انتقال اقتدار پُرامن طریقے سے اور ترتیب سے عمل میں آئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ چند اہم معاملات میں یہ منصوبہ ہمارے نکتۂ نظر کے مطابق نہیں ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے اور نہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس منصوبے میں جس طرح بعض معاملات طے کیے گئے ہیں اس سے ہم مطمئن ہیں یا نہیں اس پر ہمیں ابھی غور کرنا چاہیئے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ آیا یہ منصوبہ جس طرح کہ ملک معظم کی حکومت نے پیش کیا ہے ہم سمجھوتے کے طور پر قبول کریں یا فیصلے کے طور پر۔ میں اس معاملے میں یہ نہیں چاہتا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے فیصلے سے پہلے جس کا اجلاس ۹ جون کو طلب کیا گیا ہے خود اپنا فیصلہ دے دوں اور ہمارے دستور سابقہ مثالوں اور معمول کے مطابق آخری فیصلہ کونسل ہی کر سکتی ہے لیکن جہاں تک میں مجموعی طور پر دہلی میں مسلم لیگ کے حلقوں کے تاثرات کا اندازہ لگا سکا ہوں وہ امید افزا ہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ آخری فیصلہ کرنے سے قبل اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ منصوبے کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ میں نے صوبہ سرحد کی مسلم لیگ سے اپیل کی کہ وہ اپنی پُرامن سول نافرمانی کی تحریک واپس لے کر استصواب رائے عامہ میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے سرگرمی کے ساتھ تنظیم کرے اور وہاں کانگرسی اثر و رسوخ کو یکسر ختم کر دے۔

آزادئ ہند کا قانون (جولائی ۱۹۴۷ء)

سوال۔ آزادئ ہند کے قانون مجریہ ۱۹۴۷ء پر نوٹ تحریر کریں۔

انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء:

ہندوستان کی تقسیم کے منصوبے کو جس کا اعلان ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے نے آل انڈیا ریڈیو پر کیا اور جس کے بارے میں ہندوستانی لیڈروں نے اپنے اپنے تاثرات اسی روز براڈکاسٹ کیے۔ کو ایک مسودہ قانون کی صورت میں ۴؍جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں منظوری کے لیے پیش کر دیا گیا۔ اس میں تجویز کیا گیا کہ ہندوستان کی تقسیم ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء سے عمل میں آجانی چاہیے۔ اس برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کرکے دو نئی سلطنتیں قائم کی جائیں جن میں ایک کا نام "ہندوستان" (بھارت) اور دوسرے کا نام "پاکستان" رکھا گیا ہے ان دونوں نئی کشوروں کو اپنی اپنی آئین ساز اسمبلی بنانے کا اختیار ہوگا اور وہ اپنی ضرورت کے مطابق آئین مرتب کریں گے ریاستوں کے بارے میں واضح کیا گیا کہ وہ برطانوی تسلط سے آزاد ہیں۔ ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ان دونوں میں سے جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ دونوں ملکوں میں نیا آئین نافذ ہونے تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نافذ رہے گا۔ چودہ دن کی بحث کے بعد آخرکار ۱۸؍جولائی ۱۹۴۷ء کو یہ بل قانون کی صورت میں منظور کر لیا گیا۔ اس قانون کی رُو سے پاکستان ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگیا۔

اسی قانون کی رُو سے وائسرائے کو اختیار دیا گیا کہ وہ انتقالِ اقتدار کی رسموں کو حکومت برطانیہ کی طرف سے سرانجام دے چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سب سے پہلے پاکستان کو اقتدار حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے وہ چودہ اگست ۱۹۴۷ء ہی کو کراچی پہنچا اور انتقال حکومت کی رسم ادا کی۔ قائداعظم محمد علی جناح کو پاکستان کا سب سے پہلا گورنر جنرل بنایا گیا جبکہ وزارتِ عظمٰی کے منصب کو خان لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا۔

تشکیل پاکستان کانگرس اور ہندوؤں کے عزائم کی شکست کا آئینہ دار تھا اور مسلمانوں کو مسلسل پُرخلوص اور قابلِ تحسین جدوجہد کا ایک نادر ثمرہ تھا۔

Marfat.com

ریڈکلف ایوارڈ (۱۹۴۷ء)

سوال۔ ریڈکلف کو کن حالات میں ہندوستان میں مدعو کیا گیا اور اس نے کیا ایوارڈ دیا؟ "ریڈکلف ایوارڈ" کی بنا پر پاکستان کی تشکیل میں کیا کیا نقصانات پہنچے اور کس نے کس حد تک انصاف اور حقیقت کے تقاضوں کو پامال کیا؟

جواب۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے اپنے ۲ رجون کے لیڈروں کی میٹنگ میں اشارہ کر دیا تھا کہ جو سرحدیں پاکستان کے لیے تجویز کی جا رہی ہیں۔ ان میں ردوبدل کا امکان ہے اور اس مقصد کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے تاہم تقسیم ہند کے لیے ایک اصول بھی معین کیا گیا تھا۔ اس اصول کے مطابق مسلم اکثریت والے صوبے اور دوسرے مسلم اکثریت والے علاقوں کو پاکستان کا جزو بنایا جانا تھا۔ اور اسی اصول کے تحت ۳ رجون کو ریڈیائی تقریر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو جغرافیائی حدود بیان کی تھیں۔ ان میں مکمل آسام کے علاوہ پنجاب کے ضلع گورداسپور کو بھی مغربی پنجاب کا جزو قرار دیا گیا تھا۔

تاہم مستقل بین الاقوامی سرحدوں کا تعین کرنے کے لیے برطانوی حکومت کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس میں دو نمائندے پاکستان کی طرف سے اور دو ہندوستان کی طرف سے لیے گئے۔ اس کمیشن کی سربراہی ایک انگریز جج مسٹر سیرل ریڈکلف کے سپرد کی گئی اور اس کے فیصلے کو آخری فیصلہ قرار دیا جانا تھا۔ مغربی سرحدوں کے تعین کے لیے کمیشن حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھا۔

۱۔ مسٹر سیرل ریڈکلف	چیئرمین	(حکومت برطانیہ)
۲۔ مسٹر جسٹس دین محمد	رکن	(پاکستان)
۳۔ مسٹر جسٹس محمد منیر	"	"
۴۔ مسٹر جسٹس مہرچند مہاجن	"	(ہندوستان)
۵۔ مسٹر جسٹس تیجا سنگھ	"	"

پنجاب باؤنڈری کمیشن میں سکھ نمائندے سردار بلدیو سنگھ کو بھی شامل کر لیا گیا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ریڈکلف کو بین الاقوامی سرحدوں کے جغرافیائی تعین کے لیے مقرر کیا گیا تھا

Marfat.com

اور ان کے فیصلے کو آخری فیصلہ تصور کیا جاتا تھا۔ مسلم لیگی اور کانگرسی ارکان محض امدادی ارکان تھے۔ ناطق فیصلہ ریڈ کلف کا ہونا تھا۔

ریڈ کلف ۸ رجولائی ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچا اور آتے ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ ریڈ کلف زندگی میں پہلی مرتبہ ہندوستان آیا تھا اور ہندوستانی تنازعے سے صرف دستاویزی حد تک واقف تھا لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس کے آتے ہی کان بھرنا شروع کر دیئے اور اس کو سرگوشی کرتے ہوئے بتادیا کہ ہندوستان کی تقسیم کا اعلان میں کر تو چکا ہوں اور کانگرس نے انگریزی حکام کی برتری کو قبول کرتے ہوئے اپنا پہلا گورنر جنرل بھی مجھے ہی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک پاکستان کی نسبت ہندوستان کے مفادات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے میں نے پنجاب کی سرحدوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مجھے بعد میں کانگرسی رہنماؤں نے بتایا کہ جب تمام ریاستوں کو خود مختاری حاصل ہو گئی ہے اور اس خود مختاری سے انہیں اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ جس ملک سے چاہیں الحاق کر لیں تو ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہندوستان کی عظیم ریاست کشمیر کے الحاق کا مسئلہ مشکل کا باعث بن جائے گا کیونکہ موجودہ صورت میں کشمیر ہندوستان سے بالکل کٹ کر پورے کا پورا پاکستان کے ساتھ جغرافیائی الحاق پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے کچھ ایسی سرحدوں کا تعین ہونا چاہیے جس سے ہندوستان کی ڈائریکٹ رسائی کشمیر تک ہو جانی چاہیے۔ جہاں تک اس کے الحاق کرنے کا تعلق ہے اس کے لیے بھارت بعد میں راہ ہموار کر لے گا۔

اس کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن نے یہ بات بھی زوردار الفاظ میں کہی کہ میں نے ہندوستان والوں کو پہلے سے بتادیا ہوا ہے کہ ۳ رجون کی نشری تقریر میں بتائی گئی سرحدوں میں تغیر و تبدل کا امکان ہے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکے پاکستانی سرحدوں کو زیادہ سے زیادہ غتر بود کرنا چاہیے۔ ریڈ کلف نے ماؤنٹ بیٹن کے ان الفاظ کو دل و دماغ میں بٹھا لیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کانگرس کی طرف سے دیئے جانے والی بے مثال رشوت کی جھلک بھی دے دی جس میں نقد رقم کے علاوہ بے شمار ہیرے جواہرات اور دیگر سودمند اشیاء شامل تھیں۔ اس طرح برطانیہ کا ایک نمائندہ منصب انصاف کے تقاضوں کو رشوت و جانبداری کے پاؤں تلے روندنے کے لیے ہمہ تن تیار ہو گیا اور اس نے حتی المقدور ایسا کر بھی دیا۔

مشرقی سرحد کے تعین کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے نمائندے حسب ذیل تھے۔

Marfat.com

۱۔ مسٹر سیرل ریڈ کلف چیئرمین حکومت برطانیہ
۲۔ مسٹر ابو صالح محمد اکرم رکن پاکستان
۳۔ مسٹر ایس۔ اے۔ رحمٰن " "
۴۔ مسٹر سی۔ سی۔ بواس " ہندوستان
۵۔ مسٹر بی۔ اے مکرجی " "

اس کمیشن نے ۲۲ جولائی کو اپنا کام شروع کر دیا جبکہ وہ تمام حالات کا جائزہ لے چکا تھا۔ ابھی حد بندی کے نزاعی نکات کمیشن کے سامنے بھی نہ آئے تھے کہ ریڈ کلف نے جسٹس دین محمد کے ساتھ ہوائی جہاز میں پنجاب کے خاص علاقے یعنی ضلع سرگورداسپور اور ضلع فیروز پور پر پرواز کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس پرواز سے وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جغرافیائی لحاظ سے کس حد تک کشمیر کو ہندوستان سے ملحق کیا جا سکتا تھا اور مغربی پنجاب کو خشک سالی کا شکار کرنے کے لیے کس حد تک ضلع فیروز پور کے آبی راستوں کو ہندوستان کے حوالے کر سکتا تھا۔

ریڈ کلف کی اس بدنیتی کو جسٹس دین محمد فوراً بھانپ گئے اور صحت کی خرابی کا بہانہ کر کے ریڈ کلف کے ساتھ پرواز کرنے سے معذرت چاہی اور خود فوراً قائد اعظم کے پاس پہنچے اور اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ قائد اعظم اگرچہ معاملہ کو خوب سمجھتے تھے لیکن ایک قانون دان ہونے کی صورت میں اس شک کو کس طرح مادی صورت میں بیان کر سکتے تھے۔ یہ اس کا کس طرح اظہار کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے جسٹس دین محمد کو خاموش ہی رہنے کی تلقین کی۔

قائد اعظم کے اس فیصلے کے سامنے انہوں نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور کمیشن کی کارروائی میں شرکت جاری رکھی جسٹس دین محمد کی غیر حاضری میں ریڈ کلف نے جسٹس محمد منیر کو پرواز کے لیے اپنے ہمراہ چلنے کو کہا لیکن عین وقت پر موسم کی خرابی کی بنا پر پرواز منسوخ کر دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کانگرسی لیڈروں نے ریڈ کلف کو پنجاب کا ایک نقشہ پیش کر دیا تھا جس میں بین الاقوامی سرحدوں کا تعین انہوں نے خود ہی کر دیا تھا۔ اس نقشے میں انہوں نے ضلع گورداسپور کی تحصیلوں کو ہندوستان کا علاقہ ظاہر کر دیا تھا اور بہانہ یہ کیا گیا کہ ان علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ حالانکہ اکثریت کا تعین ضلعی سطح پر ہونا تھا۔

گورداسپور، پٹھانکوٹ اور بٹالہ کو ہندوستان میں شامل کر دیا گیا اس کا اصل مقصد ہندوستان کو کشمیر میں داخل ہونے کے لیے براہ راست راستہ دینا تھا کیونکہ اگر یہ تحصیلیں پاکستان

Marfat.com

کا جزو بن جائیں تو ہندوستان کا کسی صورت بھی کوئی تعلق باقی نہ رہ سکتا تھا فیروز پور کی تحصیل زیرہ اور ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کو ۳ رجون کے اعلان کے مطابق پاکستان کا جزو قرار دیا گیا تھا۔ یہ علاقے آبی راستوں کی گزرگاہ کے سلسلے میں پاکستان کے لیے بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ کانگرسی لیڈروں نے مغربی پنجاب کو خشک سالی کا شکار کرنے کے لیے ریڈ کلف کو جو نقشہ دیا اس میں حد کی لکیر کھینچتے ہوئے ان دونوں تحصیلوں کو ہندوستان میں شامل دکھا دیا گیا۔ پاکستانی ارکان نے اس پر بحث کرنے کے لیے ریڈ کلف کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو ریڈ کلف نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے ان دونوں نمائندوں کو کہہ دیا کہ آپ فکر مت کریں تحصیل پٹھانکوٹ۔ گورداسپور۔ نکودر اور زیرہ کو پاکستان ہی کا جزو دکھایا جا رہا ہے اور میں اپنے آخری فیصلے میں اس کا ذکر کر دوں گا پاکستانی نمائندوں نے اس دروغ گوئی پر مبنی یقین دہانی پر اعتبار کیا اور خاموشی اختیار کر لی۔

ریڈ کلف نے اپنی آخری رپورٹ ۹ راگست کو وائسرائے کو پیش کر دی۔ چونکہ اس رپورٹ پر کمیشن کے تمام ارکان کی آراء کو شامل کیا جانا تھا۔ اس لیے اس رپورٹ کو حقائق پر مبنی معاملات پر تیار کیا گیا۔ اور ریڈ کلف نے وقتی طور پر ارکان کو مطمئن کر دیا۔ ریڈ کلف کے اس ایوارڈ کو گیارہ دن تک صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ ۱۴ راگست کو ملک کی تقسیم عمل میں آگئی اور اس ایوارڈ کا اعلان ۱۷ راگست ۱۹۴۷ء کو کیا گیا۔ ان گیارہ دنوں میں کمیشن نے بالکل اسی نقشہ کے مطابق سرحدوں کے تعین کا اعلان کر دیا جس کا نقشہ کانگرسی لیڈروں نے دوران تحقیقات دیا تھا۔ اس طرح وہ لوگ جو ان تحصیلوں میں اس خیال سے مطمئن ہو کر بیٹھے رہے اور نقل مکانی کا کوئی خیال ان کے نزدیک نہ بھٹکا۔ یکایک ہندوستان کی سرحدوں میں مقید ہو جانے کی صورت میں نہ صرف بے حد گھبرائے بلکہ خونریز فسادات کی نذر ہو گئے۔ ایک اندازے کے مطابق دو لاکھ مسلمان ان علاقوں میں ہندو غنڈوں کی بربریت کا شکار ہوئے۔

اس طرح ریڈ کلف نہایت دیدہ دلیری سے انصاف کی لاش کو ہندوستان کی سرزمین پر پھینک کر دائمی فساد کی آگ لگا کر واپس انگلستان روانہ ہو گیا۔

Marfat.com

حصولِ پاکستان کے بعد مسلمانانِ ہند کی

بے مثال قربانیاں ہندو مسلم فسادات

سوال۔ پاکستان کے حصول کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دیں۔ یہ قربانیاں اُن قربانیوں سے بہت زیادہ تھیں جو تشکیلِ پاکستان ۱۹۴۷ء سے پیشتر سالوں میں کی جانے والی جدوجہد میں دی گئی تھیں اس کی وجوہات بالتفصیل بیان کرتے ہوئے سیر حاصل تبصرہ کیجیے ؟

جواب۔ پاکستان کی تشکیل سے قبل اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست نظریاتی اختلاف تھا لیکن یہ اختلاف کبھی کبھی فساد کا موجب بنتا تھا۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں مسٹر گاندھی خود عدم تشدد کا قائل تھا۔ اور وہ فسادات سے ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اس لیے کانگرسی ہندوؤں کو اس کی ہمیشہ یہ تلقین رہی تھی کہ فسادات سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اگر کہیں فسادات رونما ہوتے بھی تو ان میں ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ جیسی انتہا پسند جماعتوں کے غنڈے زیادہ تر سرگرم عمل ہوتے۔ کانگرس میں چونکہ مسلمانوں نے بھی شرکت کر رکھی تھی اس لیے کانگرسی ہندوؤں کی طرف سے ایسے فسادات سے گریز ہی کیا جاتا تھا۔ کانگرس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہندوستان میں ایک متحدہ اور مخلوط نوعیت کی حکومت بنے اور ہندو مسلم اکٹھے ہو کر ایک آزاد حکومت قائم کریں۔ جب تک ان کے ذہن میں یہ بات رہی اس وقت تک فسادات کا دائرہ محدود رہا لیکن ۱۹۴۷ء میں کانگرسی ہندوؤں کو یقین ہو گیا کہ مسلمان اب ایک علیحدہ سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہیں۔ چنانچہ ان کے دلوں میں آتش انتقام بھڑک اٹھی وہ اس بات کو یکسر فراموش کر گئے کہ آزادی کی جدوجہد میں جس کانگرس نے سرگرمی دکھائی اس میں مسلمانوں کا ایک اہم حصہ رہا ہے اور ابو الکلام آزاد جیسے مدبر نے ہندوؤں کے مقصد کے حصول کے لیے کس قدر مؤثر انداز میں خدمات انجام دی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے آغاز میں ہی کانگرس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہندوستان کے ٹکڑے

Marfat.com

کرنے کا باعث مسلم لیگی ہی نہیں ہیں بلکہ مسلمان قوم ہے اگر یہ قوم ہندوستان میں نہ ہوتی تو انگریز کے چلے جانے کے بعد اکھنڈ بھارت کی تشکیل ایک لازمی عنصر تھا۔ ملک کی تقسیم ان کے دلوں میں زبردست غم وغصہ کا باعث بنی۔ اب وہ بلا امتیاز ہر مسلمان کے جانی دشمن تھے اور جہاں کہیں ان کا داؤ لگتا مسلمانوں کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

ان فسادات کی ابتداء دراصل کلکتہ سے ہو چکی تھی۔ جو پھیلتے پھیلتے ہندوستان کے تمام شہروں تک پہنچ گئی کسی جگہ تو جلدی لگ۔ کر جلدی بجھ گئی لیکن کسی جگہ اتنی دیر تک جاری رہی کہ ملک کی تقسیم ہو جانے کے بعد تک جاری رہی۔ ان علاقوں میں پنجاب کا علاقہ قابل ذکر ہے پنجاب کے بارے میں تو یہاں تک معلوم ہوا کہ یہاں پر انگریز کی سازش کے ساتھ قتل وغارت کی بہیمانہ وارداتوں کے لیے باقاعدہ ایک منصوبہ بنایا گیا تھا اور گورنر جینکنز اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو اس سازش کا پوری طرح علم تھا۔

فسادات کی سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ دو مختلف قومیں مختلف مقاصد کے لیے کوشاں تھیں غیر مسلموں میں تعصب انتہا کی حد تک بڑھ گیا تھا اور وہ اس تعصب کی آگ کو خون مسلم سے ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے۔ پنجاب میں سکھوں نے ہندوؤں کی طرف داری کی اور ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزمائی کی۔ حالانکہ سکھ قوم کو سوائے ایک فرد کی وقتی نمائندگی کے اور کچھ بھی نہ ملا۔ جس ہندو کے لیے وہ کوشاں تھے اس ہندو نے بھی سکھوں کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا اور یہ سکھ نامعلوم اس اجڈ خیال میں مغرق تھے کہ حصول آزادی کے ساتھ ساتھ وہ بھی ایک ملک حاصل کر سکیں گے جس کا نام سکھستان ہو گا لیکن ان کا یہ خواب تاحال شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا مغربی پنجاب کے سکھوں نے ہندو حمایت کی آڑ میں اس غرض سے مسلمانوں سے فسادات شروع کیے کہ انہیں ان کا مذہبی اہمیت کا حامل شہر ننکانہ صاحب اور کم از کم ایک نہری سسٹم ملنا چاہیئے۔ پنجاب سے ان کا یہ مطالبہ نہایت احمقانہ تھا۔ کیونکہ اگر انہیں کوئی ایسا مطالبہ رکھنا ہی تھا تو انہیں چاہیئے ہی تھا کہ وہ تقسیم ملک کے مذاکرات کے دوران جن میں سکھ نمائندہ بلدیو سنگھ خود بھی شامل تھا اسے اس وقت پیش کرتے جب سکھ مایوس ہوئے تو وہ سول سطح پہ جنگی حربوں میں اتر آئے اور نہایت دیدہ دلیری سے قتل وغارت میں مصروف ہو گئے۔ مشرقی پنجاب میں راشٹریہ سیوک سنگھ نے مذہبی تعصب کی بنا پر نہتے مسلمان شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔

Marfat.com

ہندو مہاسبھا نے آزاد ہندوستان کی خوشیاں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر منائیں
مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو قتل کرنا مہاسبھا کا شغل ہو گیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ کوئی مسلمان یہاں سے بچ کر پاکستان نہ پہنچ سکے گا۔ مہاجروں سے بھرپور ریل گاڑیوں کو نہایت بے دردی سے قتل و غارت کے ذریعے تباہ و برباد کیا گیا۔ مشرقی پنجاب میں مقیم مسلمانوں کی جائیدادوں کو نذر آتش کیا اور وہاں کے مکینوں کو پاکستان میں دھکیل دیا۔ غضب کی بات یہ ہے کہ ان بے بس مسلمانوں کے گھروں کو جب آگ لگا دی جاتی تو انہیں مخصوص مہاجر کیمپ میں پہنچا دیا جاتا جہاں سے وہ قافلوں کی صورت میں پاکستان کی جانب جب روانہ ہوتے تو راہوں میں سکھوں کے جتھے مسلح ہو کر حملہ آور ہو جاتے۔ مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور عورتوں کو اٹھا کر بھگا لے جاتے۔ بربریت کا یہ عالم تھا کہ نوجوان مسلمان دوشیزگان کی آبرو ریزی ان کے لواحقین کے سامنے ہی کی جاتی اور اگر کوئی مشتعل ہو کر انہیں روکنے کی کوشش کرتا تو اسے تلوار سے قتل کر دیا جاتا۔ ایک اندازے کے مطابق ان فسادات میں بارہ لاکھ سے زائد مسلمان قربان ہوئے اور ساٹھ لاکھ سے زائد مسلمانوں کو بے گھر ہو کر پاک سرزمین پر پناہ لینا پڑی۔ مسلمانوں کی یہ عظیم قربانیاں تاریخ میں بے مثال نوعیت کی ہیں۔

Marfat.com

پاکستان زندہ باد

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مسلمانانِ ہند کی مسلسل جدوجہد ثمر آور ہوئی اور وہ سلطنت خداداد وجود میں آ گئی جس کا نام پاکستان رکھا گیا اس سلطنت کے وجود میں آنے کی توقع نہ تو ہندوستان کے ہندوؤں کو تھی اور نہ برطانیہ کے فرنگیوں کو۔ لیکن خدا نے مسلم لیگ کے عزم کی پختگی کو روز افزوں استقامت دی اور اس عظیم جماعت کی شاندار اور بے مثال کوششوں سے ہزار ہا انگریز اور صدر و ہندو کو مجبور ہونا پڑا کہ ہندوستان ہی کی سرزمین میں ایک نئی اسلامی طاقت کے وجود کو تسلیم کر لیں جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کی شکل میں دنیا کے نقشے پر ابھری تھی۔

آزادی کی جدوجہد کا آغاز تو ۱۸۵۷ء سے ہو گیا تھا اور نہایت ہی آہستہ روی سے ہندو اور مسلمان یک گام ہو کر منزل کی طرف روانہ ہوئے تھے اور عرصہ دراز تک مشترکہ کوششوں میں مصروفِ کار رہے لیکن انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں مسلم اکابرینِ ہند کو پتہ چل گیا کہ ہندو منافقانہ چالوں سے مسلمانوں کو سبز باغ دکھا رہا ہے اور اس کی اصلی غرض و غایت سیاسی غلبہ حاصل کر کے ماضی کے مسلم حکومتوں کے بدلے لینا ہے۔

اس بات کو سب سے پہلے علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بھانپا اور قائداعظم محمد علی جناح کو اپنے ساتھ ملایا۔ جنہوں نے دیگر مخلص رہنماؤں کو اپنے ساتھ شامل کیا اور ایک علیحدہ مسلم مملکت کے حصول کا مطالبہ پیش کر دیا۔ لفظ "پاکستان" تو تشکیل پاکستان کے چند سال ہی قبل کی ایجاد ہے۔ اور قبل ازیں ایک علیحدہ مسلم مملکت کے حصول کا مطالبہ رہا۔

اس سیاسی جدوجہد میں جن اکابرین نے پاکستان کی حمایت میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان میں سر سید احمد خاں۔ سید امیر علی۔ محسن الملک اور وقار الملک۔ محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کے ناموں کو کسی صورت بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

سر سید احمد خاں اگرچہ ایک انگریز نواز اور خود انگریزوں کا پروردہ شخص تھا لیکن حقیقت میں اس کے یہ تمام انداز مسلمانوں کو اس سطح پر لانے کے لیے تھے جس پر ہندو کھڑا ہو کر اپنی عظمت پر اتراتا تھا۔ سید امیر علی ایک بہترین فقیہہ ہونے کے ساتھ ایک بلند

Marfat.com

درجہ کے سیاسی مفکر تھے انہیں ہندوستان میں حصولِ مملکت اسلامیہ کی تمنا تھی اور اس ضرورت سے انہوں نے مختلف مسلمان دانشوروں کو آگاہ بھی کیا۔ محسن الملک اور وقار الملک نے مسلم لیگ کی جو خدمات سر انجام دیں ان کے اس احسان کا بدلہ مسلمان قوم کبھی ادا نہیں کر سکتی۔ ان دونوں فرزندان توحید نے ہندو کے خوف و خطر کے بغیر ڈٹ کر مسلمانوں کی حمایت کی اور مسلم لیگ کی تقویت کے لیے ذاتی و سماجی سطح پر کارہائے نمایاں سر انجام دیئے۔ محمد علی جوہر کا نام تحریک آزادی کے پروانوں میں سنہری حروف سے لکھا جانے والا ہے وہ اگرچہ جسمانی طور پر مقید رہے لیکن ان کا ذہن ہر لحاظ سے آزاد رہا۔ وہ بے باک انسان فرنگی کے گھر میں جا کر اس کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کرنے سے نہ ڈرا۔ اور اس قدر پُر زور الفاظ میں گول میز کانفرنس میں پاکستان کی حمایت میں تقاریر کیں کہ ان سے خود انگریز حیران تھے ہندوؤں سے اختلاف کے موجبات اور انگریزوں سے آزادی کے حصول کے لیے جو دلائل پیش کیے ان کا رد خود انگریز کے پاس نہ تھا۔

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ تو مفکر پاکستان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں انہوں نے قائد اعظم کو جس نئی سلطنت کے قائم کرنے کا تصور پیش کیا اس کا وجود بدقسمتی سے ان کی وفات کے گیارہ سال بعد عالم دنیا میں آیا۔ تاہم انہوں نے قائد اعظم کو جو لائحہ عمل پیش کیا۔ وہ مسلم لیگ کو براہِ راست منزل تک لے گیا اور جس کوشش میں مسلم لیگ فکر اقبال کے تحت صرف پندرہ سال ہی میں کامیاب ہو گئی یعنی ڈاکٹر اقبال نے قائد اعظم کو ایسا راستہ دکھایا جو حصول منزل کے لیے بے حد آسان اور کم سفر تھا۔ اگرچہ اس راستے میں کانگرس کی طرف سے لاتعداد کانٹے بچھائے گئے جنہیں قائد اعظم نے اپنی فراست کے ساتھ صاف کیا اور اپنی قوم کو کامیاب بنانے کے لیے راہ ہموار کی۔

حصول پاکستان میں قائد اعظم کو معمار پاکستان کا نام دیا جاتا ہے اور انہیں بابائے قوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس سن رسیدہ بزرگ نے اپنی ضعیفی اور نحیفی کے باوجود آہنی عزم کا ثبوت دیا اور بے مثال دانشمندی۔ معاملہ فہمی اور سیاست دانی سے ہندو جیسے مکار اور انگریز جیسے مکارہ فریب کار کا مقابلہ آہنی حدود کے اندر رہ کر بے مثال کامیابی سے کیا اور کمال کی بات یہ ہے کہ شدید مخالفت کے باوجود اور ہندوؤں کی پست ترین اور گھٹیا حرکتوں کے باوصف کسی کو اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی جیل

Marfat.com

بھیج سکے۔

اتنی بڑی سیاسی شخصیت کی زندگی کی یہ ایک حیرت انگیز مثال ہے!

قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن مسلمانانِ ہند کی امنگوں کی تکمیل کا دن تھا اس مقصدِ پاکیزہ کے حصول کے لیے شکر ادا کرنے کا دن تھا۔ خوشی کے شادیانے بجانے کا دن تھا انگریز کے چنگل سے رہائی کا دن تھا۔ اور ہندو کی چھاتی پر سوار ہونے کا دن تھا۔ ایک آزاد مملکتِ خداداد میں آزاد سانس لینے کا دن تھا اور حقیقی طور پر پاکستان زندہ باد کہنے کا دن تھا۔

اس دن رسمی طور پر انتقال اقتدار کے بعد کراچی میں ایک مثالی جلوس نکالا گیا جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور قائداعظم نے بھی شرکت کی۔ دونوں سربراہان سلطنت ایک رسمی لینڈو میں سوار تھے اس میں چھ گھوڑے جتے ہوئے تھے سڑکوں پر لاکھوں افراد قطار در قطار کھڑے تھے۔ وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے اور مسرت بے پایاں کا اظہار کر رہے تھے۔

۱۴ اگست کو اس نوزائیدہ مملکت اسلامیہ کا ہر سرکاری اور غیر سرکاری عمارت پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا تھا اور یونین جیک کو ہمیشہ کے لیے طے کر کے رکھ دیا گیا۔ اس دن برصغیر کے نو کروڑ افراد پاکستان زندہ باد۔ پاکستان پائندہ باد کے نعروں سے ان غمزدوں کا غم بھی دور کر رہے تھے جنہوں نے اس سلسلے میں بے بہا قربانیاں دی تھیں۔

Marfat.com

تشکیلِ پاکستان کے بعد پیدا ہونے والے فوری مسائل

گذشتہ صفحات میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ انگریز نے ہندوستان چھوڑنے کا جو پروگرام بنایا تھا اس کی تاریخ جون ۱۹۴۸ء میں کسی دن کو متعین کیا جانا تھا لیکن پٹیل کے کہنے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی حکومت کو لکھ بھیجا تھا کہ وہ دو ماہ کے اندر اندر انتقالِ اقتدار کے لیے قانون کی منظوری دے کر بھیجے۔ اس کے پس منظر میں وہ سازش تھی جو ہندو نے پاکستان کی انتظامیہ کو فیل کرنے کی غرض سے کی تھی۔ ہندو کا خیال تھا کہ مسلم لیگی رہنماؤں کو ایک خاص مدت کا تصور مل گیا ہے جبکہ انہیں اقتدار منتقل ہونے کی امید ہو سکتی ہے اس کے لیے وہ کئی انتظامات کر لیں گے لیکن افراتفری کی صورت میں اگر اقتدار منتقل کیا جائے گا تو مسلمان اس کو سنبھال نہیں سکیں گے چنانچہ اس سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے فی الفور اس قانون کو منظور کرایا جس کا نام قانون آزادی ہند مجریہ ۱۹۴۷ء ہے۔

اس سے ایک علیحدہ سلطنت پاکستان وجود میں آگئی۔ لیکن اپنے ساتھ لاتعداد مسائل بھی لائی۔ خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پاکستانی عمائدین ان مشکلات پر قابو پانے کے قابل ثابت ہوئے۔ فوری طور پر جو مسائل پاکستان کے درپیش ہوئے وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ اقتصادی فرومائیگی۔
۲۔ زرعی پسماندگی۔
۳۔ کمزور انتظامی ڈھانچہ
۴۔ مہاجرین کی آمد۔
۵۔ مہاجرین کی آبادکاری۔
۶۔ کشمیر کا الحاق۔
۷۔ نہری پانی کا مسئلہ۔
۸۔ افواج کی تقسیم۔
۹۔ آئینی مسائل
۱۰۔ فسادات

اقتصادی فرومائیگی:

شروع شروع میں پاکستان اقتصادی لحاظ سے بالکل فرومایہ ملک تھا نہ اس کے پاس کوئی کارخانہ تھا۔ نہ کوئی صنعت نہ کوئی معدنیات تھی اور نہ ہی معدنی وسائل۔

Marfat.com

اس لحاظ سے پاکستان کی زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ ہر لحاظ سے اس نئی کشور حسین کو دوسرے ممالک کی امداد سے کام چلانا پڑا۔ اس نومولود مملکت کی امداد کے لیے ان دنوں امریکہ کے صدر مسٹر ٹرومین نے ذاتی دلچسپی لی اور اس ملک کے مختلف سیاسی میدانوں میں بھرپور اعانت کی۔ یہاں تک کہ یہ ملک اقتصادی لحاظ سے بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

زرعی پسماندگی:

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے لیکن ملک کے دگرگوں سیاسی حالات کی وجہ سے اس کی زرعی آمدنی میں بے حد کمی واقع ہوئی ملک میں افراتفری اور بے چینی کی بنا پر کسانوں اور مزدوروں نے خاطر خواہ کام نہ کیا۔ تاہم دوسرے ہی سال پاکستان کے زرعی حالات بہتر ہو گئے۔ گندم۔ کپاس۔ پٹ سن۔ گنا وغیرہ تو اس ملک کی سب سے کثیر پیدا ہونے والی چیزیں تھیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ نئی مملکت خداداد جلد سنبھل گئی۔

کمزور انتظامی ڈھانچہ:

تقسیم ملک کے بعد پورے پاکستان کے حصے برطانوی عہد کے صرف آٹھ انڈین سول سروس کے افسران حصے میں آئے۔ اس لیے پاکستان کو بے شمار محکموں کے خلا کو پورا کرنے کی دقتیں پیش آئیں۔ سرکاری ملازموں میں چونکہ باہمی امداد کا جذبہ کارفرما تھا اور یہاں کے لوگ نئی سلطنت کے قیام کے لیے ازحد خوش تھے اور چاہتے تھے کہ اس قدر زیادہ جدوجہد سے حاصل کیے گئے ملک کی ترقی کے اسباب مہیا کیے جائیں۔ چنانچہ سب نے مل جل کر کام کیا اور پاکستان بہت جلد اس دشواری کو بھی سر کر گیا۔

مہاجرین کی آمد:

ملک کی غلط تقسیم ریڈ کلف کی دھوکہ دہی انگریز کی مکاری اور ہندوؤں کی فریب کاری کی بنا پر لاکھوں مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ اسی طرح مغربی بنگال سے لاتعداد لوگ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ چنانچہ ان کی آمد کے بعد اُن

Marfat.com

کی خوراک رہائش اور دیگر اسباب زندگی کی فراہمی کے لیے فوری انتظامات ایک زبردست مسئلے کی صورت میں پاکستان کو پیش آئے۔ ان انتظامات میں پاکستان کے انصار لوگوں نے فراخدلی کا ثبوت دیا اور جہاں تک ممکن ہوا خوراک، رہائش اور لباس کے سلسلہ میں حکومت کی امداد کی۔ حکومت بھی اس وقت کے محدود وسائل کے اندر ان مہاجرین کی بھرپور امداد کرتی رہی۔

مہاجرین کی آبادکاری:

اس کے بعد مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ درپیش ہوا۔ حکومت نے اس سلسلے میں باقاعدہ ایک وزارت تشکیل دی جو ان اجڑے ہوئے بے گھروں کو گھر الاٹ کرنے میں مصروف ہو گئی کیونکہ یہاں سے بھی بے شمار ہندو نقل وطن کر کے ہندوستان چلے گئے تھے۔ مہاجرین کی آبادکاری کا کام اگرچہ ہنگامی نوعیت میں کیا گیا تاہم یہ مسئلہ قدرے دیر کے بعد حل ہوا۔

کشمیر کا الحاق:

کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ملانے کی سازش پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر اس وقت تیار کی تھی۔ جب ریڈ کلف بونڈری کمیشن کا چیئرمین بن کر آیا تھی اور ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ایک بھاری رشوت کے عوض سنانے آیا تھا۔ کشمیر کو جہاں ۸۰ فیصد مسلمان آبادی تھی صرف سکھ راجہ کے کہنے پر ہندوستان نے اپنے ساتھ ملحق قرار دینے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ ۸۰ فیصد کشمیریوں نے متفقہ طور پر پاکستان کے ساتھ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے ایک جنگ بھی کرنا پڑی جس کو خان لیاقت علی خاں نے خاص مصلحت کی بنا پر رکوا دیا۔ حالانکہ کشمیر آزادی محاذ کی افواج نے تیزی سے پیش قدمی جاری رکھی ہوئی تھی۔ خان لیاقت علی خاں نے پنڈت نہرو جو ہندوستان کے وزیر اعظم تھے کی اس یقین دہانی پر جنگ بند کروا دی کہ ریاست میں عنقریب استصواب رائے عامہ کروا دیا جائے گا لیکن بعد میں وہ فطرتاً اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا۔

Marfat.com

نہری پانی کا مسئلہ :۔

ہندوستان کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ پاکستان کی سرزمین پر بہنے والے دریاؤں کے دہانے بھارتی علاقوں میں رہ گئے اور کشمیر پر ہندوستانی تسلط کے نظریے کا مقصد بھی یہی تھا کہ پاکستان کو کسی نہ کسی مشکل میں مبتلا کیا جائے۔ مغربی پاکستان میں زراعت کا انحصار زیادہ تر دریائی پانی پر ہے۔ تاہم اس مشکل پر قابو پانے کے لیے پاکستان نے ہندوستان کے ساتھ بات چیت کرنے کے علاوہ خود اپنے دریاؤں کے پانی کو زیادہ سے زیادہ حد تک سرزمین پاکستان پر پھیلانے کے انتظامات کیے۔ دریائے جہلم سے ملحق دو جھیلیں بنانے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے کروڑوں روپے مختص کیے۔

افواج کی تقسیم :۔

تشکیل پاکستان کے وقت افواج کی تقسیم ایک مرحلہ وار پروگرام کے تحت ہونا تھی اور اس کے لیے طے پایا تھا کہ دونوں ملکوں کی افواج کے سربراہان اعلیٰ کے اوپر ایک انگریزی سپریم کمانڈر اس وقت تک کام کرے گا جب تک پاکستان کے حصے میں آنے والا تمام اسلحہ اور فوج اس ملک کو پہنچ نہیں جاتی۔ اس سلسلے میں برطانیہ کی طرف سے سر آکن لیک کو سپریم کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ اس کام کو کافی وقت لگے گا اس وقت تک پاکستان کو دفاعی کمزوری کا دھڑکا ضرور لگا رہے گا۔ سر آکن لیک نے فوجوں کی تقسیم کا کام نہایت تیزی سے مکمل کر دیا۔ لیکن اسلحہ کی ترسیل کا کام ابھی تھا کہ ہندو مہاشوں کے کہنے پر اس عہدے کو یکسر ختم کر دیا گیا۔ اور پاکستان کے حصے میں آنے والا بہت سا اسلحہ ہندوستان ہی نے غصب کر لیا۔ تاہم دفاعی معاملات میں امریکہ نے پاکستان کی طرف ایک اور امدادی قدم بڑھایا جس سے اس کے دفاع کو کسی حد تک تقویت مل گئی۔

آئینی مسائل :۔

پاکستان چونکہ مجوزہ تاریخ سے دس ماہ پیشتر ہی وجود میں آگیا تھا اس لیے اس کے

Marfat.com

اکابرین کو آئین کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے لیے وقت کم ملا۔ تاہم وجود میں آتے ہی پاکستان کو آئین سازی کے لیے مختلف خیالات کے ارکان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا پڑا۔ اس لیے قدرے محنت کرنا پڑی۔ بدقسمتی سے یہ ایسا مسئلہ بن گیا کہ عرصہ دراز تک حل نہ ہو سکا۔

فسادات :-

اگرچہ پاکستان وجود میں آ ہی گیا تھا۔ لیکن مختلف مقامات پر آتش زنی اور خنجر زنی کے واقعات رونما ہوتے ہی رہتے تھے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ فسادات کی وہ بھیانک شکل تھی جو مہاجرین کو دیکھ کر نظر آتی تھی۔ ہندوستان کے غنڈوں نے اب یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یہاں سے کوئی مسلمان سلامت واپس نہ جائے اور اگر جائے تو زخمی و برباد حالت میں جائے۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے اشتعال میں آ کر یہاں کے مسلمان نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن انتقامی جذبہ اس قدر زیادہ بھیانک نہ تھا جتنا کہ مشرقی پنجاب سے آنے والے مہاجرین میں دکھائی دیتا تھا۔

یہ تھے وہ مسائل جن سے پاکستان کو فوری طور پر دوچار ہونا پڑا۔ لیکن خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کی عطا کردہ اس سلطنت کو ہندو کی سازشی سرشت نہ مٹا سکی تشکیل پاکستان ایک ایسا حرف ہے جو سنگِ جہاں پر نہ مٹنے کے لیے کندہ ہوا ہے۔

Marfat.com

تشکیلِ پاکستان میں مختلف مسلمان سیاسی مفکرین کا حصّہ

۱۔ سرسیّد احمد خاں

۲۔ سیّد امیر علی

۳۔ محسن الملک

۴۔ وقار الملک

۵۔ شبلی نعمانی

۶۔ محمد علی جوہر

۷۔ ڈاکٹر محمد اقبال

۸۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح

۹۔ اے۔ کے فضل حق

۱۰۔ آغا خان

Marfat.com

Marfat.com

سر سیّد احمد خاں ۱۸۱۷ء ۱۸۹۸ء

سر سید احمد خاں کا شمار ان چند گنے چنے سیاسی مسلم مفکرین اور مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے جنہوں نے تشکیل پاکستان کے لیے نہ صرف ایک خاص جادہ عمل معین کیا، بلکہ خود ابتدائی طور پر مسلم مجاہدین کے ساتھ مل کر منزل کی نشاندہی کی اپنے مخصوص انداز میں انہوں نے انگریزوں کی تہذیب کا مطالعہ کیا اور اس کی کمزوریوں سے واقف ہو کر ہر لمحہ مسلمانوں کو ان سے آگاہ رہنے کی تلقین میں کوشاں رہے۔

سر سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد سید محمد متقی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے وہ ذی علم۔ درویش مزاج۔ اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے جہاں تک طریقت کا تعلق ہے ان کے والد حضرت غلام علی صاحب نقشبندی مجددی کے خاص مریدوں میں سے تھے ان کے نانا دبیر الملک خواجہ فرید اپنے دور کے جید علماء میں شمار ہوتے تھے سر سید خاں نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی تاہم ان کے والد نے اپنے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اچھے اچھے اساتذہ کا انتخاب کیا۔ عربی اور فارسی کی درسی کتب کی تدریس کے بعد انہیں علم ریاضی کی طرف زیادہ راغب کیا۔

کچھ دنوں طب کی تعلیم بھی حاصل کی اور پھر مرزا غالب آزردہ اور صہبائی جیسے باکمال ادبا کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ ۱۸۳۸ء میں جبکہ سر سید کی عمر ۲۱ سال تھی۔ ان کے والد انتقال کر گئے۔ چنانچہ والد کی وفات کے دوسرے ہی سال انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کی۔ تین سال کی سروس کے بعد انہوں نے سب جج ہونے کا امتحان پاس کی۔ چنانچہ انہیں مین پوری میں بطور منصف سب جج مقرر کر دیا گیا۔

۱۸۴۲ء میں وہ مین پوری سے تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آگئے جہاں وہ چار سال تک مقیم رہے۔ ۱۸۴۶ء میں ان کا تبادلہ دہلی میں ہوگیا اور یہاں وہ ۱۸۵۵ء تک رہے۔ ان دنوں ان کی طبیعت تحقیق کی طرف مائل ہوئی۔

چنانچہ اس تحقیق پر مبنی انہوں نے ایک مستند کتاب مرتب کی جس کا نام "آثار الصنادید" رکھا گیا یہ کتاب مؤرخین اور ماہرین آثار قدیمہ کے لیے ایک بہترین رہنما کی حیثیت رکھتی ہے

Marfat.com

۱۸۵۵ء میں ان کا تبادلہ بجنور ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ بجنور ہی میں مقیم تھے ہنگاموں کے دوران سرسید احمد خاں نے لاتعداد انگریز مردوں اور عورتوں کو پناہ دے دے کر ان کی جانیں بچائیں۔ بجنور کے ہندوؤں کی درخواست پر ہنگامے کے وقت انگریزوں نے انہیں ضلع کا حاکم مقرر کر دیا۔

غدر کی آگ کے شعلے جب ان کے دامنِ عافیت کو چھونے لگے تو ان کی جان کو خطرلاحق ہو گیا اور وہ بصد مشکل جان بچا کر میرٹھ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ان کے باقی خاندان والے سب دہلی میں تھے۔ بدقسمتی سے غدر کی آگ سب سے زیادہ دہلی کے در و دیوار کو جلا رہی تھی اسی آگ میں سرسید کے پیشتر اہل خاندان جل گئے کچھ اعزا دہلی سے نکل گئے ان کی والدہ اور اور خالہ نے ایک پرانے ملازم کے گھر میں پناہ حاصل کی۔ تاہم سرسید اپنی والدہ کو دہلی سے میرٹھ لے آئے لیکن بدقسمتی سے کچھ ہی روز بعد ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

والدہ کی اس خستہ حالی کی موت۔ اہل خانوادہ کے حشر۔ دہلی کی بربادی اور مسلمانوں کی بے سروسامانی نیز قتل و غارت سے سرسید اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ ان کی زندگی کے رجحانات یکسر بدل گئے۔ اس غضب ناک جنگ سے جو عوام اور فرنگی حکمرانوں کے درمیان ہوئی سرسید کے دل میں نئے نئے جذبات پیدا ہوئے۔ پہلے تو انہوں نے ملک کو خیرباد کہنے کی سوچی لیکن بعد میں کہا کہ ملک میں رہ کر عوام کو ایک تحریک کے ذریعے مستحکم و مضبوط کیا جائے۔

ملک کی خستہ حالی اور معاشی پسماندگی کو سرسید نے نہایت غور سے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ فرنگی کے خلاف نفرت جب عملی طور پر سامنے آئی تو سرسید نے ان کا بغایت و انہماک جائزہ لیا اور ایک کتاب "اسباب بغاوت ہند" تحریر کی۔ اس میں ان تمام کا ذکر کیا گیا ہے جو اس جنگ آزادی کے وقوع پذیر ہونے کا موجب بنے۔

سرسید نے نہایت بے باکی سے انگریز حاکموں کی غلط پالیسیوں کا تجزیہ پیش کیا اور انگریزوں کی اپنی رعایا کے ساتھ بے راہ روی کا تفصیلی جائزہ لیا اور نہایت مدلل انداز میں صاف صاف بتا دیا کہ یہ غدر محکوموں کی بغاوت نہیں تھی بلکہ انگریزوں کی طرف سے کی جانے والی ناانصافیوں اور غلط فیصلوں کا ردعمل تھا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ہندوستان بھر میں سرسید کی حمایت میں ایک لہر دوڑ گئی لیکن اس کے برعکس انگریز اپنی کوتاہیوں کے متعلق پڑھ کر بہت تلملائے۔ یہ کتاب جب برطانیہ گئی تو وہاں سرسید

Marfat.com

کے خلاف ایک طوفان امڈ آیا اور برطانوی پارلیمنٹ میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ سرسید کو باغی قرار دے کر سزائے موت دی جائے لیکن حق شناس انگریزوں نے اپنی کرتوتوں پر شرمندگی کا اظہار کیا۔

جنگ آزادی کے ناکام ہو جانے کے بعد سرسید کو پتہ چل گیا کہ ہمارے عوام کھلی بغاوت میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ فرنگیوں کی معاشی، اقتصادی اور ذہنی کمزوریوں سے واقف نہ ہو جائیں چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید نے مفاہمت کی کوششوں کا آغاز کیا۔ انگریزی کی مذہبی کتاب بائیبل کا ترجمہ اور تفسیر کرنے کا اعلان کیا اور اس ترجمہ و تفسیر کو قرآن کے ترجمے اور تفسیر کے ساتھ مشابہ کرنے کی کوشش کی۔

۱۸۶۲ء میں وہ مراد آباد سے غازی پور پہنچے تو ایک سائنٹیفک سوسائٹی کی اساس رکھی اور یہاں سے انگریزی اردو اخبار جاری کیے۔ جن میں سیاست۔ علوم جدیدہ۔ معاشرت اور اقتصادیات پر مضامین پیش کیے جاتے۔ مراد آباد میں دو سال ٹھہرنے کے بعد ۱۸۶۴ء میں وہ علی گڑھ تبدیل ہو گئے۔ معاشی ہم آہنگی کی رونق کو دوبالا کرتے کے لیے یہاں پر بھی انہوں نے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جس کا نام "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" رکھا۔ اس ایسوسی ایشن کی تشکیل کا اصل مقصد یہ تھا کہ عوام کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر ضروری سفارشات مرتب کی جائیں جن کو حکومت کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اس ایسوسی ایشن نے سب سے پہلے سفارش جو حکومت کو پیش کی۔ وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔

اس تجویز کو کچھ عرصے کے بعد ایک سکول کی تشکیل کی صورت میں عملی جامہ پہنایا گیا جو کچھ عرصہ کے بعد سرسید کی ذاتی کوششوں سے ایک عظیم یونیورسٹی کی شکل میں اجاگر ہوئی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ سرسید انگریزی تہذیب و تمدن کا بچشم خود جائزہ لینے کے حق میں تھے چنانچہ اس غرض کے لیے وہ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے۔ جہاں انہوں نے ڈیڑھ سال قیام کیا۔ یہاں رہ کر انہوں نے ایک انگریز ولیم میوزک کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "ایسیز آن دی لائف آف محمدؐ" تحریر کر کے شائع کر دی۔ اول الذکر کتاب میں اس انگریز ملحد نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا اور جا بجا اعتراضات کیے تھے ان اعتراضات کا مدلل جواب سرسید

Marfat.com

نے اپنی مذکورہ کتاب میں دیا۔

سرسید نے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے جس تگ و دو سے کام کیا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ، اپنی ذاتی سعی دوستوں کی اعانت اور حکومت کی معاونت سے آخر کار ایک یونیورسٹی قائم کر ہی لی اس یونیورسٹی کے قیام سے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے لیے نہ صرف جدید علوم کے حصول کے لیے ایک مخزن وجود میں آگیا بلکہ ہندوؤں کے سینے پر خنجر پیوست ہو گیا۔ معاشی اور جدید علمی زندگی میں مسلمانوں کا ہندوؤں کے مقابلہ میں یہ پہلا مثبت قدم تھا۔

سرسید احمد خان کی اس بیش بہا کامیابی کے بعد حاسدوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سرسید وطن کا دشمن ہے، انگریزوں کا جاسوس ہے مسلمانوں کا خود ہی نشانہ بنائے جا رہا ہے کافر ہو گیا ہے لیکن جسے خدا عزت دے اسے کون پریشان کر سکتا ہے۔

سرسید پہلے رہنما ہیں جنہوں نے اعلان کیا کہ سرزمین ہندوستان میں دو جداگانہ قومیں آباد ہیں۔ جن کے رسم و رواج۔ دین و مذہب اور تہذیب و معاشرت میں اختلاف کے باعث ان دونوں قوموں کے لیے ملک میں علیحدہ قانونی مراعات کا ہونا لازم ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی منفرد حیثیت کو تسلیم کروانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے پہلی مرتبہ حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ اہل ہند کو حکومت برطانیہ کے تمام اعلیٰ اداروں کے شعبوں میں شمولیت کا حق ملنا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں سرسید نے پہلی دفعہ دو قومی نظریہ پیش کیا۔

اس طرح سرسید ہی نظریۂ پاکستان کے اولین موجد اور سرگرم حامی تھے انگریزوں اور ہندوؤں میں رہ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ یہ قومیں آپس میں مل کر کسی صورت میں نہیں رہ سکتیں چونکہ یہ نظریہ ہندوؤں کے لیے بالخصوص اور انگریزوں کے لیے بالعموم تکلیف دہ تھا اس لیے ان کی زندگی میں ہی ان کی مخالفت بھی شروع ہو گئی تھی، لیکن مخالفین اپنی آگ میں جل بھن کر رہ گئے اور سرسید منزل کو پا گئے۔ ان کی زندگی میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوئی ایک عظیم ترین کارنامہ تھا۔ اس یونیورسٹی میں سرسید نے مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں سے روشناس کرایا۔

Marfat.com

یہ چیز ہندوؤں کی بالادستی ختم کرنے کے سلسلے میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوئی
دسمبر ۱۸۸۶ء میں سرسید احمد خاں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی - اس کانفرنس کا مقصد درس علی گڑھ تحریک (جس کا ذکر ابتدائی صفحات میں تفصیل سے آچکا ہے) کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنایا تھا۔ اس کانفرنس کے مقاصد میں جو اہم باتیں قابلِ ذکر ہیں ان میں ایک مسلم پلیٹ فارم بنایا جس پر مسلمان رہنما آکر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات سے دوسرے مسلمانوں کو آگاہ کر سکیں اور وقت کی ضروریات کے پیش نظر اپنے مطالبات پیش کر سکیں۔ اگر ذرا عمیق نگاہ سے دیکھا جائے تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دراصل مسلم لیگ ہی کی ابتدائی شکل تھی۔ اگرچہ سرسید خود کانگرس سے وابستہ رہے لیکن اس وابستگی کا مقصد اس جماعت کے ساتھ ہم آہنگی نہیں تھا بلکہ دشمنوں کو قریب تر ہو کر محتسبانہ انداز میں دیکھنا تھا۔

سرسید احمد خان ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء میں تقریباً اکیاسی سال کی عمر میں علی گڑھ میں فوت ہو گئے اور انہیں وہیں دفن کیا گیا۔ ان کی زندگی کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل نکات مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

۱۔ سماجی خدمات
۲۔ مذہبی کارنامے
۳۔ تعلیمی خدمات
۴۔ سیاسی خدمات
5۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت
۶۔ انڈین نیشنل کانگرس سے وابستگی
۷۔ تحریک علی گڑھ
۸۔ ہندو سیاست پر تنقید
۹۔ اردو کی ہندی پر برتری کا اظہار
۱۰۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

Marfat.com

سیّد امیر علی

۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۸ء

سید امیر علی ۶/ اپریل ۱۸۴۹ء میں چن سرا (بنگال) جو دریائے ہگلی کے کنارے پر واقع ہے متولد ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام سید جعفر علی خان تھا۔ جو ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے اور "کٹک" میں مامور تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی والدین سے حاصل کی۔ بعد ازاں ہگلی کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں پر ان کو دو ممتاز شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور ان دونوں شخصیتوں سے انہوں نے وافر فیض حاصل کیا ان میں ایک عالم دین سید کرامت علی تھے اور دوسرے معروف عالم پروفیسر عبید اللہ عبیدی تھے۔ اپنے اول الذکر استاد کی تعلیمات سے اس قدر متاثر تھے کہ ابتدائی زندگی ہی میں ان کی مشہور کتاب "مرکز علوم" کو انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ یہی کتاب ان کی اولین ادبی کوشش تھی۔

سید امیر علی ہندوستان بھر کے سب سے پہلے ایسے گریجوایٹ تھے، جنہوں نے انگریز کے قائم کیے کسی کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۸۶۸ء میں انہوں نے ایم اے ہسٹری کا امتحان پاس کیا اور پھر اگلے سال قانون کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ان کی غیر معمولی قابلیت کے پیش نظر حکومت نے انہیں سرکاری خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ ۱۸۷۳ء میں انگلستان سے بار ایٹ لاء کر کے واپس بنگال آئے اور کلکتہ میں قانون کی پریکٹس شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ کی شہرت کا چرچا عام ہوا۔ اور اس شہرت کی بنا پر انہیں کلکتہ یونیورسٹی کا فیلو مقرر کیا گیا پریزیڈنسی کالج کلکتہ میں ایک خاص عرصہ تک محمڈن لاء کے پروفیسر بھی رہے۔ قانون میں انہیں غیر معمولی دسترس حاصل ہو گئی تھی اور اس غیر معمولی قابلیت کا اعتراف انگریز حکومت نے اس انداز سے کیا کہ ۱۸۹۰ء میں انہیں کلکتہ ہائیکورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ اس عہدے پر فائز ہونے والا یہ دوسرا مسلمان شخص تھا۔ قبل ازیں سر سید احمد خان کے بیٹے سید محمود ہائیکورٹ کے جج بنائے گئے تھے۔

سید امیر علی چودہ سال تک ہائیکورٹ کے جج رہے۔ اس دوران میں انہوں نے بعض تاریخی نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ کیا۔ انگریزی قوانین کی تحصیل و تدریس کے

Marfat.com

دوران سید امیر علی اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ انگریزی معاشرے۔ تہذیب و تمدن تاریخ اور اطوار کا مقابلہ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن تاریخ اور اطوار سے کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی ہندو تہذیب و تمدن اور مسلم تہذیب و تمدن کا فرق محسوس کر سکیں۔ برطانوی اسلامی اور ہندوستانی قوانین پر عبور حاصل ہونے کی بنا پر وہ ان سب کے محاسن و مصائب کا تقابل نہایت آسانی سے کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس بنا پر انہیں یقین ہو گیا کہ انگریز محض ایک حکمران بن کر ہندوستان میں آیا ہے اور اس کو ہندوستان کے عوام کی آزادی اور خوشحالی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ مسلمان حالات کے چکر میں آکر اس قدر گرد زدہ ہو گیا ہے کہ اس کو ہندو ہمیشہ پریشان کیے رکھتا ہے اور مسلمان اپنی بہت سی کمزوریوں کی بنا پر ہندو اور انگریز کا براہِ راست مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہے انہیں اس حقیقت کا پتہ چل گیا تھا کہ جب تک مسلمان سیاسی میدان میں ایک علیحدہ اور منفرد پلیٹ فارم تعمیر نہ کریں گے۔ اس وقت تک وہ آزادی کی نعمت سے مالا مال نہیں ہو سکتے۔

سید امیر علی ۱۹۰۰ء تک ہائیکورٹ کے جج رہے۔ اسی سال ریٹائر ہونے کے بعد عازم انگلستان ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں انہیں برطانوی حکومت نے انڈین پریوی کونسل کا رکن منتخب کر لیا۔ یہ اعزاز کسی ہندوستانی کے لئے اولین تھا۔ کیونکہ قبل ازیں اس کونسل میں کوئی رکن ہندوستان کا باشندہ نہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد چوبیس سال زندہ رہے اور یہ عرصہ انہوں نے انگلستان ہی میں گذارا۔ آپ کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ انگلستان میں قیام کے دوران سید امیر علی نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں مسلم لیگ کی انگلستان برانچ کی تشکیل اور اس کے ذریعے مسلم مقاصد کی تقویت کے سلسلے میں انہوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمان ابھی اتنے مضبوط نہ تھے کہ وہ غلامی کی سلاسل کو توڑ سکیں اور بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء کے غدر نے انگریز کو اپنے پاؤں زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو اور زیادہ منظم ہونے کی تلقین کی اور اس بات کا احساس دلایا کہ منظم ہونے کے لیے باقاعدہ ایک تنظیم کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں قیام کے دوران اس احساس کے تحت انہوں نے ۱۸۷۷ء میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی لیکن اس کے مقابلے میں سرسید مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تشکیل کر چکے تھے اور وہ اس سلسلے میں خود شہر بہ شہر جا کر کوشاں رہے تھے۔ اس لیے اس کانفرنس کے مقابلے میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن چنداں کامیاب نہ ہو سکی۔ تاہم ۱۸۸۲ء میں اس ایسوسی ایشن نے ہندوستا

Marfat.com

کے مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کرنے کے لیے وائسرائے لارڈ رپن کو ایک یادداشت پیش کی جس سے انگریزوں میں مسلمانوں کی طرف التفات کرنے کے لیے تحرک پیدا ہوا سید امیر علی کی طرف سے اس ایسوسی ایشن کے قیام کا مقصد سرسید احمد کی تحریک کو ناکام کرنا نہیں تھا بلکہ انہوں نے سیاسی و سماجی سطح پر سرسید احمد خان سے پورا پورا تعاون کیا۔ چنانچہ اپنی ایسوسی ایشن ہونے کے باوجود سرسید کی بنائی ہوئی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی۔

سیّد امیر علی اور مسلم لیگ

انڈین نیشنل کانگرس کے مقابلہ میں ہندوستان میں ایک نئی سیاسی جماعت مسلم لیگ کا قیام دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوا جس کی قرارداد ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں پاس کی گئی تھی اور یہ اجلاس بھی دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کے مقام پر زیر صدارت وقار الملک انعقاد پذیر ہوا تھا۔ سید امیر علی نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں اس نئی جماعت کا معرض وجود میں آنا نہایت خوش آئند اقدام ہے لیکن اس کی کارکردگی کا دائرہ عمل وسیع ترین ہونا چاہیئے چنانچہ ۱۹۰۸ء میں سید امیر علی کی زیر صدارت لندن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخ کھول دی گئی اس نئی جماعت کو لندن میں فعال بنانے میں سید امیر علی کا بہت زیادہ عمل و دخل رہا اور انہوں نے اپنی کارکردگی سے ثابت کر دیا کہ ہندوستان کی یہ سیاسی جماعت ایک دن منزل مراد کو ضرور پالے گی۔

۲۷ جنوری ۱۹۰۹ء کو مسلم لیگ لندن برانچ کی طرف سے سیکرٹری آف سٹیٹ برائے امور ہند لارڈ مورلے کے پاس ایک وفد کو لے کر گئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے بالخصوص وزیر موصوف کی توجہ لوکل باڈیز اور ریجسلیٹو اسمبلیوں میں علیحدہ نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔

انہیں نہ صرف مسلمانان ہند سے ہمدردی تھی بلکہ ان کو مسلمانان عالم سے پورا پورا خلوص تھا چنانچہ بلقان کی جنگوں اور ترکی اور اٹلی کی جنگوں کے دوران انہوں نے لندن سے برٹش ریڈ کولینٹ سوسائٹی قائم کر کے ان لوگوں کی خاطر خواہ امداد کی۔ انہوں نے لندن میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جس کے لیے انہوں نے لندن میں مختلف مسلم مخیر حضرات

Marfat.com

سے چندے جمع کیے اس سلسلے میں لے کر سر آغا خان نے ان کی بہت مدد کی۔

جس طرح پہلے ذکر کیا جا چکا ہے سید امیر علی کو اسلامی قوانین پر پوری پوری مہارت حاصل تھی اور اس دعویٰ کی دلیل میں ہم ان کی وہ کتب پیش کر سکتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں اور ان کے مقابلے میں شاید ہی کوئی قانون دان ویسی کتاب لکھ سکا ہو۔ وہ کتب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ دی سپرٹ آف اسلام　　۲۔ اسلام
۳۔ ویمن ان اسلام　　۴۔ دی پرسنل لاء آف محمڈنز
۵۔ دی لیگل پوزیشن آف ویمن ان اسلام
۶۔ محمڈن لاء　　۷۔ دی رائٹس آف پرشیا
۸۔ اے کمنٹری آن دی بنگال ایکٹ۔

ان کتب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سید امیر علی کے دل میں مسلمانوں کے بارے میں کس قدر نیک جذبات پائے جاتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ہندو کے مقابلے میں اس برصغیر میں مسلمان بھی ہر لحاظ سے خود کفیل ہو جائے ان کتب کی بنا پر انہوں نے مسلمانوں کو ایک خاص مرکز کی طرف آنے کی ترغیب دی اور مسلمانانِ ہند کو احساس دلایا کہ ان کے حقوق اور ان کے فرائض کیا ہیں۔

اسلام کا یہ مجاہد اور آزادی کا یہ پروانہ ۳ راگست ۱۹۲۸ کو انگلستان میں بمقام سسیکس ابدی نیند سو گیا۔

Marfat.com

محسن الملک

۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

نواب سید مہدی علی خان محسن الملک ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء میں بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے ابتدائی قدیم اسلامی طرز فکر پر ہوئی۔ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ تاہم ایک سچے مسلمان اور مبلغ اسلام ہونے کے لیے انہوں نے علمی سرمایہ کافی جمع کر لیا تھا۔ ملازمت کی ابتداء ایک کلرک کی حیثیت سے کی اور اپنی گوناگوں صفات اور قابلیت کی بنا پر جلد ترقی کر گئے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ تحصیلدار کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ اسی سال انہوں نے ڈپٹی کلکٹر کا امتحان اول پوزیشن حاصل کر کے پاس کر لیا۔ ۱۸۷۱ء میں وہ انسپکٹر جنرل آف ریونیو بن کر حیدر آباد چلے گئے جہاں انہیں منیر نواز جنگ محسن الدولہ الملک کا خطاب ملا۔

اپنی ملازمت کے دوران انہیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اور اپنی تعیناتی کے دوران وہ مسلمانوں کی حالتِ زار کا ہی مطالعہ کرتے رہے جہاں کہیں گئے انہوں نے مسلمانوں کو ہندو کے زیر اثر پایا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں پر اس وقت دو قومیں اس طرح مسلط ہیں کہ انہوں نے اس عظیم قوم کی سوچ کی پرواز کو دبائے رکھا ہوا ہے۔ اس لیے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی عظیم شخصیت کی پہچانیں اور میدان عمل میں آ کر ہندو اور فرنگی کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کس قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہے تاکہ خود کو بھی ویسے ہی ہتھیاروں سے مسلح کر کے اس کا مقابلہ کیا جائے یہی چیز انہیں سرسید کے قریب تر لانے کا باعث بنی۔

۱۸۹۳ء میں جب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے فی الفور علی گڑھ کا رُخ کیا اور پورے جوش و خروش کے ساتھ سرسید احمد خان کے ساتھ ہو گئے چنانچہ تحریک علی گڑھ میں انہوں نے نمایاں کام انجام دیئے۔ سرسید احمد خان خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ محسن الملک کی آمد سے مسلمانوں کو جس جذبے میں تقویت ملی ہے وہ انہی کی برکت سے ہے۔ اکیلا میں اس قدر وسیع انداز میں عوام کی

Marfat.com

رائے کو ہموار نہ کر سکتا تھا۔

چنانچہ سرسید کی وفات کے بعد تحریک علی گڑھ سے پیدا ہونے والے مثبت نتائج کو اجاگر کرنے والے محسن الملک ہی تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دو اہم کام کیے۔

۱۔ اردو ہندی تقاضے میں اردو کے حق مدافعت۔

۲۔ شملہ وفد کا اہتمام۔

ان دونوں باتوں کی تفصیل ابتدائی صفحات میں آچکی ہے نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے جائنٹ سیکرٹری تو سرسید کی زندگی ہی میں بن گئے تھے۔ لیکن بعد میں پورے سیکرٹری کے عہدے کی ذمہ داری بھی اٹھالی۔ اس طرح سرسید کی وفات کے بعد انہیں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سیکرٹری بھی منتخب کر لیا گیا۔ اس کانفرنس کو کامیاب تر بنانے کے لیے انہوں نے محسوس کیا کہ ملک کے مسلمان عوام سے ذاتی رابطے قائم کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے بذات خود ملک بھر کے طوفانی دورے پر نکلے ۱۸۹۹ء میں کلکتہ میں ایک اجلاس طلب کیا اور اس میں فیصلہ کیا گیا کہ ملک بھر کے بڑے بڑے شہروں میں اسلامیہ مدارس کھولے جائیں گے۔ اردو ہندی جھگڑے کے سلسلے میں ایک ایسوسی ایشن قائم کی گئی۔ جس کا نام اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ ۱۸ر اگست ۱۹۰۰ء میں اس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام محسن الملک کی زیر صدارت ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں محسن الملک نے واضح الفاظ میں کہا کہ اگر کسی نے ہمارے لیے لسانی مشکلات پیدا کرنے کوشش کی تو ہم اس کا جواب قلم سے نہیں بلکہ تلوار سے دیں گے۔ اگرچہ ہمارے دل میں ملکۂ معظمہ کے لیے پورا پورا خلوص اور پوری پوری محبت موجود ہے۔ اور ہم وطن کے بھی زبردست خواہاں ہیں۔ لیکن ہم اپنی زبان کو کبھی نہیں مرنے دیں گے ہم نے اردو کو زندہ رکھنے کا عہد کیا ہے۔ اور جب تک ہم زندہ ہیں یہ زبان زندہ رہے گی اگر خدانخواستہ ہمیں اپنے عزائم کی تکمیل میں ناکامی ہوئی تو ہم اردو کا جنازہ خاموشی کے ساتھ اٹھا کر نہیں جائیں گے۔ ہم اس کی موت سے پیدا ہونے والے اشتعال کی صورت میں جو اقدام اٹھائیں گے ان کی تمام تر ذمہ داری حکومت اور ہندی نوازوں پر ہوگی۔

علی گڑھ کالج کو چار چاند لگانے والوں میں محسن الملک کا نام سرفہرست آتا ہے انہوں نے اس کالج کی علمی استعداد کو بڑھانے کیلیے دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں کو علی گڑھ مدعو کیا جو ان سے

Marfat.com

بے حد متاثر ہوئیں ان میں پرنس آف ویلز (بعد میں جارج پنجم ہے) امیر حبیب اللہ خان شاہ افغانستان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ شاہ افغانستان نے فرمایا کہ علی گڑھ کے متعلق میں نے بہت کچھ سنا ہوا تھا لیکن اب جو کچھ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں مجھے تعجب ہو رہا ہے۔ واقعی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا وہ ارشاد درست ہے کہ جھوٹ اور سچ میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کان اور آنکھ کے درمیان۔ چنانچہ آج میں نے حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

صوبجات متحدہ کا گورنر سر انستونی میکڈانل پوری طرح متعصبانہ انداز میں ہندی نواز تھا اور اردو کا بدترین مخالف تھا۔ اردو کو نیچا دکھانے کے لیے اس نے بہت سے سرکاری احکام بھی جاری کیے اور سرکاری سطح پر رسوخ استعمال کرتے ہوئے اردو کے حامیوں کو ناجائز تنگ کرنے کی مہم چلادی اگرچہ بہت سے مسلمان گورنر ان کمینے ہتھیاروں سے بچنے کے لیے تحریک تحفظ اردو سے کچھ الگ ہو گئے لیکن محسن الملک کے جذبہ مدافعت میں اور جوش پیدا ہو گیا۔ انہوں نے جابجا احتجاجی جلسوں کا انتظام کیا اور اعلان کیا کہ حکومت کی طرف سے دیئے جانے والی ان دھمکیوں سے جن میں ہمیں سنگین نتائج بھگتنے کے لیے کہا گیا ہے کبھی مرعوب نہیں ہوں گے تاہم بعد میں ان کے ساتھیوں نے انہیں مشورہ دیا کہ گورنر اب اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا ہے اس لیے اس وقت تک خاموشی اختیار کر لینا ہی مناسب ہے۔ جب تک یہ یہاں سے تبدیل نہیں ہو جاتا۔

محسن الملک ایک اعلیٰ درجے کے سیاست دان کا دماغ رکھتے تھے انہیں معلوم تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان ایک منفرد قوم کی حیثیت سے کاروبارِ حکومت میں حصہ لیں چنانچہ جداگانہ انتخابات کرانے کی مہم پر زور دیا۔ شملہ وفد کے شرکاء سے اپیلیں کیں کہ وہ وقت کی اس اہم ضرورت کو وائسرائے پر واضح کریں چنانچہ سر آغا خان کی قیادت میں ۳۶ مسلمانوں کا ایک وفد تیار کیا جو شملہ میں وائسرائے سے ملاقاتی ہوا اس وفد کی کاروائی کا ذکر ابتدائی صفحات میں آچکا ہے) اور نمایاں کامیابی کے ساتھ واپس آیا۔ اسی وفد کے وائسرائے سے ملاقات کی برکت سے منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ جن میں جداگانہ انتخابات کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا۔

اب وقت آگیا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ سیاسی جماعت بنائیں چنانچہ دسمبر ۱۹۰۶ء کو مسلم عمائدین نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ایک نئی سیاسی جماعت "مسلم لیگ" کی تشکیل کا اعلان کیا محسن الملک اس جماعت کی تشکیل میں پیش پیش رہے۔ بدقسمتی سے زندگی نے زیادہ دیر تک وفا نہ کی اور اگلے ہی سال یعنی ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو انتقال فرما گئے اور علی گڑھ میں مدفون ہوئے۔

Marfat.com

وقار الملک

۱۸۴۱ء تا ۱۹۱۷ء

نواب مشتاق حسین وقار الملک ۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو یو پی کے ایک مشہور شہر امروہہ میں پیدا ہوئے ابھی چھ ماہ کے تھے کہ شفقت پدری کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ اپنی والدہ ماجدہ کے ہی زیر نگرانی ایک مقامی مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی بعد ازاں امروہہ ہی میں کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ سکول مراد آباد میں بطور استاد ملازمت اختیار کی۔ آپ کا رابطہ سر سید احمد خان سے زندگی کے ابتدائی دور ہی میں قائم ہو گیا۔ جب سر سید احمد خان علی گڑھ میں سب جج تھے تو نواب مشتاق حسین ان کے ریڈر تھے اسی مقام سے دوستی کا آغاز ہوا اور یہ دوستی تا دم آخر قائم رہی۔ ترقی کرتے ہوئے وہ ۱۸۷۲ء میں تحصیلدار مقرر ہو گئے ۱۸۷۵ء میں وہ جوڈیشنل ڈیپارٹمنٹ میں سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ اس منصب پر فائز رہنے کے بعد انہوں نے حیدر آباد جانا پسند کیا جہاں انہیں جوڈیشنل منسٹر کے سیکرٹری ہونے کا عہدہ مل گیا۔ آپ کی ذہانت محنت خلوص اور قابلیت کے اعتراف میں ریاست حیدر آباد کی طرف سے "وقار الملک" کا خطاب ملا۔ اس ملازمت سے وہ ۱۸۹۲ء میں ریٹائرڈ ہوئے اگرچہ وہ حیدر آباد میں تھے لیکن سر سید احمد خان سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھا۔ اسی طرح سر سید کے رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع کرنے کے لیے مضامین ارسال کرتے۔ سر سید کی تحریک کو پورے حیدر آباد میں پھیلا دیا۔

انہوں نے اپنی زندگی مسلم قوم اور وطن کے لیے وقف کر دی وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ انہیں تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کیا جائے اور ان حقوق کے حصول کے لیے ایک سیاسی پلیٹ فارم بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسلم لیگ کے قیام کے لیے تگ و دو کی دسمبر ۱۹۰۶ء میں اس سیاسی جماعت کی تشکیل کو خوش آئند اقدام قرار دیا اور گیارہ سال تک مسلسل اس کی خدمت کرنے میں مصروف رہے۔

نواب محسن الملک کے بعد علی گڑھ مسلم کالج کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ مسلمانوں سے اتنی محبت تھی کہ وہ ہر صورت میں ان کی مدد کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے اور غیروں بالخصوص

Marfat.com

انگریزوں سے اس قدر نفرت تھی کہ انہیں اپنے قریب دیکھنا پسند نہ کرتے تھے اسی نفرت کی بنا پر انہوں نے نہایت جرأت مندی سے اپنے کالج میں سے تمام یورپین عملے کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ایک مسلم درس گاہ کو انگریزی پلیدگی سے پاک کر دیا۔ اگرچہ وقار الملک کا یہ اقدام اس وقت کے تقاضوں کے منافی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس اقدام سے مسلمانوں پر یہ امر واضح ہو گیا کہ ان کے رہنماؤں میں اب اتنی جرأت موجود ہے کہ وہ جابر حاکم کے سامنے حق کی آواز بلند کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ شائد وہ یورپین سٹاف کو نہ نکالتے لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ طلباء کو کسی خاص نصاب کے تحت تعلیم نہیں دے رہے اور اپنی مرضی کے مطابق مضامین کی تدریس کر رہے ہیں۔ انہیں اس بات میں بے قاعدگی کی جھلک نظر آئی۔ اس بے قاعدگی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اس سٹاف سے ایک مخصوص نصاب کے مطابق تعلیم دینے کا مطالبہ کیا لیکن اس سٹاف نے اپنی حکومت کے نشے میں ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بہ حیثیت سیکرٹری انہوں نے ان سے کہہ دیا کہ وہ استعفیٰ دیدیں ایک اور جرأت مندی کا کام وقار الملک نے یہ کیا کہ پرنسپل کے اختیارات میں کمی کر دی جس کی بنا پر کالج میں آمریت کے عنصر کو شروع سے ہی دبا دیا گیا۔

وقار الملک کا زیادہ تر وقت وسطی ہند اور جنوبی ہند میں گزرا تھا لیکن ان کی توجہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں پر لگی رہتی تھی۔ چنانچہ تقسیم بنگال کی تنسیخ پر انہوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے شمارہ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۱ء میں مسلمانوں کے مستقبل کی سیاسی پالیسی کے خدوخال وضع کیے۔ اس صورتحال کے پیش نظر انہوں نے کسی خوف و خطر کے بغیر اعلان کیا کہ اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ وہ حکومت پر کسی قسم کا بھروسہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ حکومت کیسی ہوئی جو ایک وقت میں کچھ فیصلہ کرے اور دوسرے وقت میں اسی فیصلے کو الٹ کر دے۔ اس لیے مسلمانانِ ہند کو آزادی کے حصول کے لیے اپنی راہیں خود متعین کرنا پڑیں گی۔

اسی طرح ۱۹۱۳ء میں ایک مسجد کی تعمیر کرنے والے مسلمانوں پر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹیلر نے پولیس کی وساطت سے گولی چلوا دی جس سے پورے علاقے میں زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ اس واقعہ پر وقار الملک نے نہ صرف اس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹائلر سے احتجاج کیا بلکہ اس کو لکھ بھیجا۔

Marfat.com

"اگر تم غرور و تکبر میں آج مسلمانوں پر گولی چلوا سکتے ہو تو کل پولیس کا ایک معمولی تھانیدار بھی ٹائلر بن کر ایسے مکروہ اقدام کر سکتا ہے۔"

وقار الملک سر سید احمد خاں کی طرح گرم مزاج اور کھرے آدمی تھے اور انہوں نے راست گوئی میں حائل ہونے والی ہر دیوار کو منہدم کر دیا۔ اور انگریزوں کو اس مقام کی اطلاع دی جو مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لیے تھا۔

وہ سر سید اور محسن الملک کے ذاتی دوست ہونے کی وجہ سے ایک ایسے ماحول کے روشن چراغ تھے جس میں ہر وقت نور ہی نور برستا تھا۔ وہ اس محفل کے رکن تھے جہاں ہر وقت ذکر آزادی ہوتا تھا وہ ایسے ملک کے باشندے تھے جہاں کے مسلمانوں کو ان کی ماہیت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ ایسی سیاسی جماعت کے رکن تھے جو ان کی وفات کے تیس سال بعد ہی ایک عظیم مملکت تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئی اور اس مملکت کا نام پاکستان رکھا گیا۔

تحریک آزادی کا یہ مجاہد اور شمع آزادی کا یہ پروانہ بالآخر ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء کو راہی ملک عدم ہو گیا۔ نواب وقار الملک کو ان کے آبائی شہر "امروہہ" ہی میں دفن کیا گیا۔

Marfat.com

شبلی نعمانی

۱۸۵۷ تا ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا وہ ایک متمول زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے وکیل بھی تھے جس کی وجہ سے ان کا گھر علم و دولت کا خزانہ تھا دولت کی فراوانی کی بنا پر شبلی نعمانی کو بھی علم حاصل کرنے کے بہت اچھے مواقع ملے۔ ابتدائی و بالا تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ انیس سال کی عمر میں پہلا حج کیا ۱۸۷۳ء میں ایک مدرسے میں مدرس اعلیٰ بن گئے۔ اس دوران انہوں نے بہت سے مستند علماء سے کسبِ فیض کیا۔ ۱۸۸۱ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی۔ شبلی نعمانی طبعاً ایک مدرس محقق اور مورخ تھے۔ وکالت ان کے بس کی بات نہ تھی۔ امتحان پاس کرنے کے باوجود انہیں اس پیشہ سے نفرت ہو گئی۔ چنانچہ ملازمت کی ٹھانی پہلے دس روپے ماہوار نقل نویس کی حیثیت سے کام کیا پھر ان کے والد نے اپنے کارخانے میں کام پر لگانے کی کوشش کی لیکن یہاں بھی وہ بالکل ہی فٹ ثابت نہ ہوئے۔ بالآخر ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں حصول ملازمت کے سلسلے میں بہت سرگرداں و پریشان رہے آخر کار ۱۸۸۳ء کے آخر میں علی گڑھ کالج میں عربی کے ایک معاون استاد کی آسامی مل گئی۔ یہاں سے انیس سے چالیس روپے ماہوار تک ملتے تھے ان کا انتخاب مولوی سمیع اللہ خان نے کیا اور ان کے ساتھ ان کا تعارف سر سید احمد خان سے کرا دیا۔ یہ جگہ مولانا شبلی کے لیے سب سے زیادہ قابل قدر اور پسندیدہ تھی انہیں یہاں کے چالیس روپوں سے اس قدر دلچسپی نہ تھی جس قدر انہیں یہاں کی لائبریری اور تحقیقی مرکز سے تھی یہی ان کا فطری ذوق تھا جو انہیں بہت سی محنت کے بعد حاصل ہو گیا علی گڑھ کالج سے وہ اٹھارہ سال تک وابستہ رہے یہ ایک مدت دراز ہے ان کی زندگی کا بہترین حصہ اسی وابستگی سے گذرا۔

مولانا شبلی کو جہاں علم و ادب کا ایک درخشندہ ستارہ قرار دیا جاتا ہے وہاں ہم اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ تحریک آزادی میں بھی اپنی مثال آپ تھے وہ ایک مسلمان مفکر تھے ادب تنقید کی خصوصیات گھٹی میں بھری پڑی تھیں اور ان کی وساطت

Marfat.com

ہیں معاملہ فہمی بلا کی حاصل تھی وہ واقعات کی تفصیل سن کر معاملہ کی تہہ کو فوراً پہنچ جاتے تھے یہی صفت انہیں سیاسی میدان میں جلا بخشتی رہی ان کے سینے میں ایک سچے مسلمان کا دل دھڑکتا تھا اگرچہ ان کے آباؤ اجداد ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے ۱۸۷۷ء میں ترکی اور روس کے درمیان جو جنگ ہوئی اس کی وجہ سے ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا۔ جوش وخروش میں تلاطم برپا ہوا۔ شبلی نعمانی نے اس مقصد کے لیے گھر گھر جا کر چندہ جمع کیا اور اس مقصد کے لیے انجمن تشکیل دی چنانچہ ۴ ہزار روپے جمع کر کے ترکی روانہ کیے اسی طرح ترکی اور یونان کے درمیان جو چپقلش ہوئی اس سے انہیں سخت صدمہ ہوا۔ انگریز اپنے قدیم بغض کے تحت یونان کی مدد کو نکل آیا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ ہندوستان میں اس کا راج ہے اس لیے یہاں کے لوگ اس کے خلاف کوئی بات کہنے کی جرأت نہ کر سکیں گے لیکن آفرین ہے ان بے باک نوجوانوں پر جنہوں نے انگریز کی مخالفت کے باوجود ترکی کی اعانت کا اعلان کیا اور ان میں مولانا شبلی پیش پیش ہوئے۔

۱۹۰۸ء میں دارالعلوم ندوہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اس دارالعلوم کے قیام کا اصل مقصد مسلمانوں کو دینی تعلیم دینا تھا اس ادارے کو حکومت کچھ مالی گرانٹ بھی دیتی تھی۔ اس گرانٹ کے عوض دارالعلوم ندوہ میں غیر مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں انگریز کی مداخلت براہِ راست مداخلت تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی ادارہ مالی امداد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ چنانچہ انگریز کی مداخلت کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ انگریز اپنی گرانٹ کی آڑ میں غیر مذہبی تعلیم کے دائرے کو وسیع تر کرتا جا رہا تھا شبلی نعمانی نے جب یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے کچھ ایسے متمول افراد کی طرف رُخ کیا جو اس ادارے کو مالی امداد آسانی سے دے سکتے تھے۔ انگریزی مداخلت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے مولانا محمد امین زبیری جو بیگم بھوپال کے ادبی سیکرٹری تھے کو لکھا کہ انہیں فوری طور پر مالی امداد کی ضرورت ہے تاکہ انگریز کی دخل اندازی کو محدود رکھا جائے اسی طرح ریاست رام پور کے نواب صاحب تک رسائی حاصل کی جنہوں نے پانچ پانچ سو روپیہ سالانہ امداد کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۱۰ء میں سر آغا خاں نے اپنے طور پر پانچ سو روپیہ سالانہ امداد کا اعلان کیا۔

شبلی طبعاً سیاست سے الگ رہ کر مسلمانوں کو میدان عمل میں لانا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ سیاست کے مفکرین اور ہوتے ہیں اور سیاست میں عمل کرنے والے افراد اور

Marfat.com

ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے منصوبہ بندی کے ارکان ایک جگہ بیٹھے ہوتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے منصوبوں پر عمل کرنے والے افراد کوئی دوسرے ہی ہوتے ہیں لیکن شبلی نعمانی کو بالآخر خود بھی میدان سیاست میں نکلنا ہی پڑا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کے اعتماد کو انگریز کی وہ ضرب تھی جو اس نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کے احکام جاری کر دیئے تھے۔ کیونکہ بنگال کو تقسیم کیا جانا مسلمانوں کا مطالبہ تھا اور تنسیخ تقسیم بنگال ہندوؤں کا پُر زور مطالبہ تھا۔ مسلمانوں کو بعد میں پتہ چل گیا کہ ہندو ان کی خوشحالی اور آزادی کو قطعی طور پر پسند نہیں کرتا بلکہ ان دونوں چیزوں کو وہ مسلمانوں کے حق میں برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ شبلی اس واقعے سے شدید دل برداشتہ ہوئے۔ چنانچہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کا مصمم ارادہ کیا اگرچہ وہ ابتدائی طور پر سرسید احمد خاں کی تقلید میں کانگرس میں شامل ہو گئے تھے لیکن بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو کر مسلمانوں کے لیے عظیم کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ مولانا شبلی ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو فوت ہوئے۔

مولانا محمد علی جوہر

۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۱ء

مولانا محمد علی جوہر ۱۸۷۸ء میں اس دنیا میں رونق افروز ہوئے۔ بچپن ہی میں والد محترم کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ آپ کی والدہ محترمہ جو ایک پُر عزم اور مجسمہ عفت و ہمت خاتون تھیں اور جن کے دل میں قومی مسائل اس طرح جاگزیں تھے جس طرح ان کے اپنے ہی بیٹوں اور بیٹیوں کے مسائل تھے اپنے بچوں کی پرورش میں تندہی سے مصروف ہوئیں۔ وہ ایک جواں ہمت اور پُر وقار خاتون تھیں انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش حب الوطنی کے جذبے کے تحت اس انداز سے کی کہ ان میں آزادی کشور اور استقلال مسلمانان عالم کے لیے جانفشانی سے کام لینا سکھایا۔ یہ محض ان کی والدہ کی برکت تھی کہ وہ اس قابل ہوئے کہ سیاست و سماج کی بلند و بالا سٹیج پر آ کر ایک مثالی کردار ادا کر گئے۔

علی گڑھ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد محمد علی جوہر عازم برطانیہ ہوئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے آنرز کر کے ۱۹۰۲ء میں واپس وطن لوٹے۔ شروع شروع میں بعض نوابین کے ہاں ملازمت کرتے رہے لیکن ان کی مزاج میں نوکری سے زیادہ ملک و ملت کی

Marfat.com

خدمت مقدم تھی اگرچہ ملازمت کے دوران انہیں بہت اچھے عہدے مل گئے لیکن ان عہدوں اور دنیاوی وقار نے ان کے دل کو چنداں اطمینان نہ بخشا۔ ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی بھی اسی ماں کی زیر تربیت پلے تھے جس نے انہیں پالا تھا اس لیے ان کے خیالات و کردار میں بالکل بھائی کی سی ہم آہنگی تھی۔ ان کی والدہ صرف قول کی قائل نہ تھیں بلکہ وہ عمل پر زیادہ یقین رکھتی تھیں۔ دنیا کے کسی حصے میں مسلم قوم کے کسی فرد کو کوئی گزند پہنچتی تو اس کی تڑپ ان تین افراد کے دلوں میں سب سے پہلے پیدا ہوئی اور یہ کنبہ اس تکلیف کو رفع کرنے کے لیے عملی طور پر میدان میں نکل آتا۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی بس اب کیا تھا انہیں باقاعدہ ایک سیاسی پلیٹ فارم مل گیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں وہ مسلمان ہند کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ۱۹۱۰ء میں ملازمت کو خیر باد کہا اور کلکتہ سے ایک اخبار کامریڈ کے نام سے نکالا جس کی ادارت و اشاعت بالالتزام خود کرتے یہ اخبار تین سال تک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کلکتہ سے شائع ہوتا رہا۔ کلکتہ میں رہ کر انہیں محسوس ہو گیا کہ یہاں کے لوگ اب جاگ اٹھے ہیں اس لیے انہی نئے جاگنے والوں میں ایسے افراد مل جائیں گے جو ملک و قوم کو تقویت دینے کے لیے اعمالِ حسنہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔

چنانچہ ۱۹۱۳ء میں وہ کلکتہ سے دہلی تشریف لائے اور وہاں سے ایک اردو اخبار "ہمدرد" کے عنوان سے شائع کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کی سیاست زبردست سرگرم تھی۔ کانگرس اپنے پورے زوروں پر تھی مسلم لیگ کو وجود میں آئے ہوئے سات آٹھ سال گزر چکے تھے۔ عوام الناس کی رائے بدل رہی تھی مسلمانوں کو اپنی انفرادیت کا احساس ہوا جا رہا تھا۔ کانگرس کے زور میں کمی واقعی ہوئی جا رہی تھی۔ انگریز اور ہندو کی ملی بھگت اپنے شباب کو پہنچ رہی تھی اور مسلم کش سازش کئی پردوں میں عمل پیرا تھی۔ ان تمام حالات کو مولانا محمد علی خوب جانتے اور سمجھتے تھے انہیں انگریز کی ملی بھگت کا ثبوت اس وقت سے مل چکا تھا جب ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کے حکم کو انگریز نے خود ہی منسوخ کر دیا حالانکہ یہ حکم پانچ سال قبل مسلمانوں کے پُرزور مطالبے کو تسلیم کرنے کے بعد صادر کیا گیا تھا انگریز نے ہندو کو خوش کرنے کے لیے ایک عظیم اور ضروری فیصلے سے بڑی ڈھٹائی سے منہ پھیر لیا محمد علی جوہر جان گئے کہ انگریز سے مسلمانوں کو فیض ہونا مشکل سی بات ہے۔

Marfat.com

جنگ عظیم اوّل شروع ہوئی تو ترکی نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا اعلان کر دیا اس سے انگریز کے دل میں نہ صرف ترکوں کے لیے جوابی کاروائی کا جذبہ پیدا ہوا بلکہ اس نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کر لیا اور یہاں تک کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس صورت حال سے ہندو نے فائدہ اٹھایا اور انگریز کو ان کے خلاف کیا اور جھوٹا پروپیگنڈا کرنے میں پنہاں و عیاں انداز میں مصروف ہوئے ادھر ہندوستان کے مسلمانوں نے جب انگریز کی طرف سے ترکی حکومت میں خلافت کے خلاف جارحانہ عزائم کو دیکھا تو فطری طور پر غم و غصہ کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی چنانچہ یہاں پر خود محمد علی جوہر نے اس سلسلے میں اپنے اخبارات میں انگریز کی کاروائی کی مذمت کی اور انگریز کو احساس دلایا کہ ترکی میں خلافت کے تحفظ کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو علیحدہ نہ تصور کیا جائے چنانچہ ان کا اخبار کامریڈ انگریز پالیسیوں پر زبردست تنقید کرتا جا رہا تھا۔ اس لیے انگریز کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی۔ چنانچہ کامریڈ کی طباعت و اشاعت ممنوع قرار دے دی گئی پریس ضبط کر لیا گیا اور ۱۹۱۵ء میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت دونوں بھائیوں یعنی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو گرفتار کر لیا اور چار سال تک جیل میں رکھا۔ اس دوران تحریک خلافت پوری طرح منظم ہو چکی تھی۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب انہیں جیل سے رہا کیا گیا تو ان میں آتش جذبات شدید نوعیت اختیار کر چکی تھی وہ انگریز کو اس نفرت سے عملی طور پر آگاہ کر دینا چاہتے تھے جو ان کے دلوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ تحریک خلافت کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں تھامی اور ملک کے گوشے گوشے میں انگریز کے مکروہ عزائم سے عوام کو آگاہ کیا اس تحریک میں انہیں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ضعیف العمری کے عالم میں بھی ان کی والدہ نے جا بجا خلافت کے حق میں مظاہروں میں شرکت کی اور مسلمان خواتین ہند کو اس ضرورت سے مطلع کیا جو مسلمانوں کی آزادی اور خلافت ترکیہ کے تحفظ کے لیے اہمیت کلی رکھتی تھی ان تین پرعزم رہنماؤں نے ملک میں اسلام دوستی اور فرنگی دشمنی کی لہر دوڑا دی۔

خلافت کی تحریک میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں سر انجام دیئے ان کا ذکر اس کتاب کے ابتدائی حصے میں تفصیل سے آچکا ہے۔ تاہم اتنی بات ضرور قابل ذکر ہے کہ

Marfat.com

انگریز کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص نے مسلمانانِ ہند کے ایسے جذبات جگا دیئے ہیں جو انقلاب عظیم پر منتج ہوں گے۔ ۱۹۲۱ء میں انہیں ایک بار پھر قید کر لیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد رہا کر دیا گیا۔

جب پہلی گول میز کانفرنس ہوئی تو انہوں نے اس وفد میں ایک فعال رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔ ہندوستان سے روانہ ہونے سے قبل اعلان کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمانانِ ہند کو غلامی کے چنگل سے آزاد کر دیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے نہایت پُروقار انداز میں مدلل تقاریر کیں اور فرمایا کہ اس مرتبہ میں کھلے الفاظ میں انگریز سے آزادیٔ ہندوستان کا مطالبہ کر دوں گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس وقت تک واپس لوٹ کر نہیں آؤں گا جب تک آزادی کا ثمرہ مل نہیں جاتا۔

چنانچہ گول میز کانفرنس میں انہوں نے نہایت بے باکی سے آزادیٔ ہندوستان کا مطالبہ پیش کر ہی دیا۔ خدا نے ان کے قول کی لاج رکھی اور انہیں خالی ہاتھ واپس وطن لوٹنے کی شرمندگی سے محفوظ رکھا۔ بدقسمتی سے جنوری ۱۹۳۱ء میں جبکہ وہ لندن ہی میں تھے کہ راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور ان کی وصیت کے مطابق انہیں بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔

Marfat.com

ڈاکٹر محمد اقبال

۱۸۷۳ تا ۱۹۳۸ء

ڈاکٹر محمد اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک معروف کشمیری برہمن خاندان سے تھا جو تین سو سال قبل اسلام قبول کر چکا تھا۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی اور تعلیم بالا کے لیے لاہور تشریف لے آئے یہاں گورنمنٹ کالج سے ایم۔ اے فلسفہ کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کیے اس کے فوراً بعد وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں لیکچرار کے عہدے پر فائز ہو گئے بعد ازاں انگلستان روانہ ہو گئے جہاں سے بیرسٹرایٹ لا بن کر واپس وطن آئے۔

جرمنی میں فلسفے کے مضمون میں ڈاکٹریٹ کیا اپنے استاد سر تھامس آرنلڈ کے کہنے پر انہوں نے یورپ کا دورہ کیا۔ یورپ کے دورہ کے بعد جب لاہور آئے تو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے مامور ہوئے۔

علامہ اقبال طبعاً آزاد تھے اور غلامی کی زنجیروں کی جھنکار سے بہت بیزار تھے۔ انہوں نے قوم کو مردہ نہیں بلکہ خفتہ پایا۔ ان کے دل میں اس سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی تمنا پیدا ہوئی۔ خود نوکری کو خیر باد کہا اور وکالت شروع کر دی۔ وکالت کے دوران انہوں نے محسوس کیا کہ انگریز کا قانون ایک موم کی ناک کی طرح ہے۔ کیونکہ اس میں نہ تو انصاف کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی صداقت کو معلوم کرنے کے لیے ذرائع و وسائل۔ لہٰذا وکالت ان کے ضمیر کے ساتھ مطابقت نہ کر سکی۔ چنانچہ انہوں نے اس پیشے کو بھی خیر باد کہا اور ترک کر دیا۔

قدرت نے شاعری ان کی سرشت میں داخل کی تھی اور وہ اس خداداد ملکہ کے تحت قوم کی آواز کو ملک بھر میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں پھیلانے لگے اور اس میں گوناگوں کامیابیاں حاصل کیں یہ درست ہے کہ انہوں نے پڑھا تو فلسفہ تھا اور عملی زندگی کی ابتدا ایک استاد کی حیثیت سے کی تھی اور قانون کی موشگافیوں سے بھی باخبر ہوئے تھے لیکن ان کی طبیعت پر جو سب سے زیادہ حاوی بات تھی وہ مسلمانوں کی حالتِ زار اور ان کی سیاسی پسماندگی تھی وہ فرنگی کی تعلیم۔ تہذیب اور تمدن سے زبردست نالاں تھے۔ جرمنی کے دورے

Marfat.com

کے بعد انہیں اپنی زندگی کے لیے نیا لائحہ عمل ملا تھا۔

انہوں نے گوئٹے کے خیالات کو پڑھنے کے بعد محسوس کیا کہ ایک قومی شاعر اپنی قوم کو اس قدر بلند و بالا مقام سے آگاہ کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستان سے کوئی دانشور ان احساسات کو دوسرے افراد تک نہ پہنچائے اور ان کی ضروریات و احتیاجات سے حاکمت وقت کو مطلع نہ کرے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی ملک و ملت کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

شروع شروع میں وہ کانگرس کے ساتھ ان کے ہم نوا رہے لیکن جب انہوں نے اس تعصب خانہ میں خود جا کر حمام کے ان ننگوں کو دیکھا تو اس سے متنفر ہو گئے۔ ان کی نظرِ بصیرت افروز نے پہچان لیا کہ ہندو کبھی مسلمان کے ساتھ نہیں چل سکتے اور نہ ہی مشترکہ مفادات کی خاطر کوئی قربانی دے سکتے ہیں اگر یہ کوئی کام مسلمان کی خاطر کرے گا بھی تو اس کے مفادات زود یا بدیر ہندو قومیت ہی کو حاصل ہوں گے انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ کسی پر تنقید کرتے وقت اگر اس کے محاسن ہی کو مدنظر رکھا جائے تو محض خوشامد بن کر رہ جاتی ہے لیکن صحت مند تنقید کا مقصد گو یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے محاسن و معائب کا یکساں طور پر مطالعہ کیا جائے اور اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا جائے۔ فیصلہ دیتے وقت ہر ناقد کو اختیار رہے کہ وہ اعتدال سے کام لے یا جس چیز کو وہ غالب دیکھے اس کی تفصیل بیان کر دے۔

علامہ نے انگریز کو اسی نکتہ نظر سے دیکھا انہوں نے صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ یورپ اور انگلستان میں جا کر دیکھا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ فرنگی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو اپنا رنگ دینا چاہتا ہے تاکہ آئندہ نسلوں کی قوت فکری کے رجحانات صرف اطراف پر کارفرما ہوں جو انگریزی تمدن اور مزاج کے عین مطابق ہو۔ چنانچہ اس میٹھی اور خوش نما زہر کی تاثیر سے لوگوں کو آگاہ کرنا اپنا فرض اولین تصور کیا اور قوم کو جگانے کے لیے سرگرم ہو گئے۔

انگریز علامہ کی مصروفیات پر کڑی نظر رکھ رہے تھے۔ چونکہ اقبال براہ راست معاندانہ رویہ اختیار کرنے کے مخالف تھے اور آئینی صورت کو زیادہ مستحسن قرار دیتے تھے اس لیے انگریز کو ان پر براہ راست کوئی غلط ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ تاہم

Marfat.com

علامہ اقبال اپنے اشعار میں۔ اپنے افکار میں اور اپنی تقاریر میں مسلمانوں کے سامنے وہ حقائق پیش کرنے میں مصروف ہو گئے جو تہذیب اسلامیہ کے لیے زبردست مضر ثابت ہو سکتی تھی۔

علامہ نے قوم کو پہلے یہ احساس دلایا کہ اس کی پسماندگی کا اصل سبب ان کی اپنی بے حسی اور فرومائیگی ہے جو ان کی کسالت کی وجہ سے انہیں درپیش ہے انہیں اس امر کی خوشی تھی کہ ان سے پہلے کچھ حضرات قوم کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے آ چکے تھے لیکن صرف جگا دینا کافی نہیں نیند سے اٹھ کر کچھ ایسے وقت کی ضرورت ہوتی ہے جس میں انسان اپنے آپ سنبھالتا ہے اور پھر خود کو کوئی کام کرنے کے لیے فعال بناتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ اکبر الہ آبادی جیسے شعراء پہلے ہی قوم کو جھنجوڑنے میں مصروف رہ چکے تھے اور سر سید احمد خاں۔ سید امیر علی۔ محسن الملک اور وقار الملک اور محمد علی جوہر جیسے عظیم المرتبت شخصیات ملک و ملت میں سیاسی بیداری کے لیے کوشاں رہے تھے لیکن ان کے انداز فکر میں وہ جرأت اور حصول نتیجہ کے لیے وہ عجلت نہیں تھی جو قدرت نے علامہ اقبال میں ڈالی تھی۔ علامہ نے انگریز کے خلاف ان باتوں کو واضح اور آشکارا بیان کرنے میں ذرہ بھر عار محسوس نہ کی جو محض فرنگی مفاد کی خاطر ہندوستانی تہذیب میں رواج پا رہی تھیں اس طرح انہوں نے انگریز کے خلاف ایک تحریک کا آغاز کیا۔ انگریز نے انہیں خاموش کرنے کے لیے سر کا خطاب دے دیا۔ لیکن علامہ کے سر میں تو قوم کی آزادی کا خیال بسا ہوا تھا اس لیے اس "سر" کے آ جانے کی وجہ سے انہوں نے اپنا سر نہ بدلا اور اپنے ذہن میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دی۔

۱۹۲۷ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ یہاں اسمبلی میں بھی انہوں نے قومی مسائل کو ناقدانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ یہاں پر صائب رائے کی کوئی قدر نہیں یہاں پر تو بندے گنے جاتے ہیں اور تولے نہیں جاتے۔ تاہم جن مسائل پر انہوں نے اپنی سوچ کا اظہار کیا ان میں عورتوں کو زیادہ سے زیادہ طبی امداد بہم پہنچانے کے لیے محکمہ صحت کی طرف سے زیادہ رقم کی تخصیص اور سرکاری ملازمتوں میں ملازمتوں میں مسلمانوں کو متناسب نمائندگی کے اصول کو اپنایا جاتا تھا ملک کی نازک صورت حال اور حکومت کی طرف سے مایوس کن کارروائیوں پر انہوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی لیکن انہوں نے جان لیا کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لیے حکومت تک آواز پہنچانے کے لیے سب سے اعلیٰ ذریعہ جمہور رہے اور

Marfat.com

جمہوریت ہی کے ذریعے حکومت کی در و دیوار کو ہلایا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں انہوں نے الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے عام اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے جو صدارتی تقریر کی تاریخ آزادی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے یہ تقریر خطبہ الہ آباد کے نام سے یاد کی جاتی ہے اس خطبے میں انہوں نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ اسلامی مملکت کی تشکیل کی ضرورت ہے جس کی جغرافیائی حدود کم از کم صوبہ پنجاب۔ صوبہ سندھ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کی موجودہ سرحد ہو اسی طرح تشکیل پاکستان کا تصور انہوں نے واضح طور پر بیان کر دیا۔ اس عظیم الشان جلسہ میں اس خطبے نے ایک ہیجان اور تلاطم برپا کر دیا اور مسلمانوں کو ایک نئی ریاست کے وجود میں آنے کی اشد ضرورت واقعتاً محسوس ہو گئی۔ اس کا اثر یہ نکلا کہ کانگریس کے عمائدین اور بالخصوص پنڈت نہرو بہت تلملائے اور انہوں نے اس کی زبردست مخالفت شروع کر دی وہ تو متحدہ ہندوستان کی آزادی کے حق میں تھے۔

علامہ اقبال ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے انگلستان تشریف لے گئے۔ علامہ کی شخصیت کے پیشِ نظر لندن میں پہلے ہی سے ایک انجمن قائم تھی جس کا نام اقبال ایسوسی ایشن تھا۔ چنانچہ علامہ کے لندن پہنچنے پر اس ایسوسی ایشن کے ارکان نے علامہ کا ایسے استقبال کیا جیسے مرید مرشد کا کرتے ہیں۔ گول میز کانفرنس میں علامہ نے جس انداز سے مسلم لیگ کا نکتہ نظر پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ درست ہے کہ محمد علی جوہر جیسے زبردست مقرر نے نہایت جامعیت سے اپنے دلائل دیئے لیکن علامہ نے فلسفیانہ انداز میں مسلمانوں کی آزادی کی تحریک کو روشن کیا اور انگریز کو بتا دیا کہ اب ہندوستان میں یہ دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔

علامہ ایک مفکر تھے۔ بعض اوقات مفکر کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی منزل تک خود بھی پہنچ جانے کی سکت رکھتا ہو اور قوم کو ساتھ لے جانے کی ہمت رکھتا ہو۔ اس کے لیے علامہ کی نظرِ انتخاب نے قائداعظم محمد علی جناح کو چنا اور ان سے براہِ راست رابطہ قائم کیا۔ قائداعظم بھی ان کی شخصیت سے والہانہ انداز میں متاثر تھے۔ انہیں علامہ کے افکارِ سیاسی سے کلی طور پر اتفاق تھا اور وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ جو علامہ کے ذہن میں جاگزیں ہوا تھا

Marfat.com

ان دونوں عظیم شخصیتوں کی مسلسل جدوجہد نے انہیں بالآخر منزلِ مقصود تک پہنچا ہی دیا۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ مصورِ پاکستان علامہ اقبال کو اپنے تصور کو مادی صورت میں دیکھنے کی مہلت نہ ملی۔ تاہم قائداعظم نے پاکستان کی عظیم ریاست کے وجود کو بدست خود مزین کیا۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں علامہ اقبال نے نہ صرف قائداعظم سے بہت سی خط و کتابت ہی کی بلکہ خود بھی متعدد بار ان سے ملاقاتی ہوئے۔

۸ رمئی ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال کو پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کا صدر چن لیا۔ ۲۱ مئی ۱۹۳۶ء کو قائداعظم نے سری نگر میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کے ارکان کے ناموں کا اعلان کیا تو پنجاب کی طرف سے علامہ اقبال کو سرفہرست رکھا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال نے صحت کی خرابی کی بنا پر مسلم لیگ میں ایک فعال رکن ہونے کی حیثیت سے کام کرنے سے معذرت چاہی۔ کیونکہ ان کی نظر کسی حد تک جواب دے چکی تھی البتہ انہوں نے ساتھ ہی یقین دہانی کرائی کہ مسلم لیگ کی افادیت تقویت اور عظمت کے لیے میری خدمات مشوروں کی صورت میں تادم آخر حاضر ہیں اور میں ایسی خدمت کرتا رہوں گا۔

علامہ اقبال نے ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ اور لاہور ہی میں شاہی مسجد کے زیر سایہ دفن کر دیا گیا۔ اب ان کا مزار مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔

Marfat.com

باب

قائداعظم بطورِ قانون ساز سیاستدان اور عوامی راہنما

محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے ان کے والد جناح پونجا چمڑے کی تجارت کرتے تھے چھ سال کی عمر تک گھر میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو برس کی عمر میں سندھ مدرسہ ہائی سکول کراچی میں داخل ہوئے اس زمانے کے رواج کے مطابق پندرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ایمی بائی سے ہوگئی ۱۸۹۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن تشریف لے گئے ان کی عدم موجودگی میں ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا لندن میں قائد نے لنکن ان میں داخلہ لیا اس درسگاہ میں داخل ہونے کی خاص وجہ انہوں نے کافی مدت بعد ۱۹۴۷ء میں بار ایسوسی ایشن کراچی سے خطاب کرتے ہوئے بتائی۔

"میں نے لنکن ان میں اس لیے داخلہ لیا کہ اس کے صدر دروازے پر دنیا کے عظیم قانون سازوں کی فہرست میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی شامل تھا۔"

لیکن ان سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۸۹۶ء میں واپس ہندوستان آئے ۱۸۹۷ء میں بمبئی میں پریکٹس شروع کردی لیکن تین سال تک انہیں سخت مشکلات اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ بیسویں صدی کا آغاز ان کے لیے خوشی کی نوید لایا بمبئی کے قائم مقام ایڈووکیٹ جنرل جان میلز ورتھ میک فرسن نے ان کی قابلیت اور دیانت سے متاثر ہوکر اپنے دفتر میں کام کرنے کی پیشکش کی اسی زمانے میں بمبئی میں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی آسامی عارضی طور پر خالی ہوگئی اور قائم مقام ایڈووکیٹ جنرل نے قائداعظم کی سفارش کی اگرچہ وہ صرف چند ماہ تک اس منصب پر فائز رہے لیکن اس سے قانون دانوں کے حلقہ میں ان کی ساکھ میں بڑا اضافہ ہوگیا اور ان کی پریکٹس بھی خوب چل نکلی اور وہ پچھلے چار سال سے جس شدید مالی بحران سے دوچار تھے اس سے انہیں نجات مل گئی۔

Marfat.com

تین سال بعد جناح کو ایک ہزار روپے ماہوار پر بمبئی کارپوریشن میں کام کرنے کی پیش کش کی گئی یہ عہدہ بڑے عجیب حالات میں جناح کو ملا ایک مرتبہ کسی مقدمے کی کے دوران بڑا رش تھا چنانچہ کمرہ عدالت کے دروازے بند کرنا پڑے اسی اثناء میں جناح آئے انہوں نے دیکھا کہ کوئی نشست خالی نہیں البتہ وکلاء کے لیے مخصوص نشستوں میں سے ایک پر بمبئی کارپوریشن کا مالک میکڈانلڈ بیٹھا تھا۔ جناح نے اسے اٹھنے کا کہا اس نے انکار کر دیا۔ جناح نے عدالت کے متعلقہ اہلکار سے کہا جس نے تذبذب سے کام لیا تو جناح نے اسے انتباہ کیا کہ وہ جج کے علم میں یہ معاملہ لائیں گے اس پر اہلکار کو مجبوراً میکڈانلڈ سے کرسی خالی کرنے کے لیے کہنا پڑا میکڈانلڈ نے غصے ہونے کی بجائے انہیں کارپوریشن میں چھ ہزار روپے کی ملازمت کی پیش کش کی۔

اس واقعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جناح شروع سے ہی آئینی و قانونی ذرائع اختیار کرنے والے تھے جب وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے تھے تو پھر عام دوسرے حالات اور تقاضوں سے بے نیاز ہو کر اپنے موقف کو درست ثابت کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے یکسوئی اور تندہی سے سرگرم عمل ہو جاتے تھے سچی اور صحیح بات کے لیے ثابت قدمی عمر بھر ان کا شعار رہا۔

امپریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت:- ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات اس لحاظ سے مسلمانوں کے لیے مفید تھیں کہ ان میں نہ صرف مسلمانوں کے لیے جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کیا گیا تھا بلکہ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو اکثریتی صوبوں میں آبادی کے تناسب سے قدرے زیادہ نمائندگی بھی دی گئی تھی گو اس کے بدلے مسلمانوں کو اکثریتی صوبوں میں آبادی کے تناسب سے کچھ کم نمائندگی ملی اس کے ساتھ وائسرائے نے نامزد کرنا تھا اور باقی ۲۵ کا انتخاب ہونا تھا۔

اس کے ساتھ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو امپریل لیجسلیٹو کونسل بنا دیا گیا جس میں ارکان کی تعداد چھ سے بڑھا کر سات کر دی ان میں ۳۵ کو وائسرائے نے نامزد کرنا تھا اور باقی ۶۵ کا انتخاب ہونا تھا۔

Marfat.com

اس طرح اس کونسل کے انتخاب کیلیے بمبئی کے مسلمانوں نے محمد علی جناح کو اپنا نمائندہ منتخب کیا اس وقت ان کی عمر ۳۳ برس کی تھی کونسل میں زیر بحث آنے والے مسائل کے بارے میں جناح منطقی اور معقول موقف اختیار کرتے تھے جو بات ان کے نزدیک عوام کے مفاد اور انصاف کے منافی ہوتی وہ اس پر شدید نقطۂ چینی کرتے تھے، اور ہر اچھے اقدام کی تعریف کرتے تھے کونسل میں زیر غور ایک مسودۂ قانون پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"میں حکومت پر آزادانہ اور صاف اور برملا نکتہ چینی کا قائل ہوں لیکن اس کے ساتھ میں اس بات کو ہر تعلیمیافتہ آدمی کا فرض سمجھتا ہوں کہ جب حکومت کوئی درست قدم اٹھائے تو اس کی حمایت اور امداد بھی کرنی چاہیئے جو لوگ اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور جو لوگ اوہام کا شکار ہیں انہیں اچھی طرح محسوس کر لینا چاہیئے کہ لاقانونیت انارکی اور بہیمانہ جرائم سے وہ کبھی اچھی حکومت کا قیام عمل میں نہیں لاسکتے انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ طور طریقے کسی بھی ملک میں کامیاب نہیں ہوئے اور ہند میں بھی ان کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

جناح کسی بھی مسئلہ کی حمایت یا مخالفت میں جذباتی رویہ اختیار نہیں کرتے تھے ان کا موقف ہمیشہ دلائل پر مبنی ہوتا تھا جب نازک نوعیت کے مذہبی مسائل درپیش ہوتے تھے، تو بھی وہ تعصب سے بے نیاز رہتے تھے، اپنی اس منفرد حکومت کا مظاہرہ انہوں نے قانونِ وقف کی منظوری کے وقت کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وقف کے ارکان میں سے کسی کی غلطی سے ان لوگوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے جن کے مفاد میں وقف قائم کیا گیا ہو امپیریل لیجسلیٹیو کونسل میں اس قانون پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اس قانون کے خلاف بنیادی اعتراض عام پالیسی کی بنیاد پر کیا گیا ہے حالانکہ معاملہ بہت سیدھا اور سادہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اسلامی قانون پر عمل ہونا چاہیئے اس سلسلے میں عام پالیسی کا ذکر نامناسب اور غیر متعلق بات ہے۔"

یہ قانون بالآخر کونسل نے منظور کر لیا اور وائسرائے نے بھی اس کی توثیق کر

Marfat.com

دی اس طرح یہ پہلا مسودۂ قانون تھا جو کسی غیر سرکاری رکن نے نجی طور پر پیش کیا ہو اور کونسل نے اسے منظور کر کے باقاعدہ قانون کی شکل دی ہو۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں کامیاب کارکردگی نے جناح میں خود اعتمادی بڑھا دی اس زمانے میں ان کی یہ رائے تھی کہ برصغیر کی آزادی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ان کے اس جوش کی بنا پر انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر لانے کے لیے ۱۹۱۳ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بھی رکن بن گئے اس وقت وہ امپیریل کونسل کے علاوہ کانگرس کے بھی رکن تھے۔ کانگرس کا اجلاس ۱۹۱۵ء میں ہونے والا تھا جناح نے مسلم لیگ کے ممتاز لیڈروں پر زور دیا کہ وہ بھی اسی جگہ اور انہی ایام میں مسلم لیگ کا اجلاس بلائیں ان کا خیال یہ تھا کہ ایک ہی مقام پر مسلم لیگ اور کانگرس کے ساتھ ساتھ اجلاسوں سے دونوں سیاسی جماعتوں کے لیڈروں میں قریبی ربط و تعلق پیدا کرنے میں مدد ملے گی چنانچہ ان کی یہ کوشش بار آور ہوئی اور اپریل ۱۹۱۶ء میں ان کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں کانگرس اور مسلم لیگ نے اس مقصد کے لیے ایک مشترکہ کمیٹی قائم کر دی کہ معاشرتی اور سیاسی شعبوں اہل ہند کی حالت بہتر بنانے کے لیے حکومت سے کیا مطالبات کیے جائیں، جناح کا دونوں جماعتوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے سلسلے میں یہ ایک اہم قدم تھا اس کے بعد جناح کی مساعی سے کانگرس اور مسلم لیگ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں ایک ساتھ اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرنے پر آمادہ ہو گئیں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت جناح نے کی اور اپنے خطبے میں فرمایا۔

"ہم کوئی انعام و رعایت نہیں چاہتے اور نہ کسی امتیازی سیاسی سلوک کے آرزومند ہیں۔"

میثاق لکھنؤ دسمبر ۱۹۱۶ء: کانگرس اور مسلم لیگ کے ان ایک ساتھ اجلاسوں کی وجہ سے دونوں جماعتوں میں ایک تاریخی معاہدہ ہوا جو میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کے معمارِ اعلیٰ محمد علی جناح جنہوں نے اپنی انتھک اور مخلصانہ مساعی سے دونوں جماعتوں کو اپنی سرگرمیوں میں باہمی اشتراک سے کام لینے پر آمادہ کر لیا تھا اس کے علاوہ کانگرس کا رویہ بھی فراخدلانہ تھا اس

Marfat.com

یثاق کی وجہ سے جو کہ قائداعظم کا عظیم کارنامہ تھا ہندوؤں نے مسلمانوں کے ایک بنیادی مطالبے جداگانہ انتخابات کے حق کو تسلیم کر لیا۔

آزادی کی جدوجہد میں میثاق لکھنؤ پہلا اور واحد سمجھوتہ تھا جس پر ہندو اور مسلم متفق ہوئے تھے لیکن حکومت برطانیہ نے اس ہندو مسلم اتحاد کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس طرح دونوں فرقوں کے لیے قابل قبول آئینی اصلاحات حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ضائع ہو گیا۔

مارچ ۱۹۱۹ء میں حکومت برطانیہ نے رولٹ ایکٹ منظور کیا اُسکے تحت حکومت کو وارنٹ اور مقدمہ چلائے بغیر گرفتاری کا اختیار دیا گیا تھا اس قانون کی ایک دفعہ کے تحت ملزم کو صفائی کا موقع دیئے بغیر خفیہ مقدمہ بھی چلایا جا سکتا تھا جب یہ مسودۂ قانون پیش کیا گیا تو محمد علی جناح نے اس کی سخت مخالفت کی لیکن حکومت نے کونسل کے سرکاری ارکان کی اکثریت سے یہ قانون منظور کرا لیا۔ چنانچہ جناح نے بطور احتجاج کونسل سے استعفیٰ دے دیا اور کہا کہ کیونکہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جو حکومت زمانہ امن میں ایسے قانون کو منظور کرائی ہے وہ مہذب حکومت کہلانے کا کوئی حق نہیں رکھتی تاہم مجھے امید ہے کہ وزیر امور ہند مسٹر مانٹیگ تاجدار برطانیہ کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اس کالے قانون کو مسترد کر دیں۔

قائداعظم کے اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ جناح کس قدر آئین پسندانہ مزاج اور حق گوئی کے جذبے کے آئینہ دار تھے اس زمانے میں ہندوستان کا کوئی دوسرا شخص اس کھلے اور برملا انداز میں وائسرائے کو خط لکھنا تو درکنار خط لکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر اینی بسنت نے "ہوم رول لیگ" کے نام سے ایک تحریک شروع کی جناح بھی اس کے رکن بن گئے اور بعد میں اس کی بمبئی شاخ کے صدر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں اینی کے مستعفی ہونے کے بعد گاندھی کو اس کی جگہ صدر منتخب کیا گیا گاندھی نے سب سے پہلے ہوم رول لیگ کی جگہ اس کا ہندی نام "سوراج سبھا" رکھ دیا تاکہ ہندوستان کے عام لوگ بھی اس میں کشش محسوس کرنے لگیں اس کے علاوہ گاندھی نے جماعت کے اغراض و مقاصد میں بھی تبدیلی کر دی ڈاکٹر اینی بسنت کے دور میں ہوم رول لیگ کا نعرہ "سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری" تھا لیکن اس کی جگہ گاندھی مکمل آزادی کا خواہاں تھا جناح کے

Marfat.com

آئین پسند ذہن نے ان تبدیلیوں کو من مانی کارروائی قرار دیا اور ان تبدیلیوں کے قانونی جواز پر اعتراض کیا گاندھی نے سرد مہری سے جواب دیا کہ اگر کسی رکن کو "تبدیل شدہ آئین" پسند نہیں تو وہ لیگ کی رکنیت سے مستعفی ہو سکتا ہے اس پر جناح اور مزید ۱۹۔ ارکان مستعفی ہو گئے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جناح بہت جرأت مند اور آئین نواز تھے کہ وہ کسی بھی دوسری بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے جو شخص بھی بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرتا تھا اسے جناح کی ضربِ بے اماں کا ہدف بننا پڑتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی اتحادی صلح نامہ سیورے کر رہے تھے جس میں ترکوں سے سخت ناروا سلوک کے علاوہ خلافت کے نظام کا خاتمہ بھی شامل تھا اس کے خلاف مسلمانانِ ہند نے مولانا محمد علی جوہر کی رہنمائی میں ملک کے طول و عرض میں پرجوش مظاہرے کیے۔ ابتداء میں یہ تحریک صرف مسلمانوں تک محدود تھی بعد میں کانگرس بھی اس میں شامل ہو گئی جناح سمجھتے تھے کہ گاندھی کے ہاتھ تحریک آجانے سے تشدد کا راستہ اپنا لیا جائے گا چنانچہ انہوں نے اس تحریک میں حصہ نہ لیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ آئینی ذرائع اختیار کرکے مقاصد حاصل کیے جائیں قائداعظم کے اس معقول رویہ کی برطانوی لیبر پارٹی کے ایک مندوب کرنل ویج ووڈ نے ان الفاظ میں تعریف کی۔

"ہند میں صرف ایک فردِ واحد اپنی مضبوطی کردار کے ساتھ اپنے اس موقف پر قائم رہا جسے وہ درست سمجھتا تھا نہ وہ بھرپور مخالفت سے مرعوب ہوا اور نہ حمایت و تائید کے فقدان سے اس کے حوصلے کا پرچم سرنگوں ہوا"

قائداعظم کو یہ صورت حال اچھی نہیں لگتی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں لیکن ایک موقع پر آکر یہ کوششیں ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہو گئیں۔

سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ: ۱۹۲۷ء میں دسمبر کے مہینے میں حکومت برطانیہ نے آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے ایک وفد لارڈ سائمن کی قیادت میں ہندوستان بھیجا جس میں کسی ہندوستانی نمائندے کو شامل نہیں کیا گیا تھا چنانچہ کانگرس اور مسلم لیگ نے بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ

Marfat.com

گیا اسی اثناء میں نہرو کی سربراہی میں ہندوستان کا آئین بنانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی اس کمیٹی نے ۱۹۲۸ء میں اپنی رپورٹ جو کہ "نہرو رپورٹ" کے نام سے مشہور ہے پیش کی اس رپورٹ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کے حق کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ ۱۹۱۶ء کے معاہدہ لکھنؤ میں انہوں نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا تھا دسمبر ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کا جائزہ لینے کے لیے کل جماعتی کانفرنس ہوئی جس میں اس رپورٹ پر سخت تنقید کی گئی جناح بھی ان میں شامل تھے انہوں نے کہا۔

"میں مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے یہ کہتا ہوں کہ آزادی کی جدوجہد میں سات کروڑ مسلمانوں کو ہمارے شانہ بشانہ چلنا چاہیئے۔

لیکن کانگرس نے نہ قائداعظم کے اخلاص کی کوئی قدر کی اور نہ ان کے جائز مطالبات کو کوئی اہمیت دی اس طرح کانگرس نے ہندو مسلم اتحاد کا سنہری موقع گنوا دیا۔

قائداعظم کے چودہ نکات:-

اگرچہ جناح کانگرس کے رویہ سے دل برداشتہ ہو چکے تھے لیکن انہوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک اور کوشش کی چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے چودہ نکات پر مشتمل ایک فارمولا پیش کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہند کے لیے مجوزہ آئینی اصلاحات میں ان نکات کو پیش نظر رکھا جائے اور صاف طور پر یہ بھی کہہ دیا کہ جس آئین میں ان نکات کو شامل نہیں کیا جائے گا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو گا قائداعظم کے ان نکات میں مسلمانوں کے جائز مطالبات پیش کیے گئے تھے لیکن ہندوؤں نے اسے تسلیم نہ کیا جس سے دونوں قوموں میں نفرت کی دیوار اور بڑھ گئی۔

گول میز کانفرنسیں:-

۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں آنے والے کمیشن یعنی سائمن کمیشن نے وزیراعظم کو مشورہ دیا کہ ہندوستان کے تمام اہم راہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائی جائے جس میں سب کے لیے قابل قبول آئینی ڈھانچہ مرتب کیا جائے۔

چنانچہ اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس بلائی

Marfat.com

جو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک جاری رہیں کانفرنس میں وائسرائے نے منتخب لیڈروں کو بلایا جن میں قائداعظم محمد علی جناح بھی تھے یہ کانفرنسیں ناکام ہوئیں کیونکہ کانگرس مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ماننے کے لیے تیار نہ تھی چنانچہ دونوں جماعتوں کے درمیان کسی تصفیہ کے نہ ہونے کی وجہ سے حکومت برطانیہ نے اپنی طرف سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظور کر لیا اگرچہ دونوں جماعتوں نے اس ایکٹ کو پسند نہ کیا البتہ ۱۹۳۷ء میں ہونے والے انتخابات میں دونوں سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔

گول میز کانفرسوں میں کانگریس کے رویہ سے دل برداشتہ ہو کر قائداعظم نے لندن میں ہی مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی اس طرح ان کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع ہو گیا۔

۱۹۳۳ء میں لیاقت علی خان اور دوسرے کئی لیڈروں کے اصرار پر ۱۹۳۴ء میں جناح واپس ہندوستان تشریف لائے اس دوران کانگرس نہ صرف ایک وسیع اور مضبوط تنظیم بن چکی تھی بلکہ اس نے بعض مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی اپنے قدم جما لیے تھے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کا احیاء اور اسے کل ہند بنیادوں پر مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بنانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن جناح نے انتھک محنت سے مسلم لیگ کو ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے قابل بنا دیا لیکن وقت بہت کم تھا اس لیے کوئی حوصلہ افزا نتائج برآمد نہ ہوئے۔ 1937 to 1939

کانگرسی وزارتیں:۔ انتخابات میں کامیابی نے کانگرس کو مغرور بنا دیا تھا انہوں نے گیارہ میں سے سات صوبوں میں اپنی وزارتیں بنا لیں اس غرور میں نہرو نے کہا کہ۔

"ہند میں اس وقت صرف دو طاقتیں ہیں۔ برطانوی سامراج اور ہندی قوم پرست مو اخر الذکر کی نمائندگی کانگرس کرتی ہے"

قائداعظم نے اس دعویٰ کو غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ۔

"تیسری طاقت مسلم لیگ ہے جو مسلمانانِ ہند کی واحد ترجمان ہے"

اس پر کانگرس نے مسلم لیگ اور مسلمانوں کے خلاف غیر جمہوری تحریک شروع کی اور انہیں بے انتہا مظالم کا نشکار بنایا کانگریسی وزارتوں کے دوران ہندوؤں کا رویہ

Marfat.com

دیکھ کر قائداعظم کو یقین ہو گیا کہ ہندو اکثریت مسلمانوں سے منصفانہ سلوک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اس دوران ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے قائداعظم کو لکھا کہ

"آخر شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو اس طرح کی قومیں کیوں نہیں تصور کیا جا سکتا جس طرح ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر دوسری اقوام ہیں۔"

علامہ اقبال کے یہ الفاظ جناح کے دل میں گھر کر گئے وہ کانگرس کے رویے سے تو پہلے ہی دل برداشتہ ہو چکے تھے چنانچہ انہیں یقین ہونے لگا کہ ہند کے مسلمان ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے غالباً اسی احساس کے تحت انہوں نے سندھ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۳۸ء میں یہ سفارش کی کہ

"آل انڈیا مسلم لیگ ایسی آئینی سکیم واضع کرے کہ جن صوبوں اور ریاستوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ بالآخر خود اپنے وفاق کے تحت مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔"

چنانچہ ۲ سال مسلمانوں پر مظالم ڈھانے کے بعد کانگریسی وزارتوں سے مسلمانوں کو نجات ملی اور قائداعظم کے کہنے پر مسلمانوں نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ملک بھر میں "یوم نجات" منایا کانگرس اس پر حیرت زدہ رہ گئی کیونکہ یوم نجات منانے میں مسلمانوں کے علاوہ پارسی عیسائی اچھوت اور بزاروں ہندو بھی شامل ہوئے تھے۔

اس دوران قائداعظم مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کے قیام کے مسئلہ پر مسلسل سوچ بچار کرتے رہے انہیں مکمل یقین تھا کہ انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد ہندو مسلمان کو برداشت نہیں کریں گے اور کانگریسی وزارتوں میں وہ اس کا تجربہ دیکھ چکے تھے چنانچہ ۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو برطانیہ کے جریدہ "ٹائم اینڈ ٹائیڈ" میں ایک مضمون میں لکھا کہ

"انگریز چونکہ مسیحی ہیں اس لیے وہ اپنے ملک کی مذہبی جنگوں پر بھول لنے لگتے ہیں اب وہ مذہب کو انسان اور خدا کے مابین ایک انفرادی اور نجی معاملہ سمجھتے ہیں لیکن ہندوازم اور اسلام میں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ دونوں مذاہب اپنی اپنی جگہ معاشرتی نظام بھی ہیں اور ان میں انسان اور خدا کے مابین تعلق کے بجائے انسان کے اپنے ہمسائے کے ساتھ

Marfat.com

تعلقات پر زیادہ زور دیا گیا ہے یہ مذاہب نہ صرف ان کے قانون اور ثقافت بلکہ ان کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہیں"

قرارداد لاہور:۔ برطانوی جریدے میں اس مضمون کی اشاعت کے صرف دو ہفتے بعد مسلم لیگ نے تاریخی قرارداد منظور کی جسے بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے شہرت حاصل ہوئی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس عظیم جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کانگرس کی حکومت کے دور میں مسلمانوں پر کیے گئے مظالم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا کہ ہمیں کانگرسی وزارتوں کے دوران کئی تجربے ہوئے ہیں اور ہم نے تجربے سیکھے ہم ہندوؤں سے خوفزدہ ہیں اور ان پر اعتبار نہیں کر سکتے اس بات کو غلط طور پر حقیقت سمجھ لیا گیا ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور وہ خود بھی عرصے سے اس اصطلاح کے عادی ہو چکے ہیں لیکن مسلمان اقلیت نہیں ہیں بلکہ وہ ہر تعریف کی رو سے ایک قوم ہیں انہوں نے مزید فرمایا کہ

ہندوؤں اور مسلمانوں کا دو مختلف مذہبی فلسفوں، علیحدہ رسوم و رواج اور جداگانہ مذہبیات سے تعلق ہے وہ نہ ایک دوسرے میں شادی کرتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں در حقیقت ان کا تعلق دو مختلف تہذیبوں سے ہے جن کی بنیاد باہم متصادم نظریات اور تصورات پر ہے زندگی کے بارے میں ان کے تصورات یکسر مختلف ہیں ان کی داستان ہائے شجاعت علیحدہ ہیں ایک قوم کے ہیرو کو دوسری قوم دشمن قرار دیتی ہے ان کی فتوحات اور شکستیں بھی ایک دوسرے کے خلاف ہیں ایسی دو قوموں کو ایک ہی مملکت میں اکٹھے جوت دینا جب کہ ان میں ایک اقلیت میں ہو اور دوسری اکثریت میں بے اطمینانی میں ہی اضافہ ہو گا مسلمان ہر اعتبار سے ایک قوم ہیں اور ان کا اپنا وطن، اپنا ملک ہونا چاہیئے"۔

قرارداد لاہور میں مسلمانوں کے نصب العین اور منزل کا تعین کیا گیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا چنانچہ مسلمان جنہوں نے محمد علی جناح کو اس وقت قائداعظم کا خطاب دیا متحد ہونے لگے۔

قرارداد لاہور کی منظوری کے دو سال بعد حکومت برطانیہ کی طرف سے سر سٹیفرڈ

Marfat.com

کرپس ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ آئینی مسائل پر تبادلہ خیالات کے لیے بھیجا گیا کرپس نے جنگ کے بعد ہندوستان کے لیے نوآبادیاتی درجہ اور ایک آئین ساز ادارہ قائم کرنے کی پیش کش کی لیکن کانگرس نے کرپس کی تجاویز کو مسترد کر دیا مسلم لیگ نے بھی تجاویز مسترد کیں کیونکہ اس میں قیام پاکستان کا کھل کر وعدہ نہیں کیا گیا تھا دوسری طرف قائداعظم تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے تھے کانگرسی اس سے فکرمند تھے چنانچہ انہوں نے حکومت برطانیہ پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالنے کا راستہ اختیار کیا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر کے اقتدار کانگرس کو منتقل کر دے تاکہ برطانیہ کے اخراج کے بعد قائداعظم سے اور مسلم لیگ سے اپنی من مانی شرائط منوا سکیں اسی منصوبے کے تحت کانگرس نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء "ہندوستان چھوڑ دو" قرارداد منظور کی مسلم لیگ نے اور قائداعظم نے مسلمانوں کو اس تحریک سے الگ رہنے کا مشورہ دیا۔

مسلمانوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حکومت برطانیہ نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک کو سختی سے دبانے کے لیے سختی سے کام لیتے ہوئے تمام سرکردہ لیڈروں کو جیلوں میں ڈال دیا قائداعظم نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ کو از سرِ نو منظم کیا اور مطالبہ پاکستان کو ہندوستان کے طول و عرض کے تمام مسلمانوں کی آواز بنا دیا یہ سب قائداعظم کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا مطالبہ پاکستان کا مطلب تھا کہ نہ صرف ہندوؤں سے آزادی بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ پاکستان ایک آزاد اسلامی مملکت ہو گی جس میں وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کر سکیں گے مئی ۱۹۴۴ء میں گاندھی کو رہا کر دیا گیا لیکن اس دوران مسلم لیگ "پاکستان" کو تمام مسلمانانِ ہند کا مطالبہ بنا چکی تھی گاندھی اب اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے قائداعظم سے ملنے کی خواہش کی قائداعظم ان دنوں کشمیر کا دورہ کر رہے تھے انہوں نے گاندھی کو جواب میں لکھا کہ وہ وسط اگست تک بمبئی پہنچ جائیں گے اور اگر گاندھی ان کے ہاں تشریف لائیں تو انہیں خوشی ہو گی۔

جناح گاندھی مذاکرات:۔ قائداعظم اور گاندھی کے درمیان ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ملاقاتوں اور بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا اور تین ہفتے تک جاری رہا لیکن دونوں راہنماؤں کے نقطۂ نظر میں بہت زیادہ فرق کی

Marfat.com

وجہ سے مذاکرات ناکام ہوئے البتہ ان مذاکرات سے قائداعظم کو ہندو ذہنیت کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع مل گیا۔

ان مذاکرات کے چند دن بعد قائداعظم نے لندن کے "نیوز کرانیکل" کو ایک انٹرویو دیا کہ جو ۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء کے شمارے میں شائع ہوا اس میں قائداعظم نے کہا کہ ہندو مسلم اختلافات کو دور کرنے کا صرف ایک ہی عملی طریقہ ہے یعنی ہندوستان کو دو آزاد اور خود مختار حصول یعنی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر دو پر اعتماد کیا جائے کہ پاکستان میں ہندو اقلیت سے اور ہندوستان میں مسلم اقلیت سے منصفانہ سلوک کیا جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندو ہماری مکمل آزادی کو ذہنی طور پر تسلیم نہیں کریں گے۔

شملہ کانفرنس:- دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے قریب حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل بنائی جائے گی تاکہ بعد میں مرکزی عبوری حکومت کا قیام عمل میں آسکے چنانچہ جون ۱۹۴۵ء میں گورنر جنرل نے تمام پارٹیوں کی ایک کانفرنس شملہ میں بلائی جس میں گاندھی، ابو الکلام آزاد اور قائداعظم بھی شامل ہوئے کانفرنس کے نتیجے کے طور پر سیاسی جماعتوں نے ایگزیکٹو کونسل کے ممبران کے نام تجویز کرتے تھے لیکن کانفرنس کے دوران کانگرس نے دعویٰ کیا وہ ہی ہندوستان کی واحدہ نمائندہ جماعت ہے اس لیے مسلمان ممبران کے نام بھی کانگرس ہی تجویز کرے گی جبکہ قائداعظم کا نقطۂ نظریہ تھا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے چنانچہ اس اختلاف کی بنا پر کانگرس ناکام ہو گئی قائداعظم نے اس موقع پر ایک واضع موقف اختیار کر کے پاکستان کے قیام کے لیے راہ ہموار کر دی اس لیے کہ اگر اس وقت کانگرس کامیاب ہو جاتی تو انہی بنیادوں پر عبوری حکومت کا قیام عمل میں آتا اور نتیجہ کے طور پر ہندوستان کی تقسیم کی تجویز کانفرنس کی اکثریت کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو جاتی کانگرس کی ناکامی کے نتیجے میں انتخابات ہوئے جس میں قائداعظم کا فرمان سچ ثابت ہوا کہ مسلم لیگ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ان انتخابات میں واضع کامیابی نے مسلم لیگ کے اس دعویٰ کو درست ثابت کر دیا کہ

۱۔ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

Marfat.com

(ا) ہندوستان کے مسلمان مطالبہ پاکستان پر متفق ہیں۔

مسلم لیگ کی بھرپور کامیابی دراصل قائداعظم کی رہنمائی اور قابلیت کو کھلا خراج عقیدت تھا یہ ان کی قیادت کا کارنامہ تھا کہ جس مسلم لیگ کو ۱۹۳۷ء میں ۴۸۲ مسلم حلقوں میں سے صرف ۱۰۲ حلقوں میں کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن صرف آٹھ سال بعد وہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔

کابینہ مشن مارچ ۱۹۴۶ء:۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں حکومت برطانیہ نے ایک "کابینہ مشن" کے قیام کا اعلان کیا جس کا مقصد ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ صلاح و مشورہ سے انتقال اقتدار کی سکیم مرتب کرنا تھا اس مشن کے ارکان ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان پہنچے انہوں نے پہلے کانگرس اور مسلم لیگ کے متضاد نقطۂ نظر میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور پھر ۱۶ مئی کو اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا اس منصوبے میں جداگانہ نیابت کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا قیام بھی شامل تھا اور ہر دس لاکھ افراد کے لیے ایک رکن منتخب کیا جاتا تھا۔ اس اسمبلی نے اتحاد ہند کے لیے آئین تیار کرنا تھا منصوبے میں صوبوں کے تین گروپ بھی بنائے گئے تھے۔

اپنے اس منصوبے کی وضاحت کے سلسلے میں کابینہ مشن نے ۲۵ مئی کو ایک بیان جاری کیا کہ "صوبوں کی گروپ بندی ہماری سکیم کا بنیادی اور لازمی حصہ ہے اور اس میں فریقین باہمی رضامندی سے ہی ردوبدل کر سکتے ہیں جب آئین بن جائے گا تو پھر کوئی صوبہ عوام کی رائے سے ہی کسی گروپ سے علیحدہ ہو سکے گا۔"

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۶ جون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں ہوا کونسل نے اگرچہ مسلمانوں کی علیحدہ خود مختار مملکت قائم نہ ہوتے پر احتجاج کیا تاہم اس نے کابینہ مشن کے مختصر المیعاد اور طویل المیعاد منصوبے کو قبول کر لیا کیونکہ اس سکیم میں چھ مسلم صوبوں کی لازمی گروپ بندی کر دی گئی تھی اور اس طرح پاکستان کے تصور کو قبول کر لیا گیا تھا۔

مسلم لیگ کی طرف سے اس فیصلے سے دو دن قبل ۴ جون کو وائسرائے نے قائداعظم کو ایک خط میں بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ

"آپ نے کل اس یقین دہانی کے لیے کہا تھا کہ اگر ایک فریق نے منصوبہ قبول کر لیا اور دوسرے نے مسترد کر دیا تو پھر کیا صورت ہوگی میں آپ کو ذاتی طور پر یقین دلاتا ہوں

Marfat.com

کہ اس سلسلے میں کسی بھی فریق سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی ایک پارٹی نے منصوبہ کو تسلیم کر لیا تو حتی الواسع حالات کی اجازت کے تحت ہم منصوبے پر عمل درآمد کریں گے تاہم ہمیں یقین ہے کہ دونوں فریق اس منصوبے کو تسلیم کر لیں گے۔"

کانگریس اگرچہ اس منصوبے سے مطمئن اور خوش نہیں تھی لیکن اس نے بھی یہ منصوبہ قبول کر لیا کانگریس اور مسلم لیگ کی طرف سے منصوبہ قبول کر لینے کے بعد وائسرائے نے دونوں جماعتوں کے لیڈروں کے ساتھ عبوری حکومت کے قیام کے لیے مذاکرات شروع کر دیئے وائسرائے کے مطابق عبوری حکومت میں کل ۱۲ وزیر ہوں گے جن کا تناسب یوں ہو گا پانچ کانگرس پانچ مسلم لیگ ایک سکھ اور ایک عیسائی لیکن نہرو نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا چنانچہ وائسرائے نے ایک اچھوت وزیر لے لیا تاکہ کانگرس کی ۶ نشستیں ہو جائیں اس پر قائداعظم نے تنقید کی چنانچہ ان حالات میں وائسرائے نے وزراء کی تعداد ۱۴ کر دی جن میں مسلم لیگ کے ۶ کانگرس کے چھ ایک عیسائی ایک پارسی وائسرائے کے انداز فکر میں تبدیلی و انحراف کے سلسلے میں قائداعظم نے اسے ایک خط لکھا کہ

"اپنی عبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں آپ نے یہ چوتھی تجویز پیش کی ہے کانگرس نے اس سے پہلے تین مرتبہ انکار کیا ہے اور آپ نے انہیں رضامند کرنے کے لیے ہر بار اپنی اصل تجویز سے اس طرح انحراف کیا ہے کہ نئی صورت کانگرس کے لیے مفید اور مسلم کے لیے نقصان دہ ہو جاتی ہے آپ کی تازہ ترین تجویز نے مساوی نیابت کے اصول کو مکمل طور پر پامال کر دیا ہے اور مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگرس کو واضح اکثریت عطا کر دی ہے۔"

نئی ترتیب بھی کانگرس کو قبول نہ تھی چنانچہ اس نے عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اس پر قائداعظم کو امید تھی کہ وائسرائے کی یقین دہانی کے مطابق کیا مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ مستقل افسران پر مشتمل نگران حکومت قائم کر دی گئی قائداعظم اس پر بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے کہا۔

"میں پورے زور اور وثوق سے کہتا ہوں کہ کابینہ مشن اور وائسرائے اپنے

Marfat.com

قول سے منحرف ہو گئے ہیں اور انہوں نے ۱۶ جون کے بیان پر عمل درآمد نہیں کیا۔"

کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت نہ ہونے کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے اس کے علاوہ مسلم لیگ کو بھی اپنا کوئی تحفظ نظر نہ آیا اس پر مسلم لیگ نے کابینہ مشن کے منصوبے کی جو قبل ازیں توثیق کی تھی اسے منسوخ کر دیا اس کے علاوہ ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں "حصول پاکستان کے لیے راست اقدام" کا فیصلہ کیا گیا تاکہ "برطانیہ کی موجودہ غلامی اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے آئندہ غلبے سے نجات حاصل کی جا سکے" قائداعظم نے اپنے طویل سیاسی کردار میں پہلی مرتبہ "راست اقدام" کا راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ آئینی ذرائع سے مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کے لیے بات چیت بے سود ہو کر رہ گئی ہے۔

قائداعظم کے اس جرأت مندانہ مؤقف سے کانگرس بہت مضطرب ہو گئی اور اس نے ۱۰ اگست ۱۹۴۶ء کو ایک قرارداد منظور کی کہ وہ کابینہ مشن کا منصوبہ قبول کرنے کے لیے تیار ہے لیکن اب پانی سر سے گذر چکا تھا کانگرس کے منصوبے کے بارے میں داخلی عزائم بے نقاب ہو چکے تھے اور قائداعظم نے کانگرس کی یہ یقین دہانی قبول کرنے سے انکار کر دیا انہوں نے کہا۔

"کانگرس نے اس طرح اپنے موقف کا صرف اعادہ کیا ہے البتہ انہوں نے کچھ الفاظ بدل دیئے ہیں ابھی انگریز ملک میں موجود ہیں اور ان کی موجودگی میں کانگرس اپنے موقف میں اس قدر کثرت سے ردوبدل کر سکتی ہے تو برطانیہ کے رخصت ہو جانے کے بعد اقلیتیں کس طرح اعتماد کر سکتی ہیں کہ کانگرس ایک مرتبہ پھر وہی موقف اختیار نہیں کرے گی جس کا اظہار نہرو کے بیان میں کیا گیا تھا۔"

چنانچہ وائسرائے نے کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی مسلم لیگ کو وقتی طور پر نظر انداز کیا گیا البتہ کچھ مدت بعد مسلم لیگ کو شامل کر لیا گیا اور اس کے پانچ نمائندے لیے گئے جن کے قائد لیاقت علی خاں تھے ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو انہوں نے حلف اٹھایا۔

Marfat.com

وزیراعظم اٹیلی کا بیان:- ۲۷ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیراعظم برطانیہ اٹیلی نے اپنی حکومت کے اس "قطعی اور حتمی عزم" کا اعلان کر دیا کہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے اہل ہند کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے اس مقصد کے لیے لارڈ مونٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا وہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو ہندوستان پہنچا وہاں پر بے چینی کا عالم تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ برطانیہ اقتدار چھوڑنے والا ہے چنانچہ مرکزی ملازمتوں میں ہندو اور مسلم افسر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے عام زندگی میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات ہو رہے تھے مسلمان ہر جگہ "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگا رہے تھے جبکہ ہندو اس کی مخالف کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مونٹ بیٹن نے جون ۱۹۴۸ء سے پہلے اقتدار منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

چنانچہ قائد اعظم نے کانگرسی راہنماؤں سے تبادلہ خیال کیا اور ایک منصوبہ بنایا جو کہ ۳ رجون کے منصوبے سے مشہور ہے۔

۳ رجون کا منصوبہ:- مونٹ بیٹن نے اپنے منصوبے کا ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اعلان کیا قائد اعظم نہرو۔ بلدیو سنگھ نے ریڈیو سے تقریریں کر کے اس منصوبہ کو منظور کرنے کا اعلان کیا قائد اعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بتایا کہ پاکستان معرضِ وجود میں آنے والا ہے تقریر ختم کرتے ہوئے وہ کچھ جذباتی ہو گئے یہ غالباً ان کی زندگی کا پہلا اور اپنی نوعیت کا آخری موقع تھا کہ انہوں نے بلند آواز اور پر جوش لہجہ میں "پاکستان زندہ باد" کہہ کر اپنی تقریر ختم کی۔

۳ رجون کے منصوبے کے تحت پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحدوں کا تعین ایک حد بندی کمیشن نے کرنا تھا مسلم لیگ۔ اور کانگرس اس کمیشن کے سربراہ کے طور پر ریڈ کلف کے تقرر پر آمادہ ہو گئیں بعد میں قائد اعظم کو اس شخص کے فیصلوں پر صدمہ ہوا اور انہوں نے صرف اس تبصرے پر اکتفا کیا۔

"ہندوستان کی حتمی اور قطعی اور ناقابل تنسیخ تقسیم ہو چکی ہے۔ بلاشبہ اس عظیم اور آزاد مسلم مملکت کے قیام میں ہم سے ناانصافی ہوئی ہے ہمیں حتی الوسع زیادہ سے زیادہ مختصر اور محدود کرنے کی کوشش کی گئی

Marfat.com

ہے اور آخری وار حد بندی کمیشن نے کیا ہے اس کا فیصلہ غیر منصفانہ اور ناقابل فہم یہ ہے عدالتی فیصلہ نہیں بلکہ سیاسی فیصلہ بھی نہیں لیکن ہم اسے قبول کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور ہم اس کے پابند ہیں باعزت قوم کو اس کی پابندی کرنی چاہیئے یہ ہماری بدقسمتی ہے لیکن ہمیں اس نئی اور مزید ضرب کو بھی ثابت قدمی جرأت اور امید کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے"

قیام پاکستان اور قائداعظم کی رہنمائی

قیام پاکستان بلاشبہ قائداعظم کی بہترین رہنمائی کا نتیجہ ہے جس انداز میں انہوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کا مقابلہ کیا خاص طور پر کابینہ مشن کے منصوبے کے بعد وہ ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے وہ ہمیشہ معقول اور عملی رویہ اختیار کرتے تھے وہ دونوں فریقوں میں مفاہمت کے لیے مصالحت پر آمادہ ہو جاتے تھے لیکن انہیں ڈرا دھمکا کر یا دباؤ کے تحت اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات یا منصوبہ تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا سے ایک ملاقات کے دوران انہوں نے کہا تھا کہ:

"فیصلہ کرنے سے پہلے ایک سو مرتبہ سوچو لیکن جب فیصلہ کر لو تو پھر اس پر ڈٹ جاؤ"

یہی سبق اور رہنما اصول انہوں نے مسلم لیگ کے سامنے رکھا اور اسے ملحوظ رکھنے سے انہیں پاکستان حاصل کرنے کے مقصد میں شاندار کامیابی ہوئی۔

پاکستان اور بھارت کی تحریک آزادی کے سیاسی لیڈروں کے کردار کا بے لاگ جائزہ لیا جائے تو قائداعظم منصف مزاجی اور بے لوثی کے اعتبار سے سرفہرست نظر آتے ہیں وہ نہرو، گاندھی اور دوسرے سرکردہ لیڈروں میں سب سے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں انہوں نے سیاست میں ناجائز ذرائع اور گھٹیا ہتھکنڈوں کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا انہوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ سیاسی زندگی کے ابتدائی دور میں جب وہ ہندو مسلم اتحاد

Marfat.com

کے داعی تھے تو وہ اس خیال سے شرم سار تھے کہ ہندوؤں سے تعاون کرنے سے مسلمانوں کا مفاد محفوظ ہو سکتا ہے لیکن بعد کے تجربات بالخصوص نہرو رپورٹ کی اشاعت اور گول میز کانفرنس کے جب ان پر ہندو ذہنیت پوری طرح عیاں ہو گئی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ کانگریس کا مقصد ہندو راج ہے اور ان کے اس تاثر کو ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات کے بعد کانگرس کے اڑھائی سالہ دور حکومت نے تقویت پہنچا دی تو پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے لیے اپنی علیحدہ مملکت کا قیام ضروری ہے اس کے بعد دن رات قیام پاکستان کے لیے کام کرنے لگے اور اپنے خلوص بے لوث محنت اور تدبر سے اس مہم میں بھی انہیں عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی۔

زندگی کے کسی بھی دور میں قائداعظم اقتدار برائے اقتدار کے خواہاں نہیں ہوئے تھے پاکستان کی جدوجہد میں انہوں نے اس یقین کے ساتھ کام کیا کہ انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکیں گے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں مذاکرات کی ناکامی کے بعد انہوں نے گاندھی سے جو خط و کتابت کی اس کے سرسری مطالعہ سے قائداعظم کا خلوص ظاہر ہوتا ہے گاندھی کا خیال تھا کہ چند مراعات سے قائداعظم کو مطمئن کیا جا سکے گا لیکن قائداعظم نے اس کے جال میں پھنسنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کابینہ مشن کے منصوبے کے سلسلے میں کانگرس نے جس ہیر پھیر سے کام لیا اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قائداعظم نے اپنی خداداد بصیرت سے ۱۹۴۴ء میں گاندھی کے ساتھ مذاکرات میں ہی بھانپ لیا تھا کہ ہندو مسلمانوں سے انصاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ۱۹۴۲ء میں کانگرس کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے جواب میں انہوں نے کہا "تقسیم کرو اور چلے جاؤ" کا جو نعرہ لگایا تھا وہ کس قدر درست اور حق پر مبنی تھا۔

کانگریسی راہنماؤں کے مقابلے میں قائداعظم بدرجہا زیادہ راست باز اور باوقار مدبر تھے انہوں نے کبھی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے عوام کے جذبات سے نہیں کھیلا وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے ان کا استدلال ایمان و یقین پر مبنی ہوتا تھا اس لیے کوئی شخص ان کی دلیل کو جھٹلا نہیں سکتا تھا ان کے اقدامات بالکل واضح اور ہر قسم کے ہیر پھیر سے پاک ہوتے تھے وہ واحد مسلمان رہنما تھے جو

Marfat.com

صاف ذہن اور غیر معمولی بصیرت کے مالک ہونے کے باعث گاندھی اور نہرو کے عزائم کو بھانپ لیتے تھے انہی اوصاف کی بنا پر وہ سب سے بڑی اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد میں کامیاب ہوئے قائداعظم کو انسانی محنت پر پورا پورا اعتماد تھا انہیں یقین تھا کہ مسلمان پوری لگن سے سرشار ہو کر پاکستان کو برقرار رکھ سکیں گے اور وہ اس سلسلے میں غیر ملکی امداد پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے قائداعظم کی صحت خراب ہو گئی تھی لیکن دن رات کی مصروفیات کی وجہ سے انہیں آرام کا موقع نہ ملا جس کی وجہ سے ان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی جولائی ۱۹۴۸ء کو ان کی بیماری شدت اختیار کر گئی اور یوں مسلمانوں کا یہ عظیم رہنما ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اس دنیا سے کوچ کر گیا لیکن ان کا نام مسلمانان پاکستان کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور ان کا کردار پاکستانیوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

Marfat.com

مولانا ظفر علی خان

جذبۂ توحید سے سرشار سردارِ دوجہاں کے جانثار مسلمانانِ عالم کے غمگسار روزنامہ "زمیندار" کے قلمکار مولانا ظفر علی خان علامہ اقبال کی پیدائش سے پانچ سال پہلے ۱۸۷۰ء میں وزیر آباد کے ایک گاؤں کرم آباد میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی، اے کیا شروع میں نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے وہاں سے حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ پہنچے اور ترقی کرتے کرتے اس کے اسسٹنٹ رجسٹرار ہوئے وہاں سے میر خان علی خان کے اتالیق بنے پھر ہوم سیکرٹری کے منصب پر فائز ہوئے لیکن اس آزاد فطرت انسان کو یہ ملازمتیں اور نوکریاں راس نہ آئیں اور واپس اپنے وطن چلے گئے۔

گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے والد منشی سراج دین احمد نے وزیر آباد سے "ہفت روزہ زمیندار" نکال رکھا ہے آپ نے اس کی ادارت کے فرائض سنبھال لیے اور اسے وزیر آباد سے لاہور لے آئے جہاں جنگِ طرابلس و بلقان کی خبروں تے اسے ہفت روزہ سے روزنامہ بنا دیا اور بہت جلد یہ اخبار میدانِ صحافت پر چھا گیا مولانا ظفر علی خان کی منظومات، مقالات اور فکاہات نے "زمیندار" کو اچھالا اور "زمیندار" نے مولانا ظفر علی خان کو بامِ شہرت پر پہنچایا۔

"مولانا ظفر علی خان جس دور میں پیدا ہوئے وہ اس برصغیر میں ایک مہیب ذلت کا دور تھا فرنگی اقتدار اپنی پوری قہرانیوں کے ساتھ پورے عروج پر تھا مشرقِ وسطیٰ میں اس کے پنجے آگے بڑھ رہے تھے اور اپنی گرفت کو مضبوط کر رہے تھے برصغیر کا ہر تعلیم یافتہ فرد غیر ملکی اقتدار سے لازوال وابستگی کو سرخروئی کا سامان سمجھتا تھا۔ مغربی تہذیب موج در موج اس خطہ ارضی کی طرف بڑھ رہی تھی سیاسی محکومیت کے ساتھ ساتھ

Marfat.com

دہنی مرعوبیت بھی آگئی تھی۔

مولانا ظفر علی خان ان ناموافق حالات اور ناموزوں فضا میں میدانِ عمل میں نکلے جبکہ غیر ملکی تہذیب کو روکنا اور للکارنا بڑے دل گردے کا کام تھا مولانا نے اس تہذیب مغربی کے منہ پر تھپیڑ بھی رسید کیا اور اسے حرام زادی بھی کہا اگر مولانا ظفر علی خان اور ان کے ہمسفر ہم نوا عوام میں مغربی تہذیب سے نفرت پیدا نہ کرتے تو پاکستان کی تحریک کے لیے زمین ہموار نہ ہو پاتی۔ ان رہنماؤں نے ایسا ذہن تیار کیا جس نے پاکستان کا تصور نہایت آسانی کے ساتھ قبول کر لیا۔

سیاسی اکھاڑے:۔ تحریکِ خلافت کے آغاز سے لے کر قیامِ پاکستان تک احرار، نیشنلسٹ، نیلی پوش، خاکسار، اتحاد ملت اور مسلم لیگ وغیرہ جتنی بھی سیاسی جماعتیں میدان عمل میں آئیں مولانا ان سب میں پیش پیش رہے انہوں نے اپنے سینے اور سفینے دونوں سے ہر ایک کی مدد کی ان کے ہنگامی دور کی تحریروں اور تقریروں کا جائزہ لینے سے بآسانی پتہ چلتا ہے کہ وہ تقریباً ہر تحریک کے روحِ رواں رہے مگر کہیں استقلال کے ساتھ نہ ٹھہر سکے۔

مولانا ظفر علی خان جسے حق پر پاتے اس کے ساتھ شامل ہو جاتے اور اگر کسی سے کوئی ناحق بات سرزد ہو جاتی تو بلا امتیاز گاندھی، نہرو، آزاد یا مولانا جوہر کے علامہ اقبال یا قائدِ اعظم کے اپنے قلم سے ان کی مذمت کرتے۔

قومی شاعر:۔ جنگ آزادی کے ساتھ قومی شاعری کا بھی آغاز ہوا لیکن اس کے سو سال میں کئی قومی شاعر سامنے آئے ان کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال اگرچہ مولانا ظفر علی خان سے بعد میں آئے لیکن قومی شاعری کے میدان میں انہوں نے ان سے پہلے قدم رکھا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء میں قومی میدان میں مولانا ظفر علی خان نمودار ہوئے اس دور میں آپ کی چار نظمیں "مارشل لا"، "فریاد جرس" "فانوس ہند کا مشعلہ" اور "ہندوستان" مشہور ہیں لیکن قومی شاعروں کی طویل فہرست میں مولانا ظفر علی خان اس لحاظ سے سرِ فہرست ہیں۔

۱۔ انہوں نے حق گوئی و حق کوشی کی پاداش میں سب سے زیادہ قید کاٹی جس کا مجموعہ بارہ سال ہوتا ہے۔

Marfat.com

۲- ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ جرمانہ ادا کیا۔

۳- ان کا اخبار "زمیندار" پندرہ دفعہ بحکم سرکار ضبط ہوا۔

۴- دوسو کے قریب نظمیں ضبط ہوئیں۔

۵- ان کے کئی پریس ضبط ہوئے مگر دنیا کی کوئی طاقت انہیں حق گوئی سے باز نہ رکھ سکی۔

مولانا ظفر علی خان جب کوئی سیاسی نظم کہتے تو ایوان حکومت میں زلزلہ آجاتا تھا۔ دہلی کے والسرائے نیگل لاج سے لے کر لندن کی ۱۰ڈاوننگ سٹریٹ کے ارباب اقتدار تھرا اٹھتے فروری ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس برہانیوں کے خطبۂ صدارت میں عالمی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ہمارے وزراء کوئی دودھ پیتے بچے نہیں۔ بڑے زیرک بڑے فطین اور بڑے دقیقہ سنج ہیں کیا انہیں اس نئی قوت کا علم نہیں جو کردستان اور آذربائیجان۔ اناطولیہ اور قفقاز میں نشوونما پا رہی ہے کیا وہ بالشویکوں کے روز افزوں اقتدار، ان کی فاتحانہ پیش قدمی اور ان کی عالم سوز نیتوں سے ناواقف ہے کیا انہیں ترکستان کے نئے جذبہ ملت پرستی کا علم نہیں ہے کیا وہ افغانستان کی نوزائیدہ سیاسی تمناؤں سے بے خبر ہیں"

مولانا کی تقریر کے اس ٹکڑے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے روس کے عزائم اور افغانستان کے وزیراعظم سردار محمد داؤد خان کا کردار اس وقت ان کے عین سامنے تھا جو پختونستان کے خواب دیکھ رہے تھے اسی طرح نئی تہذیب و تمدن کے متعلق انہوں نے جس نظریے کا اعلان آج سے چون سال قبل کیا وہ آج بھی حقیقت کا درجہ رکھتا ہے کہ

"مسلمانوں کو اس تمدن کے ساتھ ہرگز کوئی وابستگی نہیں ہوسکتی جس نے بجلی اور بھانپ، شراب اور کباب سنگین اور توپ ہی کو معیار ارتقاء قرار دے رکھا ہے"
مولانا ظفر علی خان کی ساری زندگی مسلمانوں کو صرف ایک نقطہ سمجھانے میں گذر گئی کہ

Marfat.com

جب تک رہے تم دستِ نگر اپنے خدا کے
ہوتے نہ دیا اس نے تمہیں غیر کا محتاج
جو ہو گئے اس کے وہ ہوا ان کا نگہبان
اس کی ہے جنہیں شرم ان کی بھی اسے لاج

مولانا ظفر علی خان ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے اور حق کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے پنجاب کا ایک خونخوار گورنر مائیکل اڈوائر جس نے جلیانوالہ باغ میں گولی چلوا کر سینکڑوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا لیکن جب ضبطیوں، قرقیوں اور نظر بندیوں کے باوجود مولانا کی آواز حق کو نہ دبا سکا تو آپ کے متعلق ایک رپورٹ میں لکھتا ہے کہ

"ظفر علی خان اور مولانا محمد علی (جوہر) ماں کے پیٹ سے بغاوت کا قلم لے کر نکلے ہیں انگریز دشمنی ان کی فطرت میں شامل ہے کوئی عام منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرنا لازمی ہے"

سرکاری طور پر اپنے ماتحت حکام کے نام یہ ہدایت جاری کرنے کے علاوہ سر مائیکل اڈوائر نے مولانا کا جو "ہسٹری شیٹ" تیار کیا اس میں لکھا کہ

"پین اسلامزم پر اعتقاد رکھنے والے طبقہ کا ترجمان ایک آتش باز اخبار "زمیندار" ہے جس کا ایڈیٹر ایک آتش مزاج رسوائے عالم ظفر علی خان ہے اس نے ۱۹۱۲ء میں ترکوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا یہ رقم پیش کرنے کے لیے خود قسطنطنیہ گیا ترکی سے واپسی کے بعد اس کا انداز بیان اور سخت ہو گیا کئی بار پریس ایکٹ کے تحت اس کی ضمانت ضبط کی گئی متعدد بار تنبیہہ سے کام لیا گیا مگر زمیندار پھر نکلا انداز بیان پہلے سے زیادہ شوخ اور باغیانہ تھا اسی لیے اس بنا پر اس کی ضمانت کے ساتھ پریس بھی ضبط کر لیا گیا اس نے اسلامی اتحاد کے علمبردار طبقہ سے عرب، ترکی، جرمنی اور افغانستان کے ساتھ سازشیں جاری رکھیں اور مسلمانوں میں بغاوت پھیلانے اور فوجوں میں غدر کرانے کی کوشش کی جب تمام منصوبے ناکام ہو گئے تو ہندوؤں کے ساتھ مل کر

Marfat.com

برطانوی ...... پہنچانے کی سر توڑ کوشش کی چنانچہ ۱۹۱۹ء میں پنجاب اور ۱۹۲۱ء میں موپلوں کی بغاوت اس کی کوششوں کے مظاہرے تھے جنگ کے دنوں میں ظفر علی خان کو اس کے گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا مگر نظر بندی سے رہائی پاتے ہی اس نے پرانی روش پھر اختیار کر لی۔۔ ۱۹۲۰ء میں اسے بغاوت کے الزامات میں پانچ سال قید کی سزا دی گئی"۔

فطری رجحان:۔ ملک میں جن دنوں سیاسی طوفان آیا ہوا تھا اور بڑے بڑے علماء فضلا سخندان اور سخن ور کانگرسی سیلاب میں بہے جا رہے تھے اور اسلام سے دور ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم کانگرس کے عشق میں یہ نعرے لگا رہے تھے کہ

"ہم پہلے کانگریسی ہیں اور پھر مسلمان"

تو مولانا ظفر علی خان نے فوراً یہ نعرہ بلند کیا کہ

"میں سب سے پہلے مسلمان ہوں اور پھر کچھ اور"

یہ تھی قوت ایمانی کہ جوش کے عالم میں بھی ہوش کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔ مولانا کی دوستی اور انگریز دشمنی کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جس دن آپ نے میدانِ صحافت و سیاست میں قدم رکھا تھا چونکہ آپ انگریز کو اسلام کا ازلی دشمن سمجھتے تھے اس لیے آپ اس کے ناپاک قدم اپنے وطن کی سرزمین کو پاک کرنے کے لیے روز اول سے اس کے خلاف صف آراء ہو گئے تھے ان کے لوح و قلم نے پاکستان کی تعمیر کے لیے جتنا کام کیا اس کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہے سرسید احمد خان نے اپنی فکر و بصیرت سے مسلمانوں کو کانگرس سے الگ ہونے کا مشورہ دیا تھا وہ علی گڑھ کے اس فرزند نے بھی قبول کیا قائداعظم اور محمد علی جوہر کی طرح آپ نے بھی کانگرس سے علیحدگی اختیار کی مگر جتنا عرصہ کانگرس کے ساتھ رہے اس میں ایک نئی روح پھونک دی کیونکہ یہ آپ کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جس تحریک میں شامل ہوتے اس کا پورا پورا ساتھ دیتے مسلم لیگ کے بھی آپ بہت کام آئے چونکہ طبعاً انتہا پسند تھے اس لیے کئی بار ان سے قائداعظم اور مولانا حسرت موہانی کا اختلاف پیدا ہوا مگر اسکے باوجود قائداعظم آپ کا احترام کرتے

تھے کیونکہ آپ کی وطن دوستی اور انگریز دشمنی شک و شبہ سے بالا تر تھی اور آپ راہِ حق میں گھر بار لٹانے اور سر کٹانے کے لیے سب سے پیش پیش رہتے تھے اور ہر وقت یہ دہائی دیتے رہتے تھے کہ

تجھے کیا بتاؤں ہم نشین میرے غم کا قصہ طویل ہے
میرے گھر کی لٹ گئی آبرو ہوا جب سے غیر دخیل ہے

جداگانہ تنظیم:۔ مولانا ظفر علی خان ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے اس طرح ہندو پریس نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا رکھا تھا اور مسلمانوں پر الزامات تراشنے سے باز نہ آتے تھے۔ جس نے پنجاب کی فضا مکدر کیا اور جب پورا ملک فرقہ پرستی کی آگ میں جل رہا تھا تو اس وقت مولانا ظفر علی خان نے امرتسر میں خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ہندوؤں کی سازش کا یوں پول کھولا کہ

"یہ اشتعال انگریزیاں ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم کے لیے شروع کی گئی ہیں جداگانہ تنظیم ہی مسلمانوں پر بے اعتمادی کا قطعی ثبوت ہے لوگوں کے جذبات قومی تحریک نے خاصے مشتعل کر رکھے تھے سول نافرمانی کے التواء اور گاندھی جی کی قید کے باعث قومی تحریک کا کام رک گیا ہے برانگیختہ جذبات کسی نئے راستے کے لیے مضطرب تھے جون میں ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم کا غلغلہ بلند ہوا ہندو آسانی سے اس کی رو میں بہہ نکلے اور ہندوؤں کی علیحدگی کی یہ تحریک تیزی سے ترقی کرنے لگی چونکہ اس کی بنیادیں مسلمانوں کے خلاف تعصب و عناد کے جذبات پر موقوف تھی اس لیے اس کی ترقی کے ساتھ ہی ہندو مسلم تصادم کے اسباب بڑھنے لگے"

ہندوؤں کی یہی جداگانہ تنظیم تقسیم کا باعث بنی ہندو کی ہر ٹھوکر مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگاتی رہی اور جب اس نے ایک انگڑائی لی تو سردار پٹیل نے پاکستان قائداعظم کی جھولی میں ڈال کر اطمینان کا سانس لیا۔

Marfat.com

اسلامی بازار:۔ اس جداگانہ تنظیم کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا ظفر علی خان نے ہندو ذہنیت سے تنگ آکر اسلامی بازار کی تحریک شروع کر دی اس کا مقصد مسلمان مسلمان دکاندار سے سودا خریدیں ہندو سے نہ خریدیں جس سے مسلمانوں میں تجارت کا شوق بڑھا اس سے ہندو آپ کے جانی دشمن بن گئے اس کے علاوہ "زمیندار" کی اشاعت بھی بڑھ گئی اور یوں اس اخبار کے ذریعہ مسلم لیگ کا پیغام لوگوں تک پہنچا۔

مولانا ظفر علی خان، اقبال کی نظر میں:۔ "ظفر علی خان غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی تھے ان کی ہمت بہت بلند ہے ان کا قلم اپنی روانی میں دنیا کے بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہیں۔ مذہبی، سیاسی، ادبی لحاظ سے انہوں نے بہت خدمت کی ظفر علی خان نے قدیم وجدید ادبی وجاہت اور مذہب وسیاست کی وحدت سے براہ راست عام مسلمانوں کو خطاب کیا مولانا ظفر علی خان ایک داعی کے لہجے میں اٹھے اور مسلمانوں کے ہیرو بنے رہے۔"

مولانا ظفر علی خان نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں اتحاد ملت (اپنی جماعت) کو مسلم لیگ میں مدغم نہ کیا اور مجلس احرار کی طرح قائداعظم کے پارلیمانی بورڈ میں شامل نہ ہوئے تھے لیکن الیکشن کے بعد مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی میں شامل ہو گئے ۱۹۳۸ء میں مرکزی کونسل میں مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے تقریریں کیں قرارداد لاہور کی حمایت میں اظہار خیال کیا اور تشکیل پاکستان تک ایک مخلص سپاہی کی حیثیت سے قائداعظم کے ساتھ ہر جدوجہد میں شریک ہوئے اور پاکستان بننے کے نو سال بعد انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔

اے۔ کے فضل الحق

۱۸۷۳ تا ۱۹۶۲ء

مولوی اے۔ کے فضل الحق ۲۶ اکتوبر ۱۸۷۳ء میں صوبہ بنگال کے ضلع باریسال کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ان کے والد باریسال میں قانون کی پریکٹس کرتے تھے اور ان کا شمار اچھے قانون دانوں میں ہوتا تھا۔

Marfat.com

والدنے ابتدائی تعلیم پوری طرح اسلامی انداز فکر کے تحت دلائی، اور قرآن پاک، اسلامیات اور عربی فارسی کے مضامین سے اچھی طرح روشناس کرایا کیونکہ وہ جانتے تھے۔

اسلامی تمدن کا خزانہ صرف انہی چیزوں میں پوشیدہ ہے آپ نے چودہ سال کی عمر میں میٹرک کر لیا ڈھاکہ میں گریجوایشن کرنے کے بعد کلکتہ چلے گئے اور وہاں سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی، پھر کلکتہ سے ہی قانون کا امتحان پاس کر کے وہیں وکالت شروع کر دی۔

اے۔ کے فضل الحق چونکہ مذہبی خیالات کے آدمی تھے اور ان کی پرورش بھی مذہبی خطوط پر ہوئی تھی اس لئے انہیں مولوی کہا گیا۔ مولوی کہلانے کے باوجود انہوں نے تادم آخر داڑھی نہیں رکھی تھی ــــ وہ ایک سچے مسلمان تھے اور مخلص محب وطن تھے۔ عملی زندگی میں آ کر انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانان ہند کی حالت زار واقعی ناگفتہ بہ ہے اور پڑھے لکھے اور سوجھ بوجھ رکھنے والے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان مفلس، بے بس، پسماندہ مسلمانوں کو تاریکی کے دھندلکوں سے نکالیں اور اپنے علم و فضل کے نور سے ان کے جادۂ حیات میں روشنی پیدا کریں ــــ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے خود اپنی ذات کو برادران اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

انہیں معلوم تھا کہ دور حاضر میں اشاعت افکار کے لئے پریس کافی مدد معاون ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک رسالہ بالک، کی اشاعت کا آغاز کیا۔ جس میں مذہبی کے ساتھ ساتھ سیاسی احوال پر تبصرے بھی شائع کیا جاتے۔ اس رسالہ کی اشاعت نے انہیں پورے بنگال میں متعارف کرایا۔

اس طرح آزادی کی شمع کی کرنیں مختلف ذرائع سے بنگال میں بھی ضوفشاں ہو رہی تھیں۔ صرف ایسے افراد کی ضرورت تھی جو ان کرنوں کی راہ میں آنے والی کثافتوں کو دور کر سکیں۔ اس کے لئے انہیں پورے بنگال کے احوال پر نگاہ رکھنا پڑی۔

بنگال کے ایک اور مسلم رہنما نواب سلیم اللہ خاں ان دنوں مسلمانان ہند کی آزادی کے لئے کوشاں تھے اور مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں منعقد کرایا۔ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے انہیں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ضرورت تھی جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار بھی ہوں۔ چنانچہ ان کی نگاہ انتخاب میں مولوی فضل الحق آئے۔ چنانچہ اس کانفرنس میں مولوی فضل الحق کو بطور کارکن شامل کر لیا گیا، اور نواب صاحب موصوف نے تمام تر انتظامات کانفرنس انہی کے سپرد کر دیئے۔

Marfat.com

مولوی فضل الحق نے جو پہلے ہی قومی خدمات کے جذبات سے سرشار تھے۔ نہایت شوق وانہماک سے اس میں حصہ لیا۔ یہی وہ اجلاس تھا جس میں مسلم لیگ کے قیام کے لئے ایک منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو چار رکنی کمیٹی بنائی گئی تھی مولوی اے کے فضل الحق کو اس کمیٹی کا ایک رکن بنایا گیا۔

مولوی فضل الحق کو سرکاری حلقوں میں بھی کافی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ انہیں ڈھاکہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اور بعد ازاں ترقی دے کر انہیں اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز بنا دیا گیا۔ لیکن انتظامیہ کی بدنظمی اور ہندو نوازی کے آثار دیکھتے ہوئے وہ سرکاری ملازمت سے بیزار ہو گئے۔ چنانچہ اس بے زاری کی بنا پر انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کلکتہ میں دوبارہ وکالت شروع کر دی۔ وہ پہلے تو صرف مسلمانوں کی آزادی کے حق میں تھے اب وہ انگریز اور ہندو کی ملی بھگت کی بنا پر حکومت سے بھی سخت متنفر ہو گئے۔

مولوی صاحب نے ۱۹۱۳ء میں بنگال کی صوبائی کونسل کے رکن کے انتخابات میں ایک بااثر، اور متعصب ہندو لیڈر مہندر ناتھ مترا کو زبردست شکست دی۔ اس وقت مولوی صاحب نے ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے مقابلہ کیا تھا۔ اسی سال وہ بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے جبکہ نواب سلیم اللہ خاں خود اس کے صدر بنے تھے۔

۱۹۱۴ء میں انہوں نے ایک تحریک کا آغاز کیا جس کا نام "کسان تحریک" تھا۔ اس تحریک کا بنگالی نام "کرشک پرجا سمیتی" رکھا گیا۔ یہ جماعت بعد ازاں سیاست کے میدان میں نمایاں کامیابی کے ساتھ اتر آئی۔ ۱۹۱۴ء میں مولوی صاحب کی زیر صدارت ڈھاکہ میں بنگال پریذیڈنسی مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس میں تنسیخ بنگال کو سخت الفاظ میں کوسا گیا، اور ساتھ ہی یہ مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جو اجلاس قائداعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت ہوا۔ اس میں مولوی فضل الحق نے بنگال کی نمائندگی کی۔ اسی سال کلکتہ میں انہوں نے مسلمان طلباء کی امداد کی غرض سے ایک ہوسٹل تعمیر کرایا۔

بعد میں وہ متحدہ بنگال کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے تو انہوں نے حکم جاری کیا۔ محکمہ تعلیم میں سنسکرت کے ساتھ ساتھ عربی فارسی کی تعلیم کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔ اور اس مقصد کے لئے مسلمان اساتذہ کافی تعداد میں ملازم رکھے جائیں۔ ہندوؤں نے مسلمان طلباء کو، سیاسی غرض سے استعمال کرنے کے لئے انہیں تحریک عدم تعاون میں دھکیلنے کی کوشش کی، لیکن مولوی

Marfat.com

فضل الحق کی بروقت مداخلت سے ہندوؤں کی یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی اور انہوں نے طلباء کو صرف حصول علم کی طرف رہنے کی کامیاب تلقین کی مسلمانوں کے حق میں بہت سے قوانین پاس کرائے۔

۱۹۳۰ء میں مولوی فضل الحق نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں یہ بات واضح کر دی کہ مسلمانوں کے بارے میں یہ تصور کہ وہ دور جدید میں حکومت چلانے کے اہل نہیں بے بنیاد ہے، حالانکہ حکومت مسلمانوں کی سرشت میں شامل ہے اور دنیا کے مختلف کونوں میں یہ قوم حکمرانی کرتی رہی ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ہندوستان کے مشترکہ مفادات کا تحفظ کیا جائے۔

۱۹۳۷ء میں وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں پٹوا کھلی سے بنگال اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے اور اسی سال بنگال کے وزیر اعلیٰ چنے گئے ان کی وزارت چھ سال تک بنگال میں قائم رہی۔

یہ ۶ سال کا عرصۂ وزارت بنگال کے مسلمانوں کی تعمیر نو کا ایک بہترین دور قرار دیا جاتا ہے کیونکہ ان ۶ سالوں میں شیر بنگال نے مسلمانوں کے مفادات کا نہ صرف احسن انداز میں تحفظ کیا، بلکہ خصوصی توجہ کے ذریعے مسلمانوں کو مختلف میدانوں اور حلقوں میں کامیاب کرایا۔ ان کے سیاسی معاشی تعلیمی اور سماجی پسماندگی کو دُور کیا۔ یہی وہ دور تھا، جب بنگال کے مسلمانوں کو سکھ کا سانس نصیب ہوا تھا — اور اسی دور میں مسلمان اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے مواد اکٹھا کر سکتے تھے۔

مولوی صاحب کے اس رویے سے ہندوستان میں دوسرے صوبوں میں جہاں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئی تھیں، تعصب کی آگ لگ گئی۔ اور ہندوؤں نے طرح طرح کی پابندیاں اور سختیاں عاید کر دیں جس کا نتیجہ ہندو مسلم کشیدگی کی صورت میں رونما ہوا، جو بعد ازاں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات کی شکل میں نمایاں ہوا۔

اب مولوی فضل حق پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ ہندو مسلمان کے ساتھ مل کر کبھی نہیں رہ سکتا چنانچہ ۲۳ فروری ۱۹۴۰ء کو انہوں نے ڈھاکہ میں ایک کانفرنس طلب کی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ ماہ یعنی مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس طلب کیا جائیگا۔ جہاں باقاعدہ طور پر ایک علیحدہ اسلامی سلطنت کی مانگ کی قرارداد پاس کی جائے۔ اس اسلامی سلطنت میں ملک کی مسلم اکثریت والا شمال مغربی حصہ (جس میں صوبہ پنجاب۔ صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ شامل ہے۔ مسلم اکثریت والا مشرقی حصہ (جس میں بنگال اور آسام شامل ہیں، شامل ہونا چاہیئے۔

Marfat.com

چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو یہ تاریخی جلسہ لاہور میں انعقاد پذیر ہوا، اور بھاری اکثریت سے یہ قرارداد منظور ہو گئی۔ اس قرارداد کو " قرارداد لاہور" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور قرارداد پاکستان کے نام سے بھی ـــ قرارداد لاہور ہی ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس طرح انہوں نے قائداعظم کے ساتھ دوش بدوش چل کر اور مخالفین کی مخالفت کے باوجود اور سبز باغ کے لالچ کے دکھاوے کے باوجود جادۂ منزل کی طرف پر عزم اور مستقل مزاجی سے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں اس حسین سلطنت کے حصول کے خواب کی تعبیر مادی صورت میں دیکھ لی جبکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان واقعی معرض وجود میں آ گیا۔

پاکستان بنتے ہی وہ مشرقی پاکستان کے پہلے ایڈووکیٹ جنرل مقرر کئے گئے۔ بعدازاں انہیں مشرقی پاکستان کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ اس وقت وہ متحدہ محاذ کی طرف سے اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے تھے بعدازاں انہیں مرکزی حکومت میں وزارت داخلہ کا قلمدان سپرد کیا گیا پھر مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا گیا۔

ضعیف العمری کی وجہ سے ان کے قویٰ اب اتنے مضبوط نہ رہے تھے کہ وہ زیادہ کام کر سکیں اور بالخصوص ایسے فرائض منصبی ادا کر سکیں جن کا تعلق زیادہ تر دوڑ دھوپ سے ہو۔ بالآخر ۲۷ اپریل ۱۹۶۲ء کو تقریباً اسی سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ ان کا شمار پاکستان کے چند گنے چنے معماروں میں ہوتا ہے

سر آغا خان

۱۸۷۷ء تا ۱۹۵۷ء

آغا خاں کا اصل نام سلطان محمد شاہ تھا۔ ان کا نسلی تعلق مصر کے فاطمی خلفاء کے ساتھ تھا، اور وہ اسمعلیہ فرقے کے وقتی امام تھے اور نسباً ان کا شجرہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور منصب امامت ان کو مل گیا۔

۱۹۳۸ء میں ان کی والدہ ماجدہ بھی انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔

آغا خاں چونکہ ایک اسلامی فرقے کے سربراہ تھے، اس لئے دینی علوم میں مکمل طور پر واقف ہونے کے لئے علوم دینیات، ادبیات اور فلسفہ میں بالخصوص مہارت حاصل کی اور ذوق سلیم پایا تھا ـــ اس لطافت کی بنا پر شعر گوئی کا بھی شغف تھا۔ سخن سنج ہونے کے ساتھ ساتھ، سخن پرور بھی تھے۔ اسلامی ثقافت کی ترویج اور اسلامی عقاید کی تعلیم کی طرف وہ خصوصی طور پر توجہ

Marfat.com

دیتے تھے۔ دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کو ان کی ضرورت پڑی وہ بھاگ کر مخلصانہ انداز میں لبیک کہتے۔ چنانچہ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں انہوں نے مسلمانوں کی جو خدمات سر انجام دی ہیں ان کا احسان چکایا نہیں جا سکتا۔

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے مالی امداد بھی دی۔ ان کی زیادہ تر توجہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف تھی۔ ہندوستان کے مسلمان باشندوں کو ہندو ہتھکنڈوں سے بچانے اور انگریزی مکاری کے جال سے نکالنے کے سلسلے میں خود سیاست کے میدان میں اتر آئے اور نہایت بے باکی سے مسلم لیگ میں شامل ہو کر تشکیل پاکستان کی راہ ہموار کی۔

۲۵ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۹۲ء میں وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن نامزد ہوئے۔ اس وقت لارڈ کرزن فرنگی حکمران تھا۔ اتنی کم عمری میں کسی شخص کے اس منصب پر پہنچنے کی پیشتر ازاں کوئی مثال نہیں ملتی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی انہوں نے کئی بار صدارت کی اور علی گڑھ کالج کی ترقی کے لیے عملی اور مالی طور پر امداد کی۔ سر سید احمد خاں کو ذاتی طور پر پسند کرتے تھے۔ اور ان کی کوششوں کے مداح تھے۔ جس کی بنا پر انہیں ملک بھر میں ایک کامیاب تعلیمی ادارہ مل گیا، سر سید کے خلوص اور بلند ہمت ہونے کی داد دیتے تھے۔ چنانچہ ان کی حوصلہ افزائی کے لئے آغا خاں نے چندہ حاصل کرنے کے لئے سر سید کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ندوہ کے دار العلوم کے لئے انہوں نے پانچ سو روپے سالانہ کی ذاتی گرانٹ منظور کی اور علی گڑھ کالج کے لئے تقریباً ۳۰ لاکھ روپیہ جمع کیا۔ چندہ جمع کرنے کے لئے انہوں نے پورے ملک کا دورہ کیا، جب وہ لاہور پہنچے تو ان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔

مسلم مفادات کے تحفظ اور ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی آزادی کے سلسلے میں ۱۹۰۶ء میں انگریز وائسرائے نے شملہ میں جس مسلمان وفد سے ملاقات کی اس کے سربراہ سر آغا خاں بھی تھے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو جب آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ تو اس وقت سب سے پہلے صدارت کا منصب سر آغا خاں کو سونپا گیا۔ وہ چھ سال تک مسلم لیگ کی صدارت کے منصب پر فائز رہے اور اس مسلمان سیاسی جماعت کی توسیع کے لئے پورے اجتہاد کے ساتھ کوشاں رہے۔

تحریک خلافت میں سر آغا خاں علی برادران کے ہم نوا رہے کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ انگریز کی اندرونی پالیسی یہی ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں انہیں ہزیمت دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے نہایت مدبرانہ انداز میں اس مسئلے سے نپٹنے کی کامیاب کوشش کی۔ تحریک خلافت اگرچہ ناکام ہو گئی لیکن انگریز کا تکبر خاک میں مل گیا۔ اور اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ مسلمان محکوم ہی کیوں نہ ہوں وہ اپنے مسلمان بھائیوں

Marfat.com

کی امداد کی خاطر جان و مال کی بازی لگانے سے گریز نہیں کرتے یہاں تک کہ انہیں ترک وطن کرنا پڑے تو اس سے بھی نہیں چوکتے۔

سر آغا خاں ایک وفد لے کر انگلستان روانہ ہوئے اور وہاں برطانوی وزیر اعظم سر لائیڈ جارج سے ملے۔ اس ملاقات کے دوران اس وفد کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے انگلستان کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ یونانیوں نے ترکی کے علاقوں یعنی سمرنا اور تھریس پر جو قبضہ کر لیا ہے۔ وہ بالکل ناجائز ہے۔ ان علاقوں کو جلد از جلد ترکی کو لوٹا دینا چاہیئے۔ لیکن متعصب اور بدنیت وزیر اعظم نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اب اس معاملہ میں برطانوی حکومت کیا کر سکتی ہے۔ اس پر سر آغا خاں اس وزیر اعظم پر برہم ہو گئے۔ لیکن وہ پلید ضمیر شخص اپنی کوتاہیوں اور بدنیتوں کی بنا پر یہی کہتا رہا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں انگلستان میں جو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں قائد اعظم محمد علی جناح کے ہمراہ لندن تشریف لے گئے اور مسلمانوں کے مطالبے کو پرزور انداز میں پیش کیا۔

۱۹۳۲ء میں لیگ آف نیشنز (جو اقوام متحدہ کے قیام سے پہلے بین الاقوامی متحدہ جماعت تھی) کے صدر نامزد ہوئے۔ وہ سب سے پہلے ایشیائی تھے۔ جنہیں اس منصب پر فائز کیا گیا تھا۔

تشکیل پاکستان کے لئے سر آغا خاں نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا اور جس محنت اور ہمت سے کام کیا اس کی مثال صرف چند ایک افراد میں ملتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لئے وہ عوام کی زبان بن کر حکام کے پاس جاتے اور مسلمانان ہند کی دلی آواز ان کے کانوں تک پہنچاتے۔ انہیں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی تشکیل کی سب سے زیادہ تمنا تھی۔ چنانچہ ان کی پرخلوص کوششوں کا ثمرہ انہیں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مل گیا جب پاکستان وجود میں آ گیا۔

سر آغا خاں قائد اعظم محمد علی جناح پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے اور انہیں ایک سیاسی جماعت کا سب سے زیادہ اہل لیڈر تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے قائد اعظم کے میدان عمل میں نکل آنے کے بعد خود ان کے پیچھے ہو لئے۔ اور وقتاً فوقتاً انہیں اپنی صائب آراء سے مستفیض کرتے رہے جہاں تک مالی امداد کا تعلق ہے سر آغا خاں خود بھی اور دوسرے افراد سے بھی چندہ لے کر مسلم لیگ کی مالیاتی پوزیشن مستحکم کرتے رہے۔ چنانچہ یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں سر آغا خاں کی شخصیت ایک پورے باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ایسے باب کی حیثیت جس کے بغیر کتاب نامکمل رہ جاتی ہے۔

Marfat.com

سر آغا خان ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء میں بمقام جنیوا دل کی حرکت بند ہو جانے کی بنا پر فوت ہو گئے۔ ان کا نام تاریخ ہند و پاکستان میں ہمیشہ ہمیشہ روشن رہے گا۔

ضمیمہ: تحریکِ پاکستان اور علماء

سوال: تحریک پاکستان میں مذہبی علماء نے جو جو کردار ادا کیا، اس کی تصویر کشی کیجئے؟

مسلم قوم کے افراد مذہبی طور پر بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔ کسی بھی تحریک کو زور دار اور منوع بنانا مقصود ہو تو مذہبی علماء کی آراء کا خیر مقدم کیجئے اور تحریک کا پھیلاؤ وسیع تر ہو جائے گا۔ اگر کسی تحریک کے بارے میں علماء کی آراء باہمی نزاع و اختلاف کا شکار ہو جائیں تو پھر منیجہ کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ تحریک پاکستان کو بھی موافق و مخالف دونوں قسم کے علمائے دین سے سابقہ پڑا۔ مخالف آراء کا ایک سیل تند تھا جو بڑھا آ رہا تھا مگر تائید ایزدی کے سبب کچھ ایسے علماء بھی آگے آئے جو مخالفین کے ان اعتراضات و اتہامات کا مسکت جواب دینے لگ گئے۔ جو کانگرس علماء مسلم لیگ، نظریہ پاکستان یا قائد اعظم کی ذات پر لگاتے تھے۔ جہاں تک مخالف مذہبی رہنماؤں کا تعلق ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل علمائے دین نظریہ پاکستان پر آخری دفت تک حملے کرتے رہے اور کبھی بھی تحریک پاکستان کے کارکنوں کی کوششوں کو نہ سراہا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمن، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید ابوالاعلےٰ مودودی، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی۔

جن حضرات نے علمائے دین ہونے کے ناطے تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کی سعی کی ان میں سرفہرست ان لوگوں کا نام آتا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد طاہر قاسمی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا غلام مرشد خطیب جامع عالمگیری اور مولانا اشرف علی تھانوی۔

اب ہم تحریک پاکستان کے مخالف اور موافق علمائے دین کا مختصر تذکرہ کریں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد: مولانا موصوف کانگرس کے نامور راہنما اور گاندھی کا بہت بڑا سہارا تھے۔ مولانا امام الہند مانے جاتے تھے مگر افسوس کہ انہوں نے قرآن و حدیث کا لبادہ اوڑھ کر ایسے ایسے فتاویٰ و آراء پیش کیں کہ الامان والحفیظ۔ مولانا موصوف کو قائد اعظم سے ازلی اختلاف تھا۔ مسلمان قومیت کو رد کر کے متحدہ قومیت کا بیج بونے والوں میں موصوف کا زبردست حصہ ہے۔

Marfat.com

مولانا کے تمام فرمودات وخطبات پڑھ جایئے۔ مگر آپ کو دور الہلال کے آزاد اور کانگرسی راہنما اور متحدہ قومیت کے داعی کی حیثیت سے سامنے آنے والے آزاد میں زمین وآسمان کا فرق ملے گا۔ یہ تضاد مولانا کی کتابوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ بقول چوہدری حبیب احمد کے۔

"۔۔۔۔۔۔ نیشنلسٹ علماء کے اس سرخیل نے آب کوثر سے پھسل کر لب گنگا پہنچنے کو معراج زیست قرار دے لیا اور انجام کار اس بھٹکے ہوئے راہی نے اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم صفحہ ۲۲۷ میں کس طرح اسلام سے مایوسی وبے زاری کا کھلا اعلان کر کے دنیا پر آشکار کر دیا کہ وہ صحیح معنوں میں اسلامی نظریہ حیات سے منحرف اور منکر ہو چکے تھے۔۔۔۔۔" [۱]

ذرا دورِ الہلال کی ایک جھلک دیکھئے۔

"اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل واعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہ نما بنائے وہ مسلم نہیں۔ بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لیے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہے کہ اس کے پیرودں کو اپنے پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرانگیز سوال نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے سامنے کھڑی ہو جائے ان کا خود اپنا راستہ موجود ہے راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے۔۔۔۔ دروازوں پر بھٹکتے پھریں۔ خدا ان کو سربلند کرنا ہے وہ کیوں اپنے سر کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی عزت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں صفحہ ۲۱

مگر دور متحدہ قومیت میں یہی جھلک اندوھناک بن جاتی ہے۔

"مسلمانوں کو اپنے "حقوق" کے تحفظات کے لیے گورنمنٹ برطانیہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے۔۔۔۔ ۔۔۔ان سے بدگمان نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ جوق درجوق کانگرس میں شریک ہو جانا چاہیئے۔ کانگرس کے ہاتھوں میں ان کے حقوق بالکل محفوظ ہیں۔" (اسٹیٹسمین ۲/۴ ۱۹)

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں۔

"جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں (ہندو اور مسلمان) دو جداگانہ اقوام ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے میں اس باب میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ (اسٹیٹسمین ۲/۵ ۱۹)

Marfat.com

مولانا کے تضادات کا سلسلہ طویل ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا سے مہاتما گاندھی نے جو چاہا کروا لیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اُن کی اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" ہے جو مولانا کی آخری کتاب ہے۔ اور انگریزی میں ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے لکھا ہے۔

"یہ کہنا کہ مذہبی ہم آہنگی ان علاقوں کو جو جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور تمدنی طور پر مختلف ہیں متحد کر سکتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ سب سے بڑا فریب ہے، یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی کوشش کی جو نسلی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی حدود سے بالا تر ہو لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ پہلے چند قرنوں یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد اسلام صرف اسلام کی بناء پر تمام مسلم ممالک کو ایک اسٹیٹ میں منسلک کرنے میں ناکام رہا۔

"گویا مولانا موصوف نے اسلام کو دیمک کھائی ہوئی لکڑی سے زیادہ نہ گردانا۔ گاندھی کو رہنمائے اول قرار دے کر ان کے عقائد کی بھرپور تبلیغ کی۔ مولانا ہی کے بقول:۔

"مہاتما گاندھی کی راہنمائی پر اعتماد یہی ایک تنہا راہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا اور اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں" حالانکہ قرآنی فیصلہ ہے۔ کہ قُل ان الھدیٰ اللہ (کہدے کہ راہنمائی صرف ایک ہے اور وہ اللہ کی راہ نمائی ہے۔)

مولانا نے تحریک پاکستان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو کر صرف نظریہ پاکستان ہی کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اسلام کو بھی نقصان پہنچایا اور اپنے نظریات کی تعریف کے لیے تفسیر القرآن لکھی جس میں قرآنی الفاظ کو من مانی تعبیرات کے سانچے میں ڈھالنے سے مولانا نے بعض سے کام نہیں لیا۔

مولانا حسین احمد مدنی: شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی صاحب بھی ابو الکلام آزاد کے شانہ بشانہ تحریک پاکستان کے مخالف رہے۔ انہوں نے نہ صرف ابو الکلام صاحب کی ہمنوائی میں متحدہ قومیت کا قرآن و حدیث کی روشنی میں جواز تلاش کیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ موجودہ دور میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ ایسے ہی موقع پر علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ!
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی!
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

Marfat.com

اس سلسلہ میں حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی وُہ بھی قابلِ غور ہے۔ اگرچہ مولانا نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر متحدہ قومیت کا بیج بویا مگر اپنے مقصد میں برتری نہ ہوئی۔ ان علماء کو مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے مسکت و مدلل دلائل سے پڑ کیا (تفصیل مولانا شبیر احمد عثمانی کے ضمن میں آئے گی)

آزاد، حسین احمد مدنی کا متحدہ قومیت کا فلسفہ اس نوعیت کا تھا کہ اگر اُسے تسلیم کر لیا جائے تو "دو قومی نظریہ" کی نفی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ دو قومی نظریہ ہی پاکستان کے قیام کی وجہ اولین ہے۔

احراری حضرات:- جہاں تک احراری حضرات کا تعلق ہے وہ بھی تحریکِ پاکستان کے مخالف رہے ہے۔ جماعت احرار نے قائدِ اعظم کو کافر قرار دینے کے لیے اشتہار در دیوار پر چسپاں کیے۔ احراری حضرات کے بیانات بھی قیام پاکستان کے خلاف ایک طوفان بلا خیز برپا کیے رہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے ہیں۔

پاکستان کے بارے میں پورے تین مہینے تک پنجاب میں، میں نے جس جگہ بھی تقریریں کی ہیں پاکستان کو ہندوستان کے لیے مہلک بلکہ ہلاکت آفریں اور ہلاکت خیز بتایا ہے اور دلائل سے یہ باتیں ثابت کیں ہیں۔ میری سمجھ میں پاکستان کے حق میں کوئی دلیل بھی تو نہیں آتی ۔۔۔۔"

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کہتے ہیں۔

"میری سمجھ میں اگر پاکستان آ بھی جائے تو میں فوراً لیگ میں چلا جاؤں لیکن میں پاکستان قبول کرنے میں مسلمانانِ ہند کی ذلت آمیز موت دیکھ رہا ہوں۔"

مولانا مظہر علی اظہر احراری فرماتے ہیں۔

"میری رائے میں جب تک ہندوستان کی اینٹی لیگ جماعتوں کی کسی آئینی تجویز کو کانگرس ورکنگ کمیٹی منظور نہ کرے اسی وقت تک تجویز کی نشر و اشاعت بے معنی چیز ہے۔

ان آرا سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ احراری حضرات پاکستان کے خلاف تھے۔

منسقین تحریکِ پاکستان:- ان مخالفین کے دلائل و براہین کو کسی نہ کسی تیغ دو دم کی ضرورت تھی جو ان سب دلائل و براہین کو یک دم قطع کر کے رکھ دے اللہ تعالٰی نے کانگرس اور دیگر مخالفین اور شیخ الہند و امام الہند کے سراب آسا فرمودات و فریب انگیں خطبات کے پیدا کیے ہوئے سحر زدہ کو توڑنے والے بھی پیدا کر دیے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام اس سلسلہ میں سرفہرست نظر آتا ہے۔

Marfat.com

مسلم لیگ کے حامی علماء

برعظم کی سیاست میں علماء کے حصہ لینے کی روایت کافی قدیم ہے حضرت مجدد الف ثانی سے لے کر ان علماء تک جنہوں نے کثیر تعداد میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ ایک مستقل اور راسخ فکر کارفرما رہی ہے۔ اس دور میں علماء کی سیاسی جدوجہد اس مقصد کیلئے مخصوص رہی ہے۔ کہ ہر قسم کے شرک اور غیر اللہ کی غلامی سے مسلمانوں کو نجات دلائی جائے تاکہ یہ ملک مکمل طور پر بہ کلیتہً نہیں تو ایک حد تک دارالسلام یا وہ جگہ بن جائے جہاں مسلمانوں کو کلی طور پر فکر و عمل کی آزادی ہو، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہی ان مجاہدین علماء کے جذبات کو نہ دبا سکی اس طرح علماء نے وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی خدمت اگرچہ کچھ علماء نے مسلمانوں کے مطالبات و خواہشات کے برعکس مسلم قومیت کے متضاد کام کیا لیکن ایسے علماء کی بھی کافی تعداد تحریک پاکستان میں نظر آتی ہے۔ جنہوں نے قائداعظم کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کی خدمت کی یا دوسرے معنوں میں مسلم قومیت کو جلا بخشے اور ان کے جداگانہ قومی تشخص کو پروان چڑھانے میں قائداعظم کی مدد کی ان علماء میں (جو کہ مسلم لیگ کے حامی تھے) مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد عثمانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان علماء کی وجہ سے پورے برصغیر میں علماء کی ایک بڑی جماعت کا تعاون مسلم لیگ کو حاصل ہوا۔ تحریک پاکستان میں اور مسلم لیگ کا ساتھ دینے میں ان علماء کا فرداً فرداً ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی:۔ برصغیر میں علماء کئی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ علما کانگرس کے ساتھ تھے۔ اور کچھ مسلم لیگ کے کچھ متحدہ ہندوستان کی بات کرتے تھے، تو کچھ مسلمانوں کی الگ ریاست کی اس طرح علماء کا وہ گروہ جو تحریک پاکستان میں شامل ہو کر نظریۂ پاکستان کی حمایت اور مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک عمل کر رہا تھا۔ اس میں متعدد نمایاں اور ممتاز افراد شامل تھے۔ جن کی رہنمائی اور سرکردگی مولانا اشرف علی تھانوی کر رہے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی علماء دیوبند میں ایک عالم اور صوفی کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ سیاسی نقطہ نظر کے مطابق وہ ہمیشہ دو قومی نظریہ کی ترویج کرتے رہے۔ اور اس اعتبار سے انہیں کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت پسند نہ تھی، وہ کانگرس میں مسلمانوں

Marfat.com

کی شرکت کو ان کی دینی موت کے مترادف سمجھتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ہندو اور مسلم کبھی بھی متحد نہیں ہو سکتے اسی لیے انہوں نے تحریک خلافت میں اور تحریک عدم تعاون میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی شرکت کی مخالفت کی تھی، اس مخالفت کو باضابطہ شکل دینے کے لیے انہوں ایک فتویٰ بھی جاری کیا تھا۔

کہ تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی اگر ہندوؤں کے اشتراک سے کی جائے تو مسلمانوں کی مذہبی اور اقتصادی زندگی کے لیے نقصان دہ ہو گی۔ اور ان میں مسلمانوں کی شرکت شرعاً حرام و ناجائز ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندو قائدین کے پیچھے چلیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہندو کبھی بھی مسلمانوں سے مخلص نہیں ہو سکتے۔

ہندو سیاست کی مخالفت اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے عقائد اور نظریات کی وجہ سے ان کے تعلقات "جمعیتہ العلمائے ہند" اور علمائے دیوبند کے ایک طبقے سے بہتر نہ رہ سکے اس لیے انہوں نے نہ صرف اس کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا بلکہ دیوبند سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ جس سے وہ ایک طویل عرصے سے وابستہ تھا، وہ ایک حساس اور باخبر عالم تھے جنہیں اس وقت مسلمانوں کے زوال اور ان کے مصائب کا مکمل احساس اور شعور تھا۔

مسلمانوں کے آئینی اور دینی مفادات کی خاطر ان کی جدوجہد بھی ان کے ملی شعور اور قومی احساسات پر مبنی تھی۔ مسلمانوں کے دستوری معاملات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرانے کے لیے عدالتوں میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کی ۱۹۳۸ء میں کانگرسی حکومتوں کے زیر اثر جب بعض صوبوں میں دینی مدارس بند کیے جانے لگے تو ان کی بحالی کی بھرپور اور کامیاب تحریک بھی مولانا تھانوی کی کوشش کا نتیجہ تھی انہوں نے سیاسی تحریکوں میں خود کبھی عملی طور پر حصہ نہ لیا۔ لیکن علماء کی ایک ایسی جماعت کی تربیت کی جس نے آگے چل کر تحریک پاکستان میں بھرپور اور سرگرم حصہ لیا۔ وہ خود ہمیشہ ایک الگ مسلم ریاست کے لیے دعاگو رہے۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم اور قائداعظم کو سچا اور پکا مسلمان سمجھتے تھے اور ان کی لیاقت اور صلاحیت کے قائل تھے۔ وہ اس وقت کے حالات میں مسلمانوں کی تنظیم اور قوت کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان لیگ میں شامل ہو کر اپنی تنظیم اور لیگ کی قوت اور اصلاح کی کوشش کریں۔

Marfat.com

مولانا اشرف علی تھانوی نے نہ صرف پاکستان کی بھرپور تائید کی بلکہ وہ اسے مسلمانوں کی حیاتِ ملی کے لیے ضروری بھی سمجھتے تھے، انہوں نے ۱۹۳۸ء میں ہی اس وقت جب کہ ابھی قرارداد پاکستان بھی منظور نہ ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کی پیشگوئی کر دی تھی، ان کی اس بشارت سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ قیام پاکستان ان کے احساسات سے کس قدر قریب تھا۔ اگرچہ قیام پاکستان کے وقت وہ خود موجود نہ رہے۔ لیکن ان کے زیر تربیت علماء نے ان کے دیئے ہوئے سبق پر عمل کرتے ہوئے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہر طریقے سے مسلم لیگ اور قائداعظم کی مدد کی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی:- مولانا شبیر احمد عثمانی ایک عالم باعمل تھے جنہوں نے اپنی شخصیت کی تعمیر میں ایسے مقتدر علماء سے اثرات قبول کیے تھے۔ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جد وجہد میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ اور دیوبند میں ایک ایسے ادارے کی تشکیل کی تھی جس کا ایک بڑا مقصد مسلمان طلباء کی سیاسی تربیت بھی تھا۔ مولانا اپنی قابلیت اور اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے بہت ایک اہم شخصیت بن گئے تھے شروع میں انہوں نے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ہندوؤں کے ساتھ مناظرے کیے جنگ بلقان کے دوران ترکی کے ہلال احمر کے لیے چندہ جمع کیا اور تحریک خلافت کے کے سرگرم کارکن بنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو وقتی اور مصنوعی اتحاد پیدا ہوا تھا۔ اسے تقویت پہنچانے کے لیے رواداری کے طور پر مسلمانوں میں گائے کی قربانی کو ترک کرنے کی تجویز پیش ہوئی تو مولانا شبیر احمد عثمانی نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور اس طرح یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے دب گیا۔

تحریک خلافت کی ابتداء میں جب علماء کی ایک جماعت "جمعیت علمائے ہند" قائم ہوئی تو مولانا شبیر احمد عثمانی بھی اس کے رکن منتخب ہوئے اور اس کے کاموں میں شرکت کی، لیکن صرف اس وقت تک جب تک یہ جمعیت کانگریس کے زیر اثر اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی منکر نہ ہوئی تھی۔ وہ ہندو سیاست کے رویے سے بالکل واقف تھے اور وہ اسی لیے ہندو مسلم اتحاد کے خلاف تھے وہ کسی ایسی تحریک یا جماعت کو بھی پسند فرماتے تھے۔ جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل ہوں، مولانا عثمانی کانگرس اور اس کے نظریات کے بھی شدید مخالف تھے۔ انہیں یہ بات پسند نہ تھی کہ جمعیت کانگرس

Marfat.com

کی ہمنوا بنے اسی بنا پر انہوں نے جمعیت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ لیکن جب جمعیت کے سرکردہ علماء نے کانگرس کی شہ پر متحدہ قومیت کا پرچار شروع کیا اور مستقل تحریروں کے ذریعے اسے "جمعیۃ العلمائے ہند" کا سرکاری موقف قرار دیا تو اس سے بحث کا جو ہمہ گیر سلسلہ شروع ہو گیا اس میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی بھرپور حصہ لیا اور متحدہ قومیت کے نظریے کو سختی سے رد کیا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے جب مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کیا اور پاکستان کی تحریک کو پھیلایا تو کانگرس کے زیر اثر علماء نے بڑی شدت کے ساتھ پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔ مسلم لیگ کے لیے یہ بڑا نازک موقع تھا کہ اگر اس کا موثر سدباب نہ کیا جاتا تو اس کی تحریک اور عام مسلمانوں کی دیرینہ خواہش ختم ہو کر رہ جاتی اور مسلمانوں کا قومی وجود ہندو قومیت میں ضم ہو جاتا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ان علماء میں سے تھے۔ جنہوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ ان حالات میں مولانا نے پھر عملی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ایسے علماء کو متحد کرنے کی کوشش کی جو دو قومی نظریے کے حامی تھے۔ چنانچہ مولانا اپنے اس مشن میں کامیاب ہو گئے اور اپنی کوششوں سے ایک جمعیت "جمعیت العلمائے اسلام" کے نام سے تشکیل کی اس جماعت کا قیام علماء کی بہت بڑی جماعت نے مل کر کیا تھا اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس کا صدر منتخب کیا تھا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے "جمعیت العلمائے السلام" کی مدد سے تحریک پاکستان کی حمایت شروع کی اور پاکستان کے مخالفوں کے اعتراضات کے مدلل جواب دیے۔ تقسیم ہند کے منصوبے میں پاکستان کے وجود کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک شرط یہ بھی لگائی گئی تھی، کہ صوبہ سرحد اور سلہٹ صرف اسی وقت پاکستان میں شامل ہوں گے۔ جب وہ رائے شماری کے ذریعے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ ظاہر کر دیں گے ان علاقوں میں کانگرس کا بڑا اثر تھا اسی دوران مولانا عثمانی نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے نظریۂ پاکستان کی مفصل وضاحت کی اور اس کے حصول اور آنے والے انتخابات کی اہمیت بتائی کہ وہ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے کس قدر فیصلہ کن اور اہم ہیں۔ قائداعظم مولانا شبیر احمد عثمانی سے بہت متاثر تھے، اور وہ ان کے اثرات کو بھی جانتے تھے۔ اسی لیے صوبہ سرحد میں جہاں کانگرس نواز مسلمانوں کا بڑا اثر تھا مسلمانوں کو

Marfat.com

ہم خیال بنانے کے لیے اور رائے شماری میں پاکستان کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے قائداعظم نے انہیں صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی چنانچہ اس وقت سے لے کر قرارداد مقاصد کی منظوری تک مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور اپنی کوششوں سے تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اور بعد میں بھی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور جداگانہ قومی تشخص کو برقرار رکھنے کی کوششوں میں سرفہرست رہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی:۔ مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقہ فیض سے وابستہ تھے، سیاسی مسلک کے لحاظ سے بھی اسی طرز فکر کے حامل تھے، جس پر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کاربند تھے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور دو قومی نظریے پر مکمل یقین رکھتے تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے اتحاد کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی "جمعیت العلمائے اسلام" کے نائب صدر منتخب ہوئے اور انہوں نے اس کے پلیٹ فارم سے مسلم لیگ کی حمایت کی اور ایک قرارداد میں رائے شماری میں مسلم لیگ کا ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا

مولانا ظفر احمد عثمانی نے مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کی خواہش پر دوسرے علماء کے ساتھ مل کر رائے شماری میں مسلم لیگ کے موقف کی کامیابی کے لیے سرگرم عمل رہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے تقریباً چار ماہ تک مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور پاکستان کے لیے رائے عامہ کو مزید ہموار کرنے کی کوشش کی اس مقصد کے لیے ایک موقعہ پر انہوں نے لیگ کی حمایت اور کانگرس اور اس کے معاونین کے خلاف ایک فتویٰ بھی جاری کیا۔ رائے شماری میں پاکستان کے موقف کی کامیابی کے لیے انہوں نے سلہٹ کے علاقے کو اپنی تبلیغی جدوجہد کے لیے منتخب کیا جہاں پر کانگرس نواز علماء کا بڑا اثر تھا۔ یہ ایک دشوار گذار مرحلہ تھا۔ لیکن مولانا ظفر احمد عثمانی کی مستقل جانفشانی اور تبلیغی کوششوں کے طفیل پاکستان کے موقف کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ اور یہ اسی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ کہ سلہٹ کا علاقہ پاکستان میں شامل کر لیا گیا قیام پاکستان کے وقت وہ ڈھاکہ میں ہی تھے قائداعظم کی ہدایت کے مطابق پاکستان پرچم لہرانے کی رسم انہوں نے ادا کی اور حکام سلطنت میں پہلے پہل چیف جسٹس سے حلف بھی انہوں نے لیا۔

Marfat.com

مفتی محمد شفیع:۔ مفتی محمد شفیع تحریکِ پاکستان کے علماء میں ایک ہمہ گیر امتیاز رکھتے ہیں فراغت تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے۔ لیکن عالم اسلام اور مسلمانوں کی عام قومی وسیاسی مدحالی کے تقاضے میں عمل سیاست میں بھی دلچسپی لیتے رہے بلقان کی جنگوں کا زمانہ ان کی نوعمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا کہ جس میں وہ پرخلوص اور سرگرم اور رضا کارانہ حصہ لے کر مسلمان مجاہدین کے لیے چندہ جمع کرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد کافی مدت تک تصنیف وتالیف میں مشغول رہے لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کے زوال اور ان کی سیاسی غلامی کو دیکھا تو انہوں نے عملی سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا مفتی محمد شفیع نے جمعیت العلمائے ہند" اور دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی کے بعد راسخ الخیال علماء کی "جمعیت العلمائے اسلام میں شامل ہو گئے اور مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، اس جمعیت کے قیام سے تحریک پاکستان کی وسعت اور مقبولیت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ان حالات میں مفتی صاحب نے پاکستان کے مطالبے کو برحق ثابت کرنے کے لیے متعدد رسالے تحریر کیے اور ایک بہت سیر حاصل اور موثر فتویٰ مرتب کیا اس موضوع پر ان کی ایک مستقبل تصنیف" کانگرس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ"۔ میں مطالبہ پاکستان کے سیاسی مقاصد کے علاوہ خاص طور پر اس کی شرعی حیثیت کو نہایت تفصیل سے بیان کیا۔

تصنیف وتالیف کے علاوہ مفتی محمد شفیع نے ہندوستان کے طول وعرض کے دورے کیے اور ہر جگہ تقریروں کے ذریعے فضا کو ہموار کیا خاص طور پر قیام پاکستان کے لیے رائے شماری کے موقع پر صوبہ سرحد میں جہاں کانگرسی علماء کا بڑا اثر تھا، پاکستان کی حمایت کے لیے تبلیغی دورے کیے اور کانگرسی اثرات کو زائل کیا ان کا یہ تاریخی وانقلابی قدم تحریک پاکستان کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا۔

مندرجہ ذیل بالا مسلم لیگ کے حامی علماء کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک طرف تو کانگرس نواز مسلمان علماء کا مقابلہ کیا اور دوسری طرف عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا اور انہیں ان کے جداگانہ قومی تشخص کی پہچان کرائی۔ اس طرح ان علماء نے ہر مشکل وقت میں الگ قوم اور الگ وطن کا تصور مضبوط صورت اختیار کر گیا کیونکہ اس وقت کانگرس کا پروپیگنڈہ متحدہ ہندوستان بہت زوروں پر تھا۔ چنانچہ ان علماء کی کاوشوں سے عام مسلمان کانگرس کے پروپیگنڈہ سے متاثر نہ ہوئے اور انہوں نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو کر قائداعظم

Marfat.com

کی قیادت میں پاکستان حاصل کرنے کی کوششیں تیز ترکردیں اور آخر کار اپنے لیے ایک الگ اسلامی ریاست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی

سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک عظیم سکالر، مفکر، مفسر اور اسلام کے داعی اور مبلغ تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں اسلامی علوم کا بحرِ ذخار قرار دیا تھا مولانا مناظر احسن گیلانی انہیں متکلم اسلام کہا کرتے تھے الجزائر کے مجاہد عالم اور مفتی محمد بشیر الابراہیمی انہیں "عالم اسلام کی منفرد باکمال شخصیت" کہتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے انہیں "اسلام کی تلوار کہا تھا قائد اعظمؒ نے ان کی خدمات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ان کا اعتراف کیا، علامہ اقبالؒ ترجمان القرآن کو باقاعدہ دیکھتے اور مولانا مودودی کی خدمات کے معترف تھے اور کہا کرتے تھے کہ کانگرس اور نیشنلسٹ کانگرس مسلمانوں کے توڑ کے لیے مولانا مودودی ہی کافی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن سے دارالسلام پٹھانکوٹ میں منتقل ہونے کا مشورہ بھی دیا تھا تاکہ آئندہ وجود میں آنے والی اسلامی ریاست "پاکستان" جو ان کے تصور میں موجود تھی۔ اس کے لیے اسلامی قانون کی دفعہ وار تدوین پہلے سے کی جا سکے اسی طرح پاکستان کی تحریک کے وقت مولانا مودودی ہندوستانی مسلمانوں کی جانی پہچانی شخصیت تھے اور ان کی اسلامی خدماتِ دینی فکر اور صالح کردار کا ہر کسی کو اعتراف تھا۔

مولانا مودودی کی زندگی کا نیم سیاسی دور دراصل اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب انہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ ۱۹۱۸ء میں اخبار مدینہ (بجنور) کی ادارت کے سلسلہ میں مل کر کام شروع کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریک بڑی شدومد سے جاری تھی اور اس کی شدت میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا مولانا مودودی کے بچپن اور ان کی ابتدائی علمی تربیت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کچھ فطری آزاد خیال کچھ ذاتی مطالعہ کچھ خاندانی روایات اور کچھ ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ انہیں ابتداء سے ہی فرنگیت اور فرنگی تسلط سے نفرت تھی، اور طبیعت ہر اس تحریک کو قبول کرنے پر آمادہ تھی جو ہندوستان کو اس تسلط سے آزاد کرانے کے لیے کی جائے۔ اسی بناء پر انہوں نے ۱۹۱۱ء میں خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریکوں میں حصہ لیا۔

Marfat.com

تحریک پاکستان کی ساری جدوجہد مندرجہ ذیل تین بنیادی نظریات پر مبنی تھی۔

۱۔ ہندو اور مسلمان ہر اعتبار سے دو قومیں ہیں۔

۲۔ چونکہ ان دونوں قوموں میں مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے نمایاں فرق ہے۔ اور ان کے نصب العین بھی جدا جدا ہیں۔ اس لیے ایک بڑی تعداد والی قوم کے ساتھ مسلمانوں کا مستقبل متحدہ ہندوستان میں محفوظ نہیں رہ سکتا اس لیے مسلمان اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو کل اختیارات حاصل ہونے چاہییں یا ہندوستان کی تقسیم ہونی چاہیئے۔

۳۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں میں آنے والے علاقوں میں اسلامی نظام قائم کیا جائے۔

تحریک پاکستان کی ساری جدوجہد مندرجہ بالا تینوں بنیادی نظریات پر استوار تھی اور دراصل کسی شخصیت، جماعت، یا تحریک کو جانچنے کا یہی پیمانہ ہو سکتا ہے کہ آیا وہ ان تینوں بنیادی معاملے پر ایمان رکھتی اور حمایت کرتی ہے یا نہیں اس قسم کے نظریات کی حامل شخصیتوں میں سرسید سے لے کر تحریک پاکستان میں شامل ایک معمولی مسلمان تک تاریخ کا حصہ ہیں جنہوں نے اپنی بساط کے مطابق پاکستان (آزاد) کے لیے تحریک بالعمل یا بالقلم میں حصہ لیا۔

جس زمانے میں مولانا مودودی مسلمانوں کی فکری اور ذہنی تبدیلی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندو مت کی وطن پرستی کی تحریک اپنے فیصلہ کن مرحلے میں تھی ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء میں جب انتخابات ہوئے تو یہ بات یقینی نظر آنے لگی کہ یہ تحریک بالآخر پورے ملک پر مسلط ہو جائے گی، ہندی وطن پرستی کی تحریک نے بظاہر رابطہ مسلم عوام اور شدھی کی جو تحریک چلائی تھی وہ اس برعظیم میں اسلام کے مستقبل کے لیے سخت خطرات کی حامل تھی۔ ہندوستانی قوم کی تشکیل دراصل کانگرس کا نصب العین تھا۔ جس کی دو صورتوں نے اپنا اظہار علانیہ اور واضح طور پر شدھی اور سنگھٹن کی مخالفت پر اس زمانے کے دیگر مسلمان زعماء نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں مولانا ظفر علی خان اور شدھی اور سنگھٹن کی تحریک کی ابتداء سے قبل ہی کانگرس اور ہندوؤں کے عزائم کو سمجھ لیا تھا۔ ان میں ایک مولانا مودودی بھی تھے۔

مولانا مودودی نے متحدہ قومیت کے تصور کی مخالفت میں نمایاں حصہ لیا وطن پرستی کی بنیاد پر حاصل ہونے والی آزادی کی مذمت کرتے ہوئے مولانا مودودی نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ

"کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار بننا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں جس کی

Marfat.com

بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد قائم ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی آپ کا کام ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔"

مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں ہندوؤں کی دلائی جمہوری حکومت کا جسے کانگرس ہندوستان میں قائم کرنا چاہتی تھی اور جسے مسلمانوں کے بہت سے نادان رہنما آزادی وطن کا نام دے کر مسلمانوں کے لیے بھی آزادی کی تحریک سمجھ رہے تھے پورا تجزیہ کر کے بتایا کہ اس کا ہر جزو بجائے خود کیا معنی رکھتا ہے۔ ہندوؤں کی قوم پرستی کی تحریکوں کی وجہ سے یہ خطرات پیدا ہو رہے تھے کہ کہیں ہندوستان میں اسلامی قومیت رفتہ رفتہ ختم ہی نہ ہو جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کو برقرار رکھنے اور اس کی نشو و نما کے لیے ضروری تھی کہ آزادی حاصل کی جائے۔ اس وقت آزادی وطن کے دو ہی راستے تھے ایک راستہ وطن پرستی کا تھا بقول سید مودودی کے جس کو ہم صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اختیار کر سکتے تھے۔ اس کے حامی وہ لوگ تھے جس کے پیش نظر وطنی قومیت کا مغربی تصور تھا۔ ظاہر ہے اس راستے پر چل کر وہ آزادی حاصل نہیں ہو سکتی تھی جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں درکار تھی۔ اس راستے کو اختیار کرنے کا مطلب انگریزی حکومت کے ماتحت جس انقلاب کا عمل ڈیڑھ سو برس سے ہماری قوم میں ہو رہا تھا وہ ہندوستانی حکومت ماتحت زیادہ شدت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچتا۔ اور ہم اس کی تکمیل میں مددگار بنتے بقول مولانا مودودی اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے۔ کہ تحریک آزادی ہند کے دوران ہمارا اجتماعی وجود فنا بھی ہو جاتے اور ہم جدا جدا قطروں کی شکل اختیار کر کے جدید نیشنلزم کی خاک میں جذب بھی ہو جائیں پھر ہم بحیثیت قوم کے "نشاۃ ثانیہ" کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

آزادی وطن کا دوسرا راستہ: آزادی وطن کا دوسرا راستہ بقول سید مودودی یہ تھا کہ جس میں کسی ہندوستانی باشندے کی حیثیت میں کوئی فرق نہ ہو جس میں ہر گروہ کو دونوں حیثیتوں سے آزادی حاصل ہو جس کی نوعیت یہ ہو کہ مشترکہ وطنی مسائل کی حد تک تو انتیاز مذہب و ملت کا شائبہ تک نہ آنے پائے۔ مگر جداگانہ قومی مسائل میں کوئی قوم دوسری قوم سے تعرض نہ کرے اور ہر قوم کو آزاد ہندوستان کی حکومت میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اپنے مسائل کو خود حل کرنے کے قابل ہو۔

یہ تھا وہ نظریہ جس کے تحت مولانا مودودی ہندوستان کی قومیتوں کی آزادی چاہتے تھے

Marfat.com

نہ کہ بحیثیت ایک قوم ہونے کے۔

اس وقت مسلمانوں میں اس سوال پر کہ آزادی کس طرح حاصل ہوسکتی ہے ؛ دو گروہ نمایاں تھے۔ جو مختلف تجاویز پیش کر رہے تھے۔ایک گروہ کہتا تھا کہ آزادی وطن کے لیے جو جماعت جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے جائیں اور جب وہ انہیں منظور کرلے تو اس کے ساتھ شریک ہوجائیں دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ بلاکسی شرط کے آزادی کی تحریک میں حصّہ لینا چاہیئے۔

مولانا مودودی کی نظر میں دونوں گروہ غلطی پر تھے ان کے خیال میں پہلے گروہ کی غلطی یہ تھی کہ وہ کمزوروں کی طرح بھیک مانگنا چاہتا ہے۔اور دوسرا گروہ آزادی کے جوش میں اپنی قوم کی بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں گروہ اس وقت مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہیں اور اس غلط رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اور مستقبل کے امکانات پر کافی غور وخوض نہیں کیا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر بقول سیّد مودودی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں۔ اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کا حصول کبھی ممکن ہو اس غرض کے لیے مسلمانوں کو اپنی قوتیں مندرجہ ذیل امور پر خرچ کرنی چاہییں۔

(۱) مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر اصولِ اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جائے۔تاکہ مسلمان ان سے واقفیت حاصل کرسکیں۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً احکام اسلامی کا متبع بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۳) مسلمانوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو چھوڑ دیں۔

(۴) مسلمانوں کو اپنی اجتماعی قوت اتنی مضبوط کرنی چاہیئے کہ اپنی جماعت میں سے غداروں اور منافقوں کا استحصال کرسکیں۔

(۵) مسلمانوں میں اس قدر اتحاد خیال وعمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ تن واحد کی طرح ایک ہو جائیں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

(۶) مسلمانوں کو اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کی قیادت کا منصب نہ انگریز کی غلامی

Marfat.com

حاصل ہو سکے اور نہ ہندو کے غلاموں کو۔ بلکہ یہ منصب ایک ایسی جماعت کے قبضے میں آجائے جو ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے اسلامی مفاد کو قربان کیے بغیر ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر دل سے آمادہ ہو۔

ان مقاصد کے لیے مسلمانوں کی تہذیب و قومیت کی بقاء اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔ ایک نظام تعلیم اور دوسرا نظام تہذیب جو اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں۔ اور ایک ایسا اسلامی ماحول بن جائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں اس غرض کے لیے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیئت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

مولانا مودودی کے مطابق ہم آزادئ ہند کے مخالف نہیں بلکہ ہر آزادی کے حامی سے بڑھ کر اس کے خواہش مند ہیں اور اس کے لیے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے۔ جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کے ساتھ مسلم کی نجات بھی ہو۔

اس وقت جو مسلمان زعماء تحریک آزادی میں شامل تھے۔ اور ان میں سے ایسے جو قومیت پرست تھے۔ اور مسلمانوں کی بطور ہندوستانی نجات چاہتے تھے۔ مولانا مودودی ان سے مذکورہ بالا امور کی وجہ سے شدید اختلافات رکھتے تھے وہ ان کے نصب العین اور ان کے طریق کار دونوں کے مخالف رہے ساتھ ہی وہ اس وقت کی مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم مسلم لیگ سے بھی مذکورہ بالا امور کی بنا پر متفق نہ تھے۔ اسی وجہ سے مولانا مودودی نے مسلم لیگ اور اس کے قائدین کی طرف سے جدوجہد پاکستان میں عملاً شرکت نہ کی کیونکہ ان دونوں کے طریق کار مختلف تھے۔

مولانا مودودی اور مسلم لیگ:۔ مولانا مودودی مسلم لیگ کے رویے سے اس وجہ سے بھی مطمئن نہ تھے۔ کہ ان کے خیال میں مسلم لیگ میں مختلف خیالات رکھنے والے افراد کا ایسا گروہ جمع ہو رہا ہے۔ جو قیام پاکستان کے بعد اسلام کی حکمرانی کی راہ میں معاون بننے کی بجائے رکاوٹ ہی بن سکتا ہے۔ طریق کار کے اختلاف کو مولانا

Marfat.com

نے صاف طور سے ظاہر کر دیا تھا چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ایک خط کے جواب میں مولانا نے کہا تھا کہ

"آپ حضرات ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا۔ دراصل ادھوری تدابیر میرے ذہن کو اپیل نہیں کرتیں اگر کلی تعمیر میرے پیشِ نظر ہوتی تو میں یہ دل و جان سے اس کے لیے ہر خدمت سرانجام دینے کے لیے تیار تھا۔"

یہ وہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا مودودی نے تحریک میں عملی طور پر شرکت نہ کی لیکن علمی طور پر وہ نظریۂ پاکستان کی برابر خدمت کرتے رہے۔ اسلام کے نظامِ حیات کے خدوخال واضح کرتے رہے اور تصور پاکستان کی تائید بھی کرتے رہے جب تقسیم ہند کا نظریہ پیش کیا گیا اور مسلمانوں کے گروہ نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو کیسے گوارا کیا جا سکتا ہے تو مولانا مودودی نے کہا۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے انسانیت نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اب کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑے گا۔"

مولانا مودودی نے قیام پاکستان کے بارے میں ترجمان القرآن جولائی، اکتوبر ۱۹۴۴ء میں کہا۔

"مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے۔ وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ مسلمانوں کا صرف یہ کہنا کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے ان کو قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اس سے ان کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کی بجائے "ہندوستان" اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں بالفاظ دیگر مسلمان یہ نہیں کہتے کہ ہمارے لیے ایک قومی وطن بنایا جائے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل

Marfat.com

چاہیے۔

جب صوبہ سرحد اور سلہٹ میں ریفرنڈم ہو رہے تھے تو اس موقع پر مولانا مودودی نے وہاں کے عوام کو پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کا مشورہ دیا تھا اور انہیں اس امر پر آمادہ کرنے کے لیے کہا تھا (سہ روزہ کوثر ۵ جولائی ۱۹۴۷ء)

"اگر میں صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے۔ تو لامحالہ ہر اس علاقہ کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے۔

۹، ۱۰ رمئی ۱۹۴۵ء کے کل ہند اجتماع میں ۳ رجون ۱۹۴۵ء کی تجویز تقسیم ہند سے تقریباً ایک ماہ قبل مولانا مودودی نے ایک خطاب کے اختتام پر فرمایا تھا کہ۔

"اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا۔ پہلے حصے میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان مانتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے بجائے ہمیں کام کرتے دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلے میں خدا پرستانہ خلافت جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی۔ کہاں تک خود باشندگان پاکستان کے لیے اور کہاں تک دنیا کے لیے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے۔"

مسلم لیگ نے مولانا مودودی کی تحریروں سے کافی فائدہ اٹھایا اور ان کی کئی تحریروں کو اپنے طور پر شائع کرا کے کانگریس اور انگریزی اقتدار کے خلاف استعمال کیا خصوصاً اسلامی تصور قومیت پر ان کے مضامین مسلم لیگ کے حلقوں میں بہت بڑے پیمانے پر استعمال ہوتے رہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب یو پی مسلم لیگ نے اسلامی نظام مملکت کا خاکہ تیار کرنے کے لیے علماء کی ایک مجلس بنائی تو مولانا نے اس کی رکنیت قبول کی اور کام میں بڑی دلچسپی لی۔

Marfat.com

قائداعظم کے سید مودودی کے بارے میں خیالات

قمرالدین خان صاحب

ریڈر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ مولانا مودودی کی ایماء پر ۱۹۴۱ء میں قائداعظم سے ملے اور راجہ صاحب آف محمود آباد کی مدد سے گل رعنا (دہلی) میں ہماری ملاقات کا انتظام کیا گیا قائداعظم پینتالیس منٹ تک بڑے صبر سے میری باتیں سنتے رہے اور پھر کہا کہ مولانا (مودودی) کی خدمات کو وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا حصول ان کی زندگی اور کردار کی تطہیر سے زیادہ فوری اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ جماعت اور لیگ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جماعت اگر ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہی ہے تو لیگ اس فوری حل طلب مسئلہ کی طرف متوجہ ہے جسے اگر حل نہ کیا جا سکا تو جماعت کا کام مکمل نہ ہو سکے گا۔

مولانا مودودی کے بارے میں مندرجہ بالا باتوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ مندرجہ ذیل باتیں مولانا کے پیش نظر تھیں۔

(۱) ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔

(۲) مسلمانوں کا مستقبل متحدہ ہندوستان میں محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ اس لیے برصغیر کی تقسیم ہونی چاہیئے۔

(۳) تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کے حصے میں آنے والے علاقوں میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔

آزادیٔ ہند اور حصول پاکستان کے لیے اگر ان تینوں باتوں کو مدنظر رکھ کر مولانا مودودی کی تحریروں اور بیانات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ان تینوں سے ہی متفق تھے۔ اور اس امر کے شدت سے حامی تھے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ اسلام کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

یہ تھا مولانا مودودی کی شخصیت و کردار کا وہ رخ جس نے تصور پاکستان اور حصول پاکستان کے لیے اپنی تمام مساعی کی بدولت تحریک پاکستان میں اپنی فکری و عملی شمولیت سے نہ صرف اسلام کے احیاء کی کوشش کی بلکہ جو مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے میں دیگر زعماء کے مقابلے میں اپنا انفرادی و امتیازی مقام رکھتا ہے۔

Marfat.com

انجمن حمایت اسلام

تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کے احیاء کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دیں ان سے متاثر ہو کر ہندوستان میں بعض نئی تنظیموں نے جنم لیا ان میں سے ایک تنظیم انجمن حمایتِ اسلام بھی تھی۔ یہ انجمن ۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی اس کا مرکز لاہور رہا۔

انجمن کی بنیاد:۔ انجمن حمایت اسلام کی بنیاد حمید الدین نے رکھی وہ اس کے پہلے صدر بھی تھے ان کے ساتھ مولوی غلام اللہ منشی عبدالرحیم وغیرہ بھی شامل تھے۔ انجمن کا دفتر حویلی سکندر خاں میں اڑھائی روپے ماہوار کرایہ پر ایک کمرے کر کیا گیا۔ آغاز میں انجمن کم وسائل کی مالک تھی، اور اس کا دائرہ کار بھی محدود تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانان پنجاب نے اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے اچھی بنیادوں پر چلانے کا فیصلہ کیا۔

انجمن کے کارکن:۔ خلیفہ حمید الدین کے ساتھیوں میں منشی چراغ، ڈاکٹر دین محمد ناظر اور منشی عبدالرحیم نمایاں تھے۔ انجمن کے کارکن شروع میں گھر گھر جا کر مسلمانوں کو اس انجمن کی افادیت اور اس کے پروگرام سے روشناس کراتے اس کے علاوہ شروع شروع میں اس انجمن میں چندہ کے طور پر ہر مسلمان گھرانے سے ایک مٹھی آٹا روزانہ کے حساب سے دیا جاتا تھا اور اسے بیچ کر اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ جب انجمن کے مقاصد پھیلتے چلے گئے۔ اور اس کے لیے نئے نئے فنڈز کی ضرورت محسوس ہوئی تو اخراجات کو پورا کرنے کے لیے "مٹھی آٹا سکیم" شروع کی گئی۔ اس طرح ابتدائی ایام میں سالانہ آمدنی ۴۵۷ روپے اور خرچ صرف ۴۴۳ روپے تھا۔ چنانچہ اس سکیم کے تحت حاصل ہونے والی آمدنی کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیمی اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی گئیں۔

انجمن کے مقاصد:۔ انجمن حمایت اسلام مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لیے بنائی گئی تھی۔

(۱) مسلمان طلباء کے ایسے تعلیمی ادارے کھولنا جہاں انہیں جدید تقاضوں کو پورا کرنے والی تعلیم مہیا ہو سکے نیز ان کے ذہنوں میں اسلامی شعور پیدا کیا جا سکے۔

(۲) مسلم معاشرے کو مستحکم بنایا جائے اور اس کی مخصوص خصوصیات کی حفاظت کی جائے یعنی ایسے انتظامات کیے جائیں کہ اسلامی قدروں کو فروغ حاصل ہو۔

Marfat.com

(۳) ملتِ اسلامیہ کو اپنی دینی و ثقافتی قدروں کو نشو و نما دینے کا موقع مل سکے۔

(۴) غیر مسلم تبلیغی مشن جو اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ان کی مناسب طور پر نگرانی کی جا سکے تاکہ اسلام پر ناروا حملوں کا انسداد ہو سکے، عیسائی مشن، آریہ سماج مشن اور دیگر مذاہب کے جارحانہ حملوں کی روک تھام کے لیے مناسب بندوبست کیا جا سکے۔

(۵) اسلام کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کیا جائے اور انہیں کانگرس کے عزائم سے باخبر رکھ کر مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دیا جا سکے۔

عملاً انجمن حمایت اسلام نے تقریباً انہی خطوط پر کام کیا جن پر سرسید نے علی گڑھ میں کیا۔ انجمن نے ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جن میں مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مادی ترقی کی راہیں ہموار کیں اور انہیں ہندوؤں اور عیسائیت زدہ تعلیم گاہوں سے نجات دلائی اس انجمن نے اپنی خدمات کا آغاز پرائمری سکولوں کے قیام سے کیا۔

انجمن حمایت اسلام بھی تحریک علی گڑھ کی طرح مسلمانوں کی تعلیم کی اہمیت کی قائل تھی، اور مسلمانوں کے مسائل کا حل تعلیم کے توسط سے نکالنا چاہتی تھی اگرچہ شروع میں انجمن کے وسائل کم تھے لیکن جوں جوں یہ عزائم میں مقبول ہوتی گئی اور اس پر مسلمانوں کا اعتماد قائم ہوتا گیا۔ اس کے وسائل بھی بڑھتے گئے اور کارکردگی بھی زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔

انجمن نے شروع میں دو پرائمری سکول کا اجراء کیا اس طرح تعلیمی اداروں کی تعداد سال بہ سال بڑھتی گئی۔ اور ان اداروں کی کارکردگی بھی بڑھتی گئی۔ تعلیم سے پہلے ہی انجمن نے کئی اسکول مختلف شہروں میں جاری کر رکھے تھے۔ اور قیام پاکستان کے بعد بھی کئی جگہ مزید سکول قائم کیے۔

کالجوں کا اجراء: انجمن حمایت اسلام نے سکولوں کے اجراء کے ساتھ ساتھ کالج کا قیام بھی عمل میں لایا چنانچہ ۱۸۹۲ء میں انجمن نے لاہور میں ایک کالج کی بنیاد رکھی بعد ازاں انجمن کے ماتحت دو اسلامیہ کالج لاہور میں کام کرنے لگے۔ ان دونوں کالجوں کا معیار اور عوامی خدمت قابل ستائش رہی ہے۔

دیگر ادارے: انجمن نے عام روایتی تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ یتیم خانے دارالامان کالج برائے طالبات ایک طبیہ کالج تعلیم بالغاں کے مراکز اور لائبریریاں بنائیں۔

Marfat.com

مسلمان یتیم بچوں کو عیسائی پادریوں کے چنگل سے بچانے کے لیے انجمن نے دو یتیم خانے اور ایک دارالاطفال اور بے سہارا مسلم خواتین کے لیے دارالامان قائم کیا۔

انجمن کے سالانہ جلسے:۔ انجمن حمایت اسلام ہر سال اپنے جلسے بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کرتی تھی ان جلسوں کی صدارت عظیم شخصیتیں کرتی تھیں جن میں سرسید احمد خان محسن الملک مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال خاص طور پر قابل ذکر ہیں ملک کی بڑی بڑی شخصیتوں کو انجمن کی قیادت یا سربراہی دی جاتی تھی، پوری قوم کو انجمن پر بہت اعتماد تھا اور اس کے سالانہ جلسوں میں ہونے والی کارروائی کو قومی سطح پر بڑی اہمیت حاصل تھی۔

انجمن کی قومی و سیاسی خدمات:۔ انجمن حمایت اسلام نے برصغیر کی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا، اس کا سالانہ جلسہ دوسرے معنوں میں مسلم لیگ کا جلسہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلم لیگ کے رہنما اس جلسے میں شریک ہوتے ہیں اور مسلمانان برصغیر کی رہنمائی کے لیے قراردادیں منظور کی جائیں اس انجمن نے ملت اسلامیہ کو منظم کیا اور اپنی کوششوں سے مسلم لیگ کے مقاصد حاصل کرنے میں مدد دی علی گڑھ کے برعکس اسلامیہ کالج کی سرزمین حریت کی تحریکوں کے لیے بہت سازگار ہوتی تھی۔

انجمن کے کنٹرول میں چلنے والے تعلیمی اداروں نے مسلم لیگ کے لیے بہترین کارکن پیدا کیے جو مسلم لیگ کے بازو تھے، ان طلبہ نے تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور لیگ کے منشور کو پھیلایا۔ حریت پسند طلبہ کی بہت بڑی تعداد اسلامیہ کالج سے حاصل ہوئی اور جس نے پاکستان کی تخلیق میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ قائد اعظم کے سپاہی تھے، اور ان کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے، اسلامیہ کالج میں ہی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام جس کے روح رواں حمید نظامی تھے۔ دو قومی نظریے کو پھیلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا مارچ ۱۹۴۰ء میں جب خاکسار مسلم لیگ کا جلسہ ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اسلامیہ کالج ہی کے طلبہ نے قائد اعظم کو بحفاظت ایک جلوس کی شکل میں منٹو پارک پہنچایا تھا یہ وہی اسلامیہ کالج ہے جس کی گراؤنڈ میں قائد اعظم نے اپنے ہاتھوں سے پاکستان کے مجوزہ پرچم کو لہرا کر اپنے عزم صمیم کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں پنجاب کے انتخابات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں عوام نے جو فیصلہ دیا اس میں طلبا ء اسلامیہ کالج کا حصہ بھی کسی سے ڈھکا

Marfat.com

چھپا نہیں۔ ۱۹۴۶ء میں قائداعظمؒ نے اسلامیہ کالج کے طلبہ کو ہدایت فرمائی تھی کہ۔

"تعلیم محض کتابی علم حاصل کرنا نہیں ہے آپ لوگ اپنے گردوپیش کے حالات کا بغور مطالعہ کیجئے۔ اور ایک ہوش مند قوم کی طرح مستقبل کی فکر کیجئے۔

اس کے علاوہ اسلامیہ کالج کے طلبۂ نے تحریک پاکستان میں گاؤں گاؤں اور گھر گھر جاکر مسلم لیگ تک پہنچایا، اور انہیں نظریۂ پاکستان سے آگاہ کیا۔

قائداعظم نے تحریک پاکستان کے دوران میں اسلامیہ کالج کے طلباء کو بڑی اہمیت دی وہ جب بھی لاہور آئے انہوں نے کالج کے طلباء سے ملاقاتیں کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

اس طرح یہ نتیجہ نکلا کہ انجمن حمایت اسلام نے تحریک پاکستان میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے تعلیمی ادارے قائم کیے جن کے طلباء نے تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کے علاوہ اسی تنظیم کی بدولت دو قومی نظریہ کی عام لوگوں میں تشہیر کی گئی۔ مسلمانوں کو نظریہ پاکستان سے روشناس کرایا گیا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی انتخابی مہم چلانے والے بھی انجمن حمایت اسلام کے قائم کردہ کالج اسلامیہ کالج کے طلباء ہی تھے۔ اس طرح اس انجمن نے قومی اور سیاسی محاذ پہ مسلمانانِ برصغیر کی بڑی خدمت کی

Marfat.com

تحریکِ پاکستان میں خواتین کا حصّہ

خواتین معاشرے کا ایک حساس اور موثر طبقہ ہوتی ہیں معاشرے کے انقلاب اور اضطراب سے اس طبقے کا متاثر ہونا یقینی ہوتا ہے۔ برعظیم کے معاشرے میں قومی اور سیاسی سطح پر جو صورتحال بیسویں صدی کے اوائل میں تھی وہ کئی حیثیتوں میں مسلمانوں سے ایثار و قربانی اور سعی و عمل کا تقاضا کرتی تھی۔ عام مسلمانوں میں قومی و سیاسی بیداری بھی مختلف وقتوں میں ایسی ہی صورت حال کا نتیجہ تھی خواتین اپنے آپ کو اس تقاضے سے اور اس صورت حال سے بہت دور نہ رکھ سکتی تھیں خواتین اپنے آپ کو اس تقاضے سے اور اس صورت حال سے بہت دور نہ رکھ سکتی تھیں یہ وہ وقت بھی تھا کہ جب مختلف معاشرتی انقلابات اور تہذیبی نشیب و فراز کے نتیجے میں خواتین میں تعلیمی اور سیاسی شعور عام ہو رہا تھا اور ان کی معاشرتی اصلاح کے لیے مختلف انفرادی و اجتماعی کوشش روبہ عمل تھیں ان میں تعلیم عام ہو رہی تھی اور انہوں نے اب قومی اور معاشرتی امور میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا ان عورتوں میں سیاست میں حصّہ لینے کی روایت تحریکِ خلافت کے روح رواں جوہر برادران کی والدہ بی اماں نے ڈالی، انہوں نے بذات خود تحریک خلافت میں حصّہ لیا اور ان کے اس اقدام سے بعد کی تحریکوں میں خواتین کی ایک بڑی تعداد شامل ہونا شروع ہو گئی شروع شروع میں بیگم مولانا محمد علی جوہر اور دیگر خواتین نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور اس کی نشستوں اور اس کے جلسوں میں حصّہ لینا شروع کیا۔

خواتین کے عملی محاذ پر کام کرنے کی صلاحیتوں سے قائداعظم خوب واقف تھے اور ان کی طرف سے پُر امید بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم لیگ میں شمولیت اور اس کی تحریکوں کو آگے بڑھانے کی کوششوں پر وہ خواتین کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔

۱۹۳۵ء کے دستور کو نافذ ہونے کے بعد جب مسلم لیگ کی تنظیم نو کی گئی اور اسے ہر پہلو سے ایک منظم فعال اور مکمل عوامی جماعت بنانے کی کوشش کی گئی تو اس مقصد میں بھرپور کامیابی کے لیے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی خاص زور دیا گیا جس پر اب تک خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں نوجوانوں اور طلبہ کو منظم اور متحد کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی اپنے دوش بدوش سرگرم رکھنے کے لیے متعدد طریقۂ کار اختیار کیے گئے اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں طالبات کے لیے ایک متوازی اور ذیلی تنظیم قائم کی گئی جو بالخصوص نسوانی تعلیمی اداروں اور

Marfat.com

گھروں میں مسلمان طالبات کو ہم خیال بنانے اور مسلم لیگ کے مقاصد سمجھانے کے لیے مستعد ہوئی اس کے ساتھ ساتھ اس عرصے میں عام مسلمان خواتین کو بھی مسلم لیگ سے وابستہ کرنے اور اسے جدوجہد میں شریک کرنے کے لیے خواتین مسلم لیگ کمیٹی کو مستعد اور منظم کیا گیا۔

خواتین مسلم لیگ کمیٹی کا اجراء: مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرح خواتین مسلم لیگ کمیٹی کا اجراء بھی کیا گیا جس میں محترمہ فاطمہ بیگم بیسہ اخبار لاہور پورے پنجاب کے لیے آرگنائزر نامزد ہوئیں جنہیں "پروشنل لیگ" کی صدارت کا بھی اعزاز حاصل تھا۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے خواتین کی اس تنظیم کو آگے بڑھایا۔ فروری ۱۹۳۹ء میں لاہور میں خواتین مسلم لیگ کمیٹی کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ خواتین کی اس تنظیم کو دور دراز علاقوں میں پھیلا دیا جائے۔ اس طرح اپریل ۱۹۳۹ء تک امرتسر، فیروزپور، ہوشیارپور، جالندھر، لدھیانہ اور انبالہ میں خواتین مسلم لیگ کمیٹیاں "خاصی تعداد میں ابھر کر سامنے آئیں۔

خواتین مسلم لیگ کمیٹی کے معرض وجود میں آتے ہی خواتین جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگیں اور ان میں احساس کی "قوت جاگ اٹھی ایک عرصہ تک یہ کمیٹی صرف سماجی بہبود کے کام کرتی رہی تاہم کمیٹی کا ایک ماہانہ اجلاس ضرور ہوا کرتا تھا۔ جس میں حالات حاضرہ پر سیاسی جائزہ لیا جاتا تھا۔ اسی دوران شمیم جالندھری نے جالندھر سے ایک مجلہ "الزہرا" نکالا۔ جس نے خواتین میں سماجی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں بڑی مدد دی۔

خواتین کی ان سرگرمیوں کے سبب مسلم لیگ اور قائداعظم کو اپنے مقاصد اور اپنی جدوجہد میں بڑی سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہوتی رہیں خصوصاً انتخابات کے موقع پر ان پڑھ مسلمان خواتین کو صحیح طور پر مسلم لیگ کے حق میں ووٹ ڈالنے کی رہنمائی انہی خواتین کا خاصا تھا۔ اس طرح بیشتر انتخابات میں جو کہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لیے بہت اہم اور فیصلہ کن تھے، خواتین کی عملی جدوجہد نے کامیابی کو اور قریب کیا۔ طالبات کی طرح عام خواتین کو بھی مسلم لیگ کا حامی بنانے کے لیے ۱۹۳۶ء میں ایک بڑے منصوبے کے تحت کام شروع کیا گیا۔ ہر صوبے میں خواتین مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی گئیں، اور پھر اسی طرح ہر شہر میں ذیلی شاخیں قائم ہوئیں مسلم لیگ کے عام محاذ پر بھی اس سے وابستہ خواتین کی ایک کثیر تعداد شریک کار رہی قومی سطح پر خواتین کی نمائندگی کرنے کے لیے اور انتخابات کے موقع پر عام مسلمان خواتین کو ہم خیال بنائے اور پھر مسلم لیگ اور اس کی جدوجہد کے لیے چندہ کی فراہمی میں خواتین مسلم لیگ کی ارکان نے سرگرمی سے حصہ لیا۔

قائداعظم نے خواتین کی ان کوششوں کو ہمیشہ سراہا اور ان کی حوصلہ افزائی کی وہ عام طور پر انہیں ہدایتیں اور مشورے بھی دیتے رہتے تھے۔ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے موقف کی کامیابی میں خواتین کی سرگرم جدوجہد بھی شامل تھی۔

Marfat.com

Marfat.com

- مشرق و مغرب کے سیاسی افکار ------ سید اصغر علی جعفری
- افلاطون اور ارسطو کے سیاسی افکار ------ محمد مجاہد فاروق
- تقابلی سیاست ------ عمانوایل یونس
- مسلمانوں کے سیاسی افکار ------ جاوید اقبال
- سیاسیات عالم ------ صفدر حیات صفدر ایم اے
- حکومت و سیاست (پاکستان کی نظریاتی تاریخ) ------ محمد مجاہد فاروق
- قانون بین الاقوام ------ ایس ایم شاہد
- بین الاقوامی تنظیمیں ------ ایس ایم شاہد
- ترقی یافتہ ممالک کے دساتیر ------ فضل کریم شیخ
- ترقی پذیر ممالک کے دساتیر ------ محمد مجاہد فاروق
- تحریکِ پاکستان اور اس کا پس منظر ------ سید اصغر علی جعفری
- پاکستان کے ادارے ------ فضل کریم شیخ
- ہماری خارجہ پالیسی ------ فضل کریم شیخ
- سیاسی و معاشرتی نظریات ------ ایس ایم شاہد
- عوام، جماعتیں اور مؤثر گروہ ------ سید اصغر علی جعفری
- بین الاقوامی تعلقات ------ نعیم اکبر یٹین

نیو بُک پیلس، چوک اُردو بازار، لاہور

Marfat.com

- مشرق و مغرب کے سیاسی افکار ------ سید اصغر علی جعفری
- افلاطون اور ارسطو کے سیاسی افکار ------ محمد مجاہد فاروق
- تقابلی سیاست ------ عمانوایل یونس
- مسلمانوں کے سیاسی افکار ------ جاوید اقبال
- سیاسیات عالم ------ صفدر حیات صفدر، ایم اے
- حکومت و سیاست (پاکستان کی نظریاتی تاریخ) ------ محمد مجاہد فاروق
- قانون بین الاقوام ------ ایس ایم شاہد
- بین الاقوامی تنظیمیں ------ ایس ایم شاہد
- ترقی یافتہ ممالک کے دساتیر ------ فضل کریم شیخ
- ترقی پذیر ممالک کے دساتیر ------ محمد مجاہد فاروق
- تحریک پاکستان اور اس کا پس منظر ------ سید اصغر علی جعفری
- پاکستان کے ادارے ------ فضل کریم شیخ
- ہماری خارجہ پالیسی ------ فضل کریم شیخ
- سیاسی و معاشرتی نظریات ------ ایس ایم شاہد
- عوام، جماعتیں اور موثر گروہ ------ سید اصغر علی جعفری
- بین الاقوامی تعلقات ------ نعیم اکبر نیئن

نیو بُک پیلس، چوک اُردو بازار، لاہور

Marfat.com